محمود الفتاویٰ

دوم

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ

تقدیم وترتیب

مفتی عبدالقیوم راجکوٹی

ناشر

تفصیلات

نام کتاب:..محمود الفتاویٰ جلد دوم

ازقلم:..حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

مقدمہ وترتیب

ازقلم:..مفتی عبدالقیوم راجکوٹی

معین مفتی دارالافتاء جامعہ ھٰذا

کمپیوٹرسٹینگ:..مفتی محمد امین پنیلا

مدرس مدرسہ جامعہ محمودیہ دیتانی، باڑمیر

صفحات جلد دوم:..۴۷۷

سن طباعت:..سنہ ۱۴۳۰ھ م سنہ ۲۰۰۹ء

فہرست

كتاب الزكاة

زکوٰۃ میں حوائجِ اصلیہ کی تشریح

سوال: (۱) ایک مولوی صاحب جو شرعاً غریب ہیں، اُن کے پاس مکان بنانے کے لیے کہیں سے زکوٰۃ کی رقم آئی، تو اِس زکوٰۃ کی رقم پر بعد حولانِ حول زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

(۲): حاجتِ اصلیہ میں کون کون سی اشیاء داخل ہیں؟

(۳): حاجتِ اصلیہ کی حد کتنے زمانہ تک کی ہے؟

(۴): اگر زکوٰۃ کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہو تو پھر اب وہ شرعاً مالدار ہے؛ لہٰذا اب اُس کے لیے مکان وغیرہ حاجتِ اصلیہ کے لیے اخذِ زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

(۵): اگر کسی (اہلیہ وغیرہ) کو مالک بنا کر اخذِ زکوٰۃ کرے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

(۶): مکان کے لیے جمع کی گئی رقم کا شمار حاجتِ اصلیہ میں ہے یا نہیں؟ جب کہ حاجتِ اصلیہ میں سے اُن کا مکان مستقل نہیں ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): واجب ہے۔ إن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة. (شامي ۲/۶)

(۲): حاجتِ اصلیہ سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے ذریعہ آدمی اپنی ذات سے ہلاکت دور کرتا ہو۔ وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك، تحقيقاً كثيابه، أو تقديراً كدَينه. (در مختار على هامش الشامي ۲/۶)

اِس میں رَہائشی مکان، استعمالی کپڑے اور گھریلو ضروری سامان، سواری کا جانور، خدمت کے غلام اور ضروری ہتھیار داخل ہیں۔

كلام الهداية مشعر بأن المراد نفس الحوائج، فإنه قال: وليس في

دور السکنیٰ وثیاب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة، لأنها مشغولة بحاجته الأصلية، وليست بنامية أيضا،اھ. (شامي ۲/ ٦)

(۳): جب تک آدمی زندہ ہے اِس کی حاجت باقی ہے۔ کما هو ظاهر.

(۴): اُس کے پاس آنے کے بعد اب وہ اُس کی مِلک ہوگئی، زکوٰۃ کی رقم نہیں رہی، اور اِس کا حکم عبارتِ منقولہ نمبر (۱) کے مطابق ہوگیا؛ اِس لیے اب وہ صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔

(۵): اُس رقم کو اپنی ملکیت سے نکال دینے کے بعد وہ صاحبِ نصاب نہیں رہا تو اپنی ضرورت کے لیے (کوئی دے تو) زکوٰۃ لے سکتا ہے، سوال پھر بھی نہ کرے۔

(٦): خود مکان حاجتِ اصلیہ میں داخل ہے۔ نقد رقم اِس مقصد کے لیے جمع کر رکھی ہے تو اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ بقدرِ نصاب ہو۔ كما تدل عليه عبارة الهداية المنقولة عن الشامي.

آپ ایسا کیجیے کہ جوں جوں رقم آتی رہے اُس کو جمع کرنے کے بجائے مکان کا سامان (لکڑی، اینٹ وغیرہ) خریدنے میں صَرف کرتے رہیے تو کوئی اشکال نہیں رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہوٹل کے خام مال (آٹا، تیل، مصالحہ) پر کیا زکوٰۃ آئے گی؟

سوال: ہوٹل کے کاروبار میں ہر وقت ہوٹل چلانے کے لیے دس ہزار روپیے کا خام مال، مثلاً: آٹا، تیل، شکر وغیرہ رکھنا پڑتا ہے، جو حولانِ حول کے وقت بھی ہوتا ہے، تو کیا اِس اسٹاک مال پر زکوٰۃ ہوگی؟ اگر واجب ہوگی تو اجتماعی منافع میں سے سب کی اجازت سے ادا کرنے پر ادا ہوجائے گی؟ یا ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

خام مال وہی ہے جو فروخت ہوتا ہے؛ اِس لیے مالِ تجارت ہونے کی وجہ سے اُس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؛ لیکن یہ حکم ہر اُس شریک کے لیے ہے جو صاحبِ نصابِ شرعی ہو۔ جن شرکاء پر واجب ہے اُن کی اجازت سے اُن کی زکوٰۃ دیگر شریک نے ادا کر دی تو وہ درست ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زمین میں سے خزانہ نکل آئے تو کیا اُس کا استعمال جائز ہے؟

سوال: اگر کسی زمین سے مدفون خزانہ نکلے تو اُس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ خزانہ کسی کی مملوک زمین سے درآمد ہوا ہے تو اُس کو دے دیا جاوے؛ ورنہ جس کو ملا ہے وہ اُس کو استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ اُس پر اہلِ اسلام کی علامت نہ ہو، اگر اہلِ اسلام کی علامت ہے تو وہ لقطہ کے حکم میں ہے جس کا اعلان کر کے مالک تک یا اُس کے وُرثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔ (درمختار، شامی ۲/ ۵۱، ۵۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سونے چاندی کی زکوٰۃ میں یومِ ادا کی قیمت معتبر ہے

سوال: سونا، چاندی اور زیورات کی زکوٰۃ نکالتے ہوئے کس قیمت کا حساب ہوگا، موجودہ قیمت کا یا جس قیمت سے خریدا ہے اُس کا؟ اور کیا زیورات کی صنعت و بناوٹ کی رقم کا حساب زکوٰۃ نکالنے میں شمار کریں گے؟

المستفتی: خاکپائے حضرتِ اقدس مفتی صاحب جنید بن محمد عفی عنہ

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اُس کی زکوٰۃ ادا کرنے کے دن جو قیمت ہو اُس کا اعتبار کیا جائے گا۔ فقط واللہ

تعالیٰ أعلم. املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

ڈپازٹ پر زکوٰۃ نہیں

سوال: شہر بمبئی میں کرایہ پر گھر لینے کی صورت میں کرایہ کے ساتھ ڈپازٹ لینے کا رواج عام ہے، اور اب تو بغیر ڈپازٹ کے گھر ملنا دشوار ہو گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ: ایک بیوہ عورت ہے جس کے پاس ذاتی ملکیت کا مکان بھی نہیں ہے، وہ خود ڈپازٹ مع کرایہ دے کر رہتی ہے، نیز گھر میں کوئی کمانے والا بھی نہیں ہے، خود محنت کر کے کرایہ ادا کرتی ہے اور گھر کا گزران چلاتی ہے، تو کیا اِس کی ڈپازٹ کی رقم پر زکوٰۃ آئے گی؟ کیوں کہ اگر وہ ڈپازٹ کی رقم سے زکوٰۃ ادا کرے گی تو ایک وقت آئے گا کہ ڈپازٹ کی رقم ختم ہو جائے گی اور وہ بالکل بے گھر ہو جائے گی، تو کیا اِس کی ڈپازٹ کی رقم ضرورتِ اصلیہ میں داخل ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ڈپازٹ کی رقم بحکمِ رہن ہے، اور رہن کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہے نہ مرتہن پر، وہ واپس کر دی جائے گی تب بھی رہن کی (گذشتہ ایام کی) زکوٰۃ مالک کے ذمہ واجب نہ ہوگی۔ (از: فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۱۲۰، ۱۲۱)

"اسلامک فقہ اکیڈمی کے اہم فقہی فیصلوں" میں ہے: "کرایہ دار کی طرف سے مالکِ دکان و مکان وغیرہ کو پیشگی دی گئی ضمانت کی رقم (Security Deposit) پر زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ واجب نہیں ہوگی۔ (ص: ۴۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا ٹی وی اور کمپیوٹر کا شمار حوائجِ اصلیہ میں ہے؟

سوال: (۱) صدقۂ فطر کن لوگوں پر واجب ہے؟ گھر میں رکھے ہوئے ٹی وی،

ریڈیو، کمپیوٹر کی مالیت کو بھی نصاب میں شمار کریں گے یا نہیں؟ یعنی ضرورتِ اصلیہ کی اشیاء کے علاوہ میں۔

جس کے پاس ٹی وی وغیرہ ہو اُس کو زکوٰۃ دینا

سوال: (۲) ایک شخص بیس ہزار روپیہ کا مقروض ہے، اور دینے کی صلاحیت بھی نہیں ہے؛ مگر گھر میں ٹی وی، ریڈیو اور ٹیپ وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، جن کی مالیت بیس ہزار روپیہ تک ہے، تو کیا اُس آدمی کو قرض کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ کا روپیہ دے سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) جو لوگ حوائجِ اصلیہ کے علاوہ مقدارِ نصاب کے مالک ہوں، چاہے اُس نصاب پر سال نہ گزرا ہو، اور چاہے وہ نامی یعنی بڑھنے والا نہ ہو، تب بھی اُس پر صدقۂ فطر واجب ہے، ٹی وی حوائجِ اصلیہ میں داخل نہیں، اور کمپیوٹر اگر اُس کے ذریعۂ معاش کا حصہ ہے تو وہ حوائجِ اصلیہ میں داخل شمار ہوگا؛ ورنہ نہیں۔

(۲) اُس کی حوائجِ اصلیہ سے زائد سامان فروخت کر کے قرض ادا کرنے کے بعد اُس کے پاس نصاب کی مقدار موجود نہ ہو، تو اُس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے رپورٹ بک میں مُزکّی کا نام آنا ضروری نہیں

سوال: چندہ والے کو زکوٰۃ کی رقم دی، اور اُس سے رسید بھی وصول کی؛ مگر رپورٹ بک میں مزکّی کا نام نہیں آیا، تو کیا زکوٰۃ ادا ہوئی یا دوبارہ ادا کرنا ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوٰۃ کی وہ رقم اگر اپنے مصرف میں خرچ کی گئی ہے تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، رپورٹ میں نام آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مستحقِ زکوٰۃ مزکی کو زکوٰۃ کی رقم لوٹائے تو مزکی قبول نہ کرے

سوال: ایک مستحقِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کی رقم دی گئی؛ مگر ایک مدت کے بعد مستحق نے ضرورت نہ ہونے کی بنا پر واپس کر دی، تو مزکی کے لیے لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس کو زکوٰۃ کی رقم دی گئی اور اُس نے قبول کر لی، اور وہ اگر مستحق زکوٰۃ ہے تو اُس کے ہاتھ جاتے ہی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور وہ مالک بن گیا، اب اگر وہ واپس کرتا ہے تو مزکی اُس کو قبول نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کس ریٹ پر دی جائے؟

سوال: سونے کا ریٹ (بھاؤ) ڈَلی کا اَور ہے اور بنے ہوئے زیور کا الگ ہے، کس نرخ (ریٹ) پر زکوٰۃ دی جائے؟ کیوں کہ بازار والوں کا دینے کا نرخ اَور ہے اور لینے کا الگ ہے، اگر فقراء کو سونا زکوٰۃ میں دیا جائے تو اُن کا نقصان ہوتا ہے؛ کیوں کہ بازار والے اُن سے کم قیمت سے خریدتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو نرخ (ریٹ) بازار میں ایسے سونے کا ہے یعنی جس قیمت کو دکان دار فروخت کرتے ہیں وہ قیمت لگا کر زکوٰۃ دے، اگر سونا ہی زکوٰۃ میں دینا ہو تو موجودہ سونے کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دے دے، یہ بھی درست ہے اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اگر چہ فقراء کسی قیمت پر فروخت کر دیں۔ (فتاویٰ دار العلوم ۶/۱۲۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قرضِ حسنہ پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

سوال: جو روپیہ کسی کو قرضِ حسنہ دیا اُس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وصول ہونے کے بعد اُس روپیہ کی زکوٰۃ دی جائے گی، اگر وصول ہونے سے قبل زکوٰۃ دے دے تو یہ بھی درست ہے۔ (فتاوی دارالعلوم ۶/ ۴۵ بحوالۂ شامی ۲/ ۱۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

دَینِ محیط (قرض) وجوبِ زکوٰۃ سے مانع ہے، موجودہ دور کے (شرعی) فقیر (عرفی) مالدار کا طرزِ عمل مقاصدِ شریعت کے خلاف ہے

سوال: (۱) ایک آدمی (زید) نے ایک کروڑ روپئے کی پراپرٹی کرایہ پر دینے کی نیت سے خریدی اور کرایہ پر دے دی، قیمت کے بیس لاکھ روپئے ادا کر دیے، جب کہ سابقہ اَسی (۸۰) لاکھ روپئے کئی سالوں میں قسط وار ادا کرنے ہیں، واضح ہو کہ اِس پراپرٹی کا کرایہ سالانہ دس لاکھ روپیہ آتا ہے جس میں سے دو لاکھ روپئے نقد ادا کردہ بیس لاکھ کے مقابلہ میں بیٹھتا ہے، جب کہ آٹھ لاکھ روپئے واجب الاداء قرض اَسی ۸۰/ لاکھ کے مقابلہ میں پڑتا ہے، اِس پراپرٹی پر حاصل شدہ کرایہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں مقامی علمائے کرام سے مسئلہ دریافت کرنے پر اُنھوں نے بتلایا کہ: ''کرایہ میں سے اوّلاً ایک سال کی واجب الاداء قسطیں وضع کر لی جائیں، بعدہٗ اگر بقدرِ نصاب مال بچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی؛ ورنہ نہیں''؛ مگر اِس پر اشکال یہ ہے کہ اِس صورت میں پورا کرایہ سالانہ قسطوں کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے، اور اُس شخص پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور ہمارے یہاں اربابِ اموال قسط وار ادائیگی کی شرط پر قرض لیتے چلے جاتے ہیں، اور کرایہ پر دینے کی نیت سے پراپرٹیاں خرید کر کرایہ پر دیتے چلے جاتے ہیں، اور حاصل شدہ کرایہ سے صرف قسطیں ہی ادا ہو پاتی ہیں؛ بلکہ بعض اوقات تو قسطوں کی ادائیگی میں کرایہ ناکافی ہونے پر جیب سے بھی پیسے نکالنے پڑتے ہیں، یوں اِن حضرات کی اَملاک بڑھتی جاتی ہیں

اور زکوٰۃ اُن پر واجب نہیں ہوتی، یہ میری سمجھ سے باہر ہے، میرے خیال میں نقد ادا کردہ قیمت کے مقابلہ میں آنے والے کرایہ میں سے ٹیکس کی رقم وضع کرنے کے بعد بقیہ پیسوں پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے، مثلاً: سوال میں ذکر کردہ صورت کے مطابق نقد ادا کردہ قیمت بیس لاکھ کے مقابلہ میں آنے والے دو لاکھ روپیوں پر ٹیکس وَضع کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے، امید ہے کہ اِس کا معقول حل پیش فرمائیں گے۔

سوال (۲): دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مالدار مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو ایک بڑی (معتد بہ) رقم بطورِ قرض دیتا ہے، اور قرض دار اُس رقم سے پراپرٹی (اَملاک) بہ نیتِ تجارت خریدے، اور قرض کی رقم اُسے قسط وار کئی سالوں میں ادا کرنی ہے، تو ایسی صورت میں مسئلہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قرض دار کو ایک سال کی قسطیں وضع کرنے کے بعد اُس پراپرٹی کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اور قرض خواہ کو بھی قرض دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ وصولی کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی ادا کرنی ہے، اِس صورت میں ایک ہی پیسے پر دوہری زکوٰۃ لازم آتی ہے؛ کیوں کہ قرض دار کے پاس جو پراپرٹی ہے وہ اِسی رقم کا عوض ہے؛ لہٰذا گزارش ہے کہ اِس کا تشفی بخش جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

سوال (۳): ایک شخص نے ایک کروڑ روپئے کا مالِ تجارت خریدا، جس میں سے ۵۰/ لاکھ نقد ادا کر دیے اور ۵۰/ لاکھ قسط وار ادا کرنے ہیں، تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ آیا اِس طرح ادا کرے کہ جو قیمت نقد ادا کر دی ہے اُس کے مقابلہ میں آنے والے مالِ تجارت پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے، اور جو قسط وار ادا کرنی باقی ہے اُس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، یا پھر کوئی اَور صورتِ حال ہے؟ برائے مہربانی واضح اور تشفی بخش رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے بطورِ تمہید چند امور ذکر کیے جاتے ہیں:

شریعتِ مُطَہَّرہ میں زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے چند شرائط کا ہونا ضروری ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ: وہ مال بقدرِ نصاب ہو، چناں چہ ''فتاویٰ عالمگیری'' میں شرائطِ وجوب کو جہاں شمار کرایا ہے اُس میں تحریر فرماتے ہیں: ومنها كون المال نصاباً، فلا تجب في أقل منه، هكذا في العيني شرح كنز. (۱/۱۷۲)

اِن ہی شرائطِ وجوب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: وہ مالِ نصاب نامی ہو۔

(۱) ''کنز الدقائق'' میں ہے: وشرط وجوبها: العقل، والبلوغ، والإسلام والحرية، وملك نصاب حولي فارغ عن الدين وحاجته الأصلية، نام ولو تقديراً. (كنز الدقائق:٥٦)

(۲) ''عالمگیری'' میں ہے: ومنها كون النصاب نامياً حقيقةً بالتوالد والتناسل والتجارة، أو تقديراً بأن يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده أو في يد نائبه، وينقسم كل واحد منهما إلى قسمين خلقي وفعلي. هكذا في التبيين. (۱/۱۷٤)

(۳) ''بدائع الصنائع'' میں ہے: ومنها كون المال نامياً؛ لأن معنى الزكوٰة وهو النماء لا يحصل إلاّ من المال النامي. (۲/۱۱)

اور مالِ نامی کی تشریح میں فقہاء نے اَثمان چاہے وہ خلقی ہوں – جیسے: سونا اور چاندی – یا عرفی، – جیسے: سکۂ رائج الوقت – اور مالِ تجارت اور سوائم کو شمار کیا ہے۔

''المحيط البرهاني'' میں ہے: فنقول: مال الزكوة الأثمان، وهي

الذهب والفضة وأشباههما والسوائم وعروض التجارة. (۱۵۶/۳)

اِس لیے اثمان اور سوائم کے علاوہ میں جب تک تجارت کی نیت نہ ہو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛ چناں چہ اگر کسی آدمی نے زمین یا مکان یا اور کوئی چیز تجارت کے علاوہ کسی اَور نیت سے خریدی، مثلاً: رہائش کے لیے یا کرایہ پر دینے کے لیے، تو اُس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

''ہدایہ'' میں ہے: وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة؛ لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً. (ہدایہ ۱۸۶/۱)

''امداد الفتاوی'' میں ہے:

سوال: چہ می فرمایند علمائے دین اندریں مسئلہ کہ: بر مکانات ودکانات کہ زائد از سکونت ہست وبراں کرایہ گرفتہ می شود، آیا زکوۃ واجب ست یا نہ؟

الجواب: زکوۃ بر اینہا واجب نیست؛ زیرا کہ نامی شدن نصاب از شرائطِ زکوۃ است، ومکانات نامی نیستند۔ ومنها كون النصاب نامياً. (عالمگیری: ۱۷۱/۱) ولا في ثياب البدن وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها. (در مختار) قوله: (ونحوها) كحوانيت وخانات يستغلها. (طحطاوي مصري: ۳۹۲/۱) (امداد الفتاوی ۱۷/۲)

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مالِ نصاب دیون اور قرضوں سے خالی ہو، اگر مالکِ نصاب پر اِتنا قرض ہے کہ پورا مال اُس کی ادائیگی میں ختم ہوسکتا ہے تو اُس پر زکوۃ نہیں، اور اگر قرض تو ہے؛ لیکن اُس کی ادائیگی کے بعد بھی بقدرِ نصاب مال بچ جاتا ہے، تو قرض کی مقدار منہا کرنے کے بعد بچے ہوئے مال پر زکوۃ واجب ہوگی۔

"المحیط البرهاني" میں ہے:الفصل العاشر في بیان ما یمنع وجوب الزکوة، فنقول: ما یمنع وجوب الزکوة أنواع: منها الدین، قال أصحابنا: کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکاة، سواء کان الدین للعباد أو لله تعالی. إلخ (۲۲۸/۳)

قال محمد رحمه الله في "الجامع" أیضاً: رجل له دراهم ودنانیر، وعروض التجارة، والسوائم، ومال قنیة، وعقار، وعلیه دین مستغرق فلا زکاة علیه، وقد مر هذا. وإن استغرق الدین بعض هذه الأموال ذکر في عامة نسخ "الجامع": أنه یصرف الدین إلی نصاب الدراهم والدنانیر [ثم] إلی مال التجارة، وهکذا ذکر في "النوادر". وذکر فی بعض نسخ "الجامع": أنه یصرف الدین إلی الدراهم والدنانیر، وأموال التجارة، وسوی بین الدراهم والدنانیر وأموال التجارة، والأول أصح.

یجب أن یعلم أنه إذا کان للمدیون صنوف من الأموال المختلفة، والدین مستغرق بعض هذه الأموال، فالدین أولاً یصرف إلی الدراهم والدنانیر، إما لأن قضاء الدین استبدل من حیث إن الدیون تقضی بأمثالها، و[القضاء] بالمثل مبادلة، فکان صرفه إلی مال معدّ للاستبدال أولی، والدراهم والدنانیر معدّة للاستبدال دون غیرها، وإما لأن الدراهم والدنانیر أیسر المالین قضاء، والدین أبداً یصرف إلی أیسر المالین قضاءً؛ فإن فضل شيء من الدین یصرف إلی عروض التجارة دون السائمة، إلخ (۲۳۱/۳،۲۳۲)

اور دَین کے سلسلہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ: وہ دَین چاہے فوری ادائیگی

والا ہو یا مؤجل، بہر صورت وہ وجوبِ زکوۃ سے مانع ہے۔

"تبیین" میں ہے: ولافرق في الدين بين المؤجل والحال. (۱/۲۵۴)

"بحر الرائق" میں صاحبِ کنز کے قول "فارغ عن الدين" کی تشریح میں ہے: أطلقه فشمل الحال والمؤجل. (بحر الرائق ۲/۲۱۹)

"بدائع الصنائع" میں ہے: ومنها أن لايكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا، فإن كان فإنه يمنع وجوب الزكاة بقدره، حالاً كان أو مؤجلاً. (۲/۶)

"امداد الاحکام" میں ہے:

سوال: ایک شخص نے چار ہزار روپیہ میں ایک زمین خریدی، جس کی ادا دس قسطوں میں قرار پائی ہے، ایک قسط وہ ادا کر چکا اور زمین پر قابض ہو گیا، دوسری قسط کے لیے ڈھائی سو روپیہ اُس کے پاس رکھا ہے جس پر حولانِ حول ہو چکا ہے، تو اُس رقم پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور زمین کا قرض مانعِ وجوبِ زکوۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اُس رقم پر زکوۃ واجب نہیں، قرض بہر حال مانع وجوبِ زکوۃ ہے خواہ زمین کی وجہ سے ہو یا کسی اَور وجہ سے، اور خواہ اُس کی ادا بالاقساط مشروط ہو یا بلا اقساط۔ والله أعلم. (۲/۲۸)

معلوم ہوا جس قرض کی ادائیگی قسطوں کی شکل میں تجویز ہوئی ہو وہ بھی بہر حال وجوبِ زکوۃ سے مانع ہے۔

مالِ نصاب میں سے دین اور قرض کو مِنہا کرنے کے سلسلہ میں بھی حضراتِ فقہاء نے ترتیب ملحوظ رکھی ہے، مثلاً: کسی آدمی کے پاس مختلف نصاب ہیں، یعنی دراہم ودنانیر والا نصاب بھی ہے اور مالِ تجارت والا نصاب بھی ہے، اور سوائم (مویشیوں) والا نصاب بھی ہے، اور وہ آدمی مدیون بھی ہے، تو اُس کا دین اوّلاً دراہم ودنانیر والے نصاب سے

مِنہا کیا جائے گا، اگر اُس میں سے مِنہا کرنے سے وہ دَین پورا ہو جاتا ہے تو اُس نصاب کی زکوۃ اُس پر واجب نہ ہوگی؛ لیکن بقیہ نصابوں (مالِ تجارت اور سوائم) کی زکوۃ اُس پر واجب ہوگی، اگر دراہم ودنانیر سے بھی وہ دَین پورا نہیں ہو رہا ہے تو پھر مالِ تجارت والے نصاب میں سے مِنہا کیا جائے، اِس کے بعد جو نصاب بچ جائے اُس کی زکوۃ وہ ادا کرے گا۔

"عنایہ" شرحِ ہدایہ میں ہے: اعلم أن المديون إذا كان له صنوف من الأموال المختلفة والدين يستغرق بعضها، صرف أولاً إلى النقود، فإن فضل شيء منه صرف إلى عروض التجارة دون السائمة، فإن فضل شيء منه صرف إلى مال القنية، فإن كان له نصب من الإبل والبقر والغنم يصرف إلى أقلها زكاة. الخ (عنایه على هامش فتح القدير ۲/۱٦۱)

"محيط برهانی" میں ہے: يجب أن يعلم أنه إذا كان للمديون صنوف. الخ (پوری عبارت اوپر آچکی ہے)، آگے تحریر فرماتے ہیں: فإن كان له نصاب من السوائم والإبل والبقر والغنم فالدين يصرف إلى أقلها زكاةً، حتى إنّ في هذه المسألة يصرف الدين إلى الإبل والغنم. الخ(۳/۲۳۲)

اِس ضروری وضاحت کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب دیے جارہے ہیں:

(۱) مذکورہ بالا پوری تمہید سے یہ بات صاف ہو چکی کہ، اگر کسی کے پاس اموالِ زکوۃ (نقود، مالِ تجارت، سوائم) میں سے کوئی مال بقدرِ نصاب ہو اور وہ دین سے خالی ہو، تب ہی اُس پر زکوۃ واجب ہوگی، چاہے وہ دین معجّل ہو یا مؤجل، چاہے بالأقساط ہو یا بِلا اَقساط، ہر حال میں وہ دین وجوبِ زکوۃ سے مانع ہے۔

آپ نے اپنے سوال میں جو صورتِ مسئلہ پیش کی ہے اُس میں زید ۸۰ لاکھ روپیہ کا مدیون ہے (اگر چہ یہ رقم اُس کو کئی سالوں میں قسط وار ادا کرنی ہے) تو جب زید کا زکوۃ کا سال پورا ہوگا اُس وقت اُس کے پاس اموالِ زکوۃ میں سے جتنی بھی اصناف موجود ہوں گی، اُن میں سے بالترتیب اُس کا یہ قرض مِنہا کیا جائے گا، اِس کے بعد اگر اُس کے پاس اموالِ زکوۃ میں سے کوئی مال بقدرِ نصاب بچ جاتا ہے تو اُس پر زکوۃ واجب ہوگی؛ ورنہ نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں زکوۃ کا سال پورا ہونے پر زید کے پاس جو نقد رقم موجود ہے چاہے اُس پراپرٹی کے کرایہ کی شکل میں حاصل شدہ ہو یا اَور کسی ذریعہ سے اُس کی ملک میں آئی ہو، وہ اور جتنا سونا اور چاندی اُس کی مِلک میں ہے اُس کی قیمت لگا کر اُس کے مجموعہ سے ۸۰ لاکھ روپیے قرض منہا کیا جائے، اگر بقدرِ نصاب مال بچتا ہے تو اِس بچے ہوئے پر زکوۃ واجب ہوگی؛ ورنہ بقایا قرض کو مالِ تجارت میں سے منہا کیا جائے، اگر اُس سے قرض پورا ہو جاتا ہے اور بچا ہوا مال بقدرِ نصاب ہے، تو اُس پر زکوۃ واجب ہوگی؛ ورنہ نہیں۔

آپ نے اپنی سمجھ سے وجوبِ زکوۃ کا جو حساب لکھا ہے وہ درست نہیں۔

نوٹ: البتہ اِس صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اِس زمانہ میں بڑے بڑے مالداروں کا کاروبار ہی یہ ہو گیا ہے کہ قابلِ زکوۃ مال جتنا بڑھتا جاتا ہے اُس سے زیادہ قرض لیتے جاتے ہیں، اور نئی نئی مِلیں، کارخانے کھولتے جاتے ہیں، اگر اِن سب قرضوں کو مِنہا کیا جائے تو ایسے مالداروں کو شاید زکوۃ دینے کی توفیق ہی نہ ہو، جو مقاصدِ شریعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے؛ اِسی لیے دورِ حاضر کے بعض اربابِ فتویٰ خصوصاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتوی یہ تھا کہ: ایسے کاروباری حضرات کے لیے اپنے آپ کو زکوۃ سے فارغ سمجھنا مناسب نہیں، اور جس قدر اپنا مال قابلِ زکوۃ ہے اُس کی زکوۃ

دینی چاہیے، بالخصوص جب کہ امام شافعیؒ کے نزدیک کسی بھی قسم کے قرض کو زکوۃ سے منہا کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اُن کا فتوی بطورِ وجوب نہیں؛ بلکہ بطورِ مشورہ ہے؛ اِس لیے کہ حنفیہ کا مسلک (جیسا کہ اوپر آچکا) یہی ہے کہ اگر کوئی صاحبِ نصاب مقروض ہو تو قابلِ زکوۃ مالیت میں سے قرض مِنہا کیا جائے گا، مِنہائی کے بعد اگر وہ شخص صاحبِ نصاب ہی نہ رہا تو زکوۃ واجب نہیں؛ ورنہ صرف باقی مال کی زکوۃ واجب ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب ''فقہی مقالات'' ۳/ ۱۵۵ پر ''قرضوں کی مِنہائی'' کے عنوان کے ماتحت ''قرضوں کی قسمیں'' اور پھر ''تجارتی قرضے کب مِنہا کیے جائیں'' اِن عنوانات سے جو حکم بیان کیا ہے اُس کی بنیاد بھی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا یہی مَوقف ہے۔

(۲) آپ کے اِس سوال کی بنیاد بھی وہی نظریہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا؛ ورنہ حنفیہ کا جو اصل مسلک ہے اُس کے اعتبار سے قرض دار پر بنیتِ تجارت خریدی ہوئی اِس پراپرٹی کی قیمت میں سے پورا قرض منہا کرنے کے بعد جو حصہ بچے گا، اُسی کی زکوۃ واجب ہوگی، اور اِس صورت میں آپ کا یہ اشکال کہ ایک ہی پیسہ پر دوہری زکوۃ لازم آتی ہے، وارد نہیں ہوتا۔

(۳) آپ کے اِس سوال کی بنیاد بھی وہی نظریہ ہے جو اوپر بیان کیا جاچکا۔

صورتِ مسئولہ میں اُس پر پچاس لاکھ کی جو ادائیگی باقی ہے وہ پورا دَین مالِ تجارت میں سے مِنہا کرنے کے بعد جو مال بچ جائے گا، اُس پر بقدرِ حساب زکوۃ واجب ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ

زکوٰۃ میں مالِ تجارت کی قیمتِ فروخت لگائی جائے گی

سوال: تجارت کا سامان کپڑا، وغیرہ کا حساب لگاتے وقت خریدے ہوئے حساب سے یا کہ جس نرخ پر بیچے اُس حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قیمتِ فروخت لگائی جائے گی۔ (احسن الفتاوی ۴/ ۳۰۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ضرورت کے لیے جو رقم ہے کیا اُس پر زکوٰۃ ہوگی؟

سوال: ایک شخص کے پاس کئی ہزار روپیے جمع ہیں، اُس پر سال بھی گذر چکا ہے؛ مگر اُس کے پاس نہ مکان ہے اور نہ ہی گھریلو سامان، ابھی شادی بھی نہیں کی، اِن ہی ضروریات کے لیے روپیہ جمع کر رکھا ہے، اِس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اِس پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ اگر سال پورا ہونے سے قبل تعمیرِ مکان کا سامان یا گھریلو استعمال کی اشیاء وغیرہ خرید لے، تو زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ (احسن الفتاوی ۴/ ۲۹۱ بحوالۂ شامی ۲/ ۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حج کے لیے جمع کرائی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص رمضان میں زکوٰۃ نکالتا ہے، اِس سال حج میں جانے کا ارادہ ہے؛ لہٰذا حج کو جانے کے لیے پیشگی رقم جمع کرائی ہے، اب اِس کی روانگی شعبان میں متوقع ہے؛ لہٰذا جو رقم جمع کی گئی ہے اُس کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آمد و رفت کا کرایہ اور معلم وغیرہ کی فیس کے لیے جو رقم دی گئی ہے اُس پر زکوٰۃ

نہیں ہے، اِس سے زائد رقم جو کرنسی کی صورت میں اُس کو واپس ملے گی اُس میں سے یکم رمضان المبارک تک جتنی رقم بچے گی اُس پر زکوٰۃ فرض ہے، جو خرچ ہو گئی اُس پر نہیں۔ (احسن الفتاوی ۴/۲۶۴ بحوالۂ شامی ۱/ ۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا شیئرز کی خریداری پر زکوٰۃ ہے؟

سوال: زید نے ایک کمپنی کے پندرہ حصے پانچ ہزار کے خریدے، اِس میں جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سالانہ تقسیم ہو کر حصہ داروں کو ملتا ہے، تو کیا زید کے ذمہ پانچ ہزار کی زکوٰۃ دینا لازم ہے یا منافعِ سالانہ کی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید کو اُس رقم پانچ ہزار کی زکوٰۃ بھی دینی لازم اور فرض ہے۔ (فتاوی دارالعلوم ۶/ ۱۴۰ بحوالۂ شامی ۲/ ۱۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شیئرز (حصص) پر زکوٰۃ کونسی قیمت پر ہے؟

سوال: ایک شخص نے تجارتی کمپنی کے حصص خریدے، جب کمپنی شروع ہوئی تھی اُس وقت ایک حصہ پانچ سو روپے کا تھا، اور جس وقت اُس نے حصے خریدے اُس وقت ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار تھی، اور اِس وقت ایک حصہ کی قیمت پانچ سو روپے ہے، تو یہ شخص کس قدر زکوٰۃ دے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو قیمت اِس وقت ہے یعنی پانچ سو روپے کی ادا کرے۔ (فتاوی دارالعلوم ۶/ ۱۴۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حیلۂ زکوٰۃ میں مصرف پر دباؤ ڈالنا صحیح نہیں

سوال: حیلۂ زکوۃ میں زکوٰۃ کی رقم دیتے ہوئے اگر یہ شرط لگائی جائے کہ روپیہ

ہمیں واپس لوٹا دینا، اگر لوٹاؤ گے نہیں تو سزا دی جائے گی، یا واپس نہ کرنے پر جرمانہ عائد کیا جائے گا، تو کیا اِس طرح شرط لگانا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

من عليه الزكوٰة لو أراد صرفها إلى بناء المسجد والقنطرة لايجوز، فإن أراد الحيلة فالحيلة أن يتصدق به المتولي على الفقراء، ثم الفقراء يدفعونه إلى المتولي، ثم المتولي يصرف إلى ذلك. كذا في الذخيرة. (عالمگیری)

کسی مصرف کو مجبور کرنا اور اُس پر دباؤ ڈالنا درست نہیں۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۳۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

مدارس میں رائج حیلۂ زکوۃ کا حکم

سوال: (۱) ایک مدرسہ ہے جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہے، اُس میں بالغ و نابالغ طلباء زیر تعلیم ہیں، یہ طلباء جب مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو اُن سے خورا کی فیس کہہ کر کھانے کی فیس متعینہ مثلاً: تین سو روپیہ ماہانہ وصول کی جاتی ہے، اگر طالبِ علم کی حیثیت کمزور ہوتی ہے اور وہ خورا کی فیس مکمل نہیں ادا کر سکتا ہے، اور وہ مستحقِ زکوۃ ہے، تو اُس کو مُدِ زکاۃ سے رقم تملیکاً دے کر بقیہ خورا کی فیس وصول کی جاتی ہے، اور بچوں کو خورا کی فیس کے عوض مطبخ میں بٹھا کر کھلایا جاتا ہے، کسی بچے کو کھانا مطبخ سے باہر لے جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے، ایک روٹی بھی باہر نہیں لے جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ خورا کی فیس کے عوض مذکورہ طریقہ سے کھلانے میں شرعاً کوئی حرج ہے یا نہیں؟ نیز ہر جمعہ کو تقریباً ایک تہائی بچے ایک دن یا زیادہ کھانا نہیں کھاتے، بعض بچے بیماری وغیرہ کی وجہ سے کم و بیش ایام کھانا نہیں کھاتے، اِس کے باوجود خورا کی فیس میں کوئی کمی نہیں ہوتی تو شرعاً اِس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

خوراکی فیس کا مطلب تو یہی ہے کہ پورا مہینہ جو کھانا فیس ادا کرنے والے طالب علم کو دیا جاتا ہے وہ قیمتاً دیا جارہا ہے، اور خوراکی فیس کے نام سے جو رقم اُس سے وصول کی گئی وہ اُس کھانے کی قیمت ہے؛ اِس لیے اگر کوئی طالب علم اپنا کھانا کمرہ پر لے جانا چاہے تو اُس کو اِس کا حق حاصل ہونا چاہیے؛ نیز اگر مہینہ میں ایک دن یا اِس سے زیادہ کھانا نہیں کھایا تو اِس حساب سے رقم واپس لینے کا اُس کو اختیار ہوگا۔

ہمارے مدارس میں جو طریقہ رائج ہے جس کی تفصیل آپ نے سوال میں لکھی ہے، وہ شرعی اعتبار سے درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

داخلہ فارم میں توکیل بالصرف کا کالم پُر کرواکر حیلۂ تملیک سے نجات درست نہیں

سوال: (۲) مدارس میں صدقاتِ واجبہ، زکوۃ کی جو رقوم آتی ہیں اُس کے خرچ کے لیے مختلف حیلے اختیار کیے جاتے ہیں، تو اگر مندرجۂ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے تو شرعاً اِس میں کوئی حرج ہے یا نہیں؟

وہ طریقہ یہ ہے کہ: تمام بالغ ونابالغ طلباء مہتممِ مدرسہ کو زکوۃ کی رقم اپنے جملہ مصارف میں خرچ کرنے کا وکیل بنادیں، پس مہتمم جس طرح طلباء کی طرف سے زکوۃ وغیرہ صدقاتِ واجبہ پر قبضہ کرنے کا وکیل ہے۔ (بقول حضرت مفتی شفیع صاحبؒ) اِسی طرح وہ طلباء کی جانب سے جملہ مصارفِ مدرسین وملازمین کی تنخواہیں، تعمیرات، خرید کتب، لائٹ بل وغیرہ میں بن جائے، جس کی صورت یہ ہو کہ داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں ایک کالم پُر کروایا جائے جس میں طالبِ علم مہتممِ مدرسہ کو صراحۃً وکیل بنادے۔

اب سوال یہ ہے کہ: کیا اِس طرح داخلہ فارم میں کالم پُر کروانے سے مہتمم، طلبہ کی

جانب سے خرچ کرنے کا وکیل بن جائے گا؟ اور کیا مہتمم کو صدقاتِ واجبہ کی رقوم مدرسہ کے اخراجات میں بلا حیلۂ تملیک صَرف کرنے کا اختیار رہوگا؟

امید ہے کہ تسلی بخش جواب سے نوازیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں مذکور طریقہ جس میں طالبِ علم مہتممِ مدرسہ کو صراحۃً اپنے مصارف میں صَرف کرنے کا وکیل بنائے، اِس صورت میں طالبِ علم کی وہ ضروریات جن میں وہ چیز اُس کے حوالہ کردی جاتی ہے، مثلاً: کھانا (جہاں کمرہ پر دیا جاتا ہے)، لباس وغیرہ؛ اِن کی تکمیل میں جو صَرف ہوا اُس میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم لگانا قابلِ اشکال نہیں؛ لیکن جو رقم خریداریٔ کتب میں صَرف ہوئی یا تعمیر میں صَرف ہوئی، وہاں پر اشکال یہ ہے کہ اِن کی رقم سے خریدی ہوئی کتابیں مالک بنا کر اُن کے حوالہ نہیں کردی جاتیں؛ بلکہ عاریۃً دی جاتی ہیں، جو سال ختم ہونے پر واپس وصول کرلی جاتی ہیں، جب اِن کتابوں کو اِن کی رقوم سے خریدا گیا تو گویا وہ طلباء مشترکہ طور پر اِس کے مالک بنے، اب یہ کتابیں اُن سے واپس لے کر مدرسہ میں رکھ لینا کیا معنی رکھتا ہے؟ تعمیرات میں خرچ ہونے والی رقوم کا بھی یہی حال ہے۔

بہرحال داخلہ فارم میں توکیل بالصرف کا کالم پُر کرواکر حیلۂ تملیک سے مکمل طور پر نجات مل جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

نیز ارشادِ نبوی ﷺ ”لا یحل مال امرء مسلم إلا بطيبة نفس منه“ کی وجہ سے بھی اشکال پیدا ہوتا ہے کہ، یہ خانہ پُری اپنے داخلہ کی ضرورت کی وجہ سے بدرجۂ مجبوری نہ کی جارہی ہو؛ اِس لیے کہ اِس کو معلوم ہے کہ اگر مَیں یہ خانہ پُری کرکے منتظمِ مدرسہ کو وکیل بالصَّرف نہیں بناؤں گا تو میرا داخلہ نہیں ہوگا۔

پھر مدرسہ میں موجود طلباء کی طرف سے وکیل بالصرف ماننے کی صورت میں حسبِ ضابطہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ، ہر ایک کی طرف سے یکساں طور پر وکیل بالصرف ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ رقوم میں سے جتنی رقم خرچ ہوئی وہ اِن طلباء پر تقسیم مان کر ہر ایک کے حصہ میں جتنی آتی ہے، گویا اُس نے اُتنی مقدار کے صرف کا مہتمم کو وکیل بنایا؛ حالاں کہ تمام طلباء کی ضروریات یکساں نہیں، مثلاً دورۂ حدیث میں پڑھنے والے طالبِ علم کو پڑھانے والے اساتذہ کو جو تنخواہ دی جاتی ہے، اُس کی مقدار ابتدائی درجات میں پڑھنے والے طلباء کے اساتذہ کو دی جانے والی تنخواہ کی مقدار سے زیادہ ہے، یا مثلاً اِس سال مدرسہ میں جو تعمیرات ہوئیں وہ اِس سال میں پڑھنے والے طلباء کی رقوم سے ہوئیں، اب جب وہ مدرسہ چھوڑ کر جارہے ہیں اور اِن کی مملوکہ چیز یہیں محبوس ہے، اُن کو اِس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جارہا ہے، اور اُن سے یہ بھی نہیں درخواست کی جاتی کہ اِن تعمیرات میں آپ کا جو حصہ ہے وہ آپ مدرسہ کو ہبہ کردیں، تو توَکیل کے اِس مضمون سے مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ بلکہ یہاں تو یہ اشکال ہوگا کہ ایک کے مال کو دوسرے کی ضروریات میں خرچ کردیا گیا، جب کہ قدیم زمانہ کے حیلۂ تملیک میں یہ اشکالات پیش نہیں آتے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۷/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

مُہاجن (غیر مسلم) سے قرض لے کر زکوۃ دینے کا حیلہ

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام مسائل ذیل کے بارے میں:

کہ آج کل مدارس میں زکوۃ ہی زیادہ وصول ہوتی ہے، امداد تو شاذ ونادر؛ اِس لیے مدارس کے اربابِ حل وعَقد شریعت کے مقرر کردہ طریقہ (حیلۂ تملیک) سے فائدہ

اٹھا لیتے ہیں؛ مگر ہمارے یہاں اہلِ مدرسہ اِس حیلۂ تملیک سے بھی کلی طور پر متفق نہیں، تو اِس صورت میں مہتمم کیا یہ کرسکتا ہے کہ اول کسی مہاجن وغیرہ سے قرض اٹھالے اور اُس کو مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کرے، بعد میں زکوۃ کی مُد سے اُس قرضہ کو ادا کردے، تو کیا مہتمم زکوۃ کی مُد سے مدرسہ کا قرضہ ادا کرسکتا ہے؟

مہتمم طلبہ کا وکیل

(۲) کیا مہتمم طلبہ کا شرعی وکیل ہوسکتا ہے؟ جواب مُفصَّل مطلوب ہے۔

زکوۃ کی رقم طلبہ کو بطور وظیفہ دینا۔ حیلوں کی شرعی حیثیت واقسام

(۳) یا زکوۃ کی رقم کو مدرسہ کی جملہ مدات میں استعمال کرنے کے لیے وظیفہ کا طریقہ اختیار کرلیا جائے، اور طلبہ سے ماہانہ وظیفہ کے ذریعہ جو رقم اکھٹی ہو اُس سے مدرسین کی تنخواہیں ودیگر ضروریات پوری کرلی جائیں، جیسا کہ بعض مدارس میں ایسا بھی ہوتا ہے، تو کیا اِس شکل میں مہتمم اُس رقم کو جو زکوۃ کی ہے اور طلبہ کے وظیفہ میں دی ہے، طلبہ نے اُس کو اپنی فیس طعام وغیرہ میں مدرسہ میں جمع کردیا، مدرسہ کی دیگر ضروریات میں خرچ کی جاسکتی ہے؟

(الف): طلبہ بالغ ہوں یا نابالغ ہوں؟

(ب): نابالغ طلبہ کو مالک بنانے کی کیا صورت ہو؟

(ج): مستطیع طلبہ ہی ہوں یا غیر مستطیع طلبہ کو مالک بنایا جاسکتا ہے؟

(د) کسی طالب علم کے ورثاء تو مستحق زکوۃ نہیں ہیں؛ مگر وہ بچہ کا خرچ بھی مدرسہ میں نہیں دے سکتے، تو اِس شکل میں کیا حکم ہے؟ اُس پر زکوۃ خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(ہ): اگر طلبہ کے ورثاء سے لکھوالیا جائے کہ ہم خرچ برداشت نہیں کرسکتے، تو کیا اُن طلبہ پر زکوۃ خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(و): کیا یہ بھی درست ہے کہ بیرونی طلبہ جو نابالغ ہوں اُن کے وارثین کی طرف سے کسی کو سرپرست بنا دیا جائے، اور وہ سرپرست بیت المال سے اُن طلبہ کے وظیفہ کی شکل میں رقم لے کر مدرسہ میں جمع کرادے، اور مدرسہ وہ رقم تنخواہ و جملہ مدات میں صَرف کرے، فی زماننا اِس کا بہتر طریقہ کیا ہے جو شکوک سے بالا ہو؟ نیز اِس مسئلہ میں قرآن وحدیث کا کیا حکم ہے؟ اور تعاملِ صحابہ اور اجماعِ امت کا کیا کہنا ہے؟ اِس مسئلہ پر تحقیقی نقطۂ نظر سے قلم اُٹھائیں گے تو حضرت کی ذرہ نوازی ہوگی؛ کیوں کہ حیلۂ تملیک تو بظاہر رقم کی ہیرا پھیری کا نام ہے، اِس مسئلہ پر معترضین کے منھ کس طرح بند کیے جائیں۔

جوابات مفصل مدلل تحریر کیے جائیں؛ تاکہ اُنہیں اِفادۂ عام کے لیے چھپوایا جا سکے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ کی تعریف یہ کی گئی ہے: هي تمليك جزء مال عيَّنه الشارع من مسلم فقير غير هاشمي ولا مولاه، مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالى. (تنوير الأبصار) اِس لیے زکوۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ زکوۃ کے مال کا بلا شرط عوض مالک بنا دیا جائے، مہاجن کو جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ اِس کے پاس سے خریدے ہوئے مال یا لیے ہوئے قرض کی ادائیگی میں دیا جا رہا ہے؛ نیز وہ مسلمان بھی نہیں؛ اِس لیے اِس طریقہ سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔

(۲) مہتمم، طلبہ کا وکیل بایں معنیٰ ہے کہ، جب طلبہ نے اُس کے اہتمام کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ کہہ دیا کہ: آپ ہمارے واسطے اربابِ اموال سے زکوۃ وغیرہ وصول کر کے ہماری ضروریات (کھانا، کپڑا وغیرہ) میں صَرف کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ قدیم ۳/ ۴۸) لیکن اِس صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ اُس زکوۃ کی رقم سے جو کچھ خریدا جائے وہ بعد میں طلبہ کو تملیکاً

دے دیا جائے؛ اِس لیے کہ اِس کی حیثیت وکیل بالقبض اور پھر وکیل بالشراء کی ہے۔

(۳) وظیفہ والے طریقہ کو اختیار کرنے میں بھی کوئی اشکال نہیں، جس کی شکل یہ ہے: بوقتِ داخلہ طلبہ کو کہہ دیا جائے کہ آپ کا داخلہ فیس سے ہے، جس کی مقدار مثلاً ماہانہ دوسو روپیہ ہے، اور طلبہ اِس کو منظور کر لیں، اِس کے بعد ہر ماہ اُتنی مقدار اُن کے ہاتھ میں دی جائے، اور وہ بطورِ فیس مدرسہ میں جمع کرا دیں، اب اِس رقم کو منتظمینِ مدرسہ ضروریاتِ طلبہ، تنخواہِ مدرسین وملازمین اور دیگر ضروریاتِ مدرسہ میں بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ ۱۵۰/۵)

(الف) طلبہ چاہے بالغ ہوں یا نابالغ۔

(ب) نابالغ بھی اگر مَصرفِ زکوۃ ہو تو اُس کو دینے سے زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۵۲/۲) اِس کا عاقل ہونا کافی ہے، یعنی مال کی اہمیت اور حیثیت جانتا ہو، کوئی دھوکہ دے کر اُس سے مال ہتھیا نہ سکتا ہو جیسے کہ ایک دَم چھوٹے بچے کو سویٹ، مٹھائی وغیرہ دے کر پھسلا کر دھوکہ دیا جاتا ہے۔ ''شامی'' میں ہے:

ويصرف إلى مراهق يعقل الأخذ، كما في المحيط. (شامي ٦٨/٢)

(بشرط أن يعقل القبض) قيد في الدفع و الكسوة كليهما، ح. وفسره في الفتح وغيره بالذي لا يرمى به ولا يخدع عنه، فإن لم يكن عاقلا فقبض عنه أبوه أو وصيه أو من يعوله، قريبا أو أجنبيا أو ملتقطه صح. (شامي ٣/٢)

(ج) جو طلبہ غیر مستطیع ہوں اُن کو مالک بنایا جائے، اگر وہ بالغ ہیں تو خود اُس کی ملک میں بقدرِ نصاب مال نہ ہو، چاہے اُن کا باپ مالدار ہو، اور اگر وہ نابالغ ہیں تو خود اُن کی ملک میں بقدرِ نصاب مال نہ ہونے کے ساتھ اُن کے باپ کا بھی فقیر ہونا ضروری ہے۔

(د) اگر وہ بالغ ہیں تو اُن کو زکوۃ دی جا سکتی ہے۔ (بشرطیکہ خود اُن کی ملک میں

بھی بقدرِ نصاب مال نہ ہو)، نابالغ ہیں تو نہیں۔

(ہ): صورتِ سابقہ کی طرح۔

(و): اِس کے بغیر بھی جب کام چل سکتا ہے جیسا کہ صورت ''ب'' میں مذکور ہے، تو اِس کی کیا ضرورت ہے؟

اِس میں حیلہ کا استعمال بلاضرورت جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر مدرسہ کی کوئی اَور آمدنی نہ ہو اور مدرسہ بند ہو جانے کا خطرہ ہو، تو زکوۃ کا روپیہ حیلۂ شرعیہ کے ساتھ (مدرسین وملازمین کی تنخواہوں میں) خرچ کیا جاسکتا ہے۔ (کفایت المفتی ۴/ ۲۸۵)

حیلہ کے سلسلہ میں ایک بات اصولی طور پر یاد رکھنے کی ضرورت ہے؛ اِس لیے کہ جب کوئی آدمی دَفعِ حقوق کے لیے حیلوں کو کتاب میں دیکھتا ہے تو اُس کو اُس پر حیرت ہوتی ہے، کہ اسلام میں اِس مکر وفریب کی اجازت کیسے ہوگئی؟ جب کہ اسلام تو اِس قسم کی حرکتوں کو مٹانے اور ختم کرنے کے لیے آیا ہے، تو بھلا اسلام کے پیش کردہ طریقِ اصلاح سے اِس فساد کا کیا جوڑ؟ حالاں کہ اگر اِس کے شروع میں تصحیح کردی جائے کہ لوگوں کے اموال قبضانے کے لیے حیلے اختیار کرنا حرام ہے، تو دل کو تسکین ہو جاتی ہے، کہ یہ تو اُن لوگوں کے لیے ہے جو پھنس گئے ہیں اور اپنی خَلاصی چاہتے ہیں، اِس سے مقصود اِن حیلوں کی ترویج اور لوگوں کے اموال کو ہڑپ کرنے کی اجازت نہیں ہے، تو پھر کوئی اشکال باقی نہ رہتا۔ (فیض الباری ۴/ ۴۷۹، ۴۸۰)

چناں چہ حیلوں کی شرعی حیثیت معلوم کرنے سے پہلے اُس کے اقسام جاننا ضروری ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ: حیلہ کے محرکات کے اعتبار سے اس کی چند قسمیں ہیں:

اول: اگر کوئی آدمی کسی جائز ومُباح طریقہ سے کسی کے حق کو باطل کرنا یا کسی

باطل چیز کو ثابت کرنا چاہتا ہے، تو وہ حرام ہے۔

دوم: اور اگر مباح طریقہ سے کسی حق کو ثابت کرنا یا باطل کو دَفع کرنا چاہتا ہے، تو وہ واجب یا مستحب ہے۔

سوم: اور اگر کسی مُباح طریقہ سے اپنے آپ کو کسی مکروہ میں پھنسنے سے بچانا چاہتا ہے تو وہ مستحب یا مباح ہے۔

چہارم: اور اگر کسی مباح ذریعہ سے کسی فعلِ مندوب کو چھوڑنا چاہتا ہے تو وہ مکروہ ہے۔

اِن اقسامِ اربعہ میں سے قسمِ اول کے سلسلہ میں ائمہ میں اختلاف ہے، کہ کیا اِس قسم کے حیلے مطلقاً صحیح ہو کر ظاہر و باطن میں نافذ ہو جاتے ہیں یا مطلقاً باطن میں؟ یا صحیح تو ہے؛ لیکن گناہ کے ساتھ؟ چناں چہ جن حضرات نے مطلقاً اِس کو جائز قرار دیا یا مطلق باطل قرار دیا، دونوں کے پاس دلائل ہیں۔ پہلی جماعت کے دلائل میں سے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿خذ بيدك ضغثاً فاضرب به ولا تحنث﴾ اور خود نبی کریم ﷺ نے اِس حیلہ پر اُس آدمی کے سلسلہ میں عمل کیا جو بیماری کی وجہ سے نہایت کمزور تھا۔ سنن میں ابواُمامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ واقعہ مذکور ہے، اور ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ومن يتق الله يجعل له مخرجاً﴾ اور حیلہ بھی تو اِسی کا مصداق ہے، اور شریعت کی طرف سے استثناء کی اجازت دینا اِس لیے کہ اس میں بھی حنث فی الیمین سے اپنے کو بچانا ہے، اِسی طرح تمام شروط کا حال ہے، کہ اِس میں اپنے آپ کو حرج میں پڑنے سے بچانا ہے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قصہ میں "بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً". (فتح الباري ١٢/٢٧٥)

علاّمہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ: اپنے کو حرام سے بچانے اور گناہ میں مبتلا ہونے سے

دور رکھنے کے لیے حیلہ اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ وہ مستحسن ہے؛ البتہ کسی مسلمان کے حق کو باطل وختم کرنے کے لیے حیلہ اختیار کرنا گناہ ہے وسرکشی ہے۔ علامہ نسفیؒ نے اپنی کتاب "الکافي" میں امام محمد بن الحسنؒ سے نقل فرمایا ہے کہ: مبطلِ حق حیلے اختیار کرکے خدائی احکام سے فرار اختیار کرنا مؤمن کی شان نہیں۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری ۲۴/ ۱۰۸،۱۰۹)

علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے اپنی کتاب ''مبسوط'' میں اِس پر سَیر حاصل بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے، کہ جو حضرات علی الاطلاق اِس کو غلط ومکروہ سمجھتے ہیں یہ اُن کی ناواقفیت اور کتاب وسنت میں عدمِ تدبُّر کی وجہ سے ہے۔ (المبسوط للسرخسی ۳۰/ ۲۰۸)

اِس کے بعد اُنھوں نے کتاب وسنت سے اِس کے دلائلِ جواز پیش کیے ہیں: چناں چہ سب سے پہلی دلیل حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اِس واقعہ کی بقدرِ ضرورت تفصیل معارف القرآن سے پیش کرتا ہوں:

﴿واذكر عبدنا أيوب إذ نادى ربه أني مسني الشيطٰن بنصب وعذاب – إلى قوله تعالىٰ –: وخذ بيدك ضغثاً فاضرب به ولا تحنث﴾ الخ

خلاصۂ تفسیر میں فرماتے ہیں: اور آپ ہمارے بندہ ایوب (علیہ السلام) کو یاد کیجیے جب کہ اُنھوں نے اپنے رب کو پکارا، کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ اور یہ رنج اور آزار بعض مفسرین کے قول کے مطابق وہ ہے جو امام احمدؒ نے "کتاب الزهد" میں ابنِ عباس رضي الله عنهما سے روایت کیا ہے، کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانہ میں ایک بار شیطان ایک طبیب کی شکل میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو ملا تھا، اُس سے اِنھوں نے طبیب سمجھ کر علاج کی درخواست کی، اُس نے کہا کہ: اِس شرط سے کہ اگر

اُن کو شفاء ہو جائے تو یوں کہہ دینا کہ تُو نے اُن کو شفاء دی، مَیں اَور کچھ نذرانہ نہیں چاہتا، اِنھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام سے ذکر کیا، اُنھوں نے فرمایا کہ: بھلی مانس! وہ تو شیطان تھا، مَیں عہد کرتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو شفاء دے دے تو مَیں تجھ کو سو قمچیاں ماروں گا، پس آپ کو سخت رنج پہنچا اِس سے کہ میری بیماری کی بدولت شیطان کا یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ، خاص میری بیوی سے ایسے کلمات کہلوانا چاہتا ہے جو ظاہراً موجبِ شرک ہے، گو تاویل سے شرک نہ ہوں؛ اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام ازالۂ مرض کے لیے پہلے بھی دعا کر چکے تھے؛ مگر اِس واقعہ سے اَور زیادہ اِبتہال اور تضرُّع سے دعا کی، پس ہم نے اُن کی دعا قبول کرلی، اور حکم دیا کہ اپنا پاؤں (زمین پر) مارو (چنانچہ اُنھوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پیدا ہوگیا) رواہ احمد. (پس ہم نے اُن سے کہا کہ:) یہ تمھارے لیے نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا، (یعنی اِس میں غسل کرو اور پیو بھی، چنانچہ نہائے اور پیا بھی، اور بالکل اچھے ہوگئے ......اور اب حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا؛ مگر چوں کہ اُنھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی، اور اُن سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا؛ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اِن کے لیے ایک تخفیف فرمائی) اور (ارشاد فرمایا کہ: اے ایوب!) تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو (جس میں سو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اُس سے مارلو، اور (اپنی) قسم نہ توڑو، (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

آگے ''معارف و مسائل'' کے ذیل میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ''حیلوں کی شرعی حیثیت'': اِس آیت سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کے لیے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے،

ظاہر ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضہ یہ ہے کہ آپ اپنی زوجۂ مطہرہ کو پوری سو قمچیاں ماریں؛ لیکن چوں کہ اِن کی زوجۂ مطہرہ بے گناہ تھیں، اور اُنھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بے مثال خدمت کی تھی؛ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی، اور یہ تصریح کر دی کہ اِس طرح اِن کی قسم نہیں ٹوٹے گی؛ اِس لیے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے؛ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اِس قسم کے حیلے اُسی وقت جائز ہوتے ہیں جب کہ اُنہیں شرعی مقاصد کے اِبطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی حقدار کا حق باطل کیا جائے، یا کسی صریح فعل حرام کو اُس کی روح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لیے حلال کرلیا جائے، تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے۔ الخ (معارف القرآن ۷/۵۲۰تا۵۲۳ بحذف واختصار)

اِس کے بعد شمس الأئمہ سرخسیؒ نے دوسری دلیل قرآن میں ارشادِ ربانی: ﴿ولما جهزهم بجهازهم جعل السقاية في رحل أخيه –إلى قوله تعالى– ثم استخرجها من وعاء أخيه، كذلك كدنا ليوسف﴾ إلخ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اُن کے بھائی بنیامین کے ساتھ ہوا، اِس کو پیش کیا ہے، جس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنے کے لیے ایک حیلہ اختیار کیا تھا، (واقعہ معروف ہے، کُتبِ تفسیر میں دیکھ لیا جائے) اِسی واقعہ پر ''معارف ومسائل'' کے عنوان کے ماتحت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ﴿كذلك كدنا ليوسف﴾ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بناء پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائے، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''حیلۂ شرعیہ'' کہا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے، شرط یہ ہے کہ اِس سے شرعی احکام کا ابطال لازم نہ آتا ہو؛ ورنہ ایسے حیلے

باتفاقِ فقہاء حرام ہیں، جیسے: زکوۃ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ کرنا، یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اِس لیے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے، یہ باتفاق حرام ہے۔ ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذابِ الٰہی آیا ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے، اور باتفاقِ امت حرام ہیں، اُن پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہوجاتا؛ بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے: ایک تو اصل ناجائز کام کا، دوسرے یہ ناجائز حیلہ، جو ایک حیثیت سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ چال بازی کا مرادِف ہے، اِسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے "کتاب الحِیل" میں ثابت کیا ہے۔ (معارف القرآن ۵/۱۰۶، ۱۰۷)

اِس کے بعد مزید دو دلیلیں قرآن مجید سے پیش کرنے کے بعد شمس الائمہ سرخسیؒ نے حدیث سے دلائل پیش کیے ہیں: جن میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ، ایک آدمی نے حاضرِ خدمت ہوکر آپ ﷺ سے عرض کیا کہ: یارسولَ اللہ! مَیں نے اپنی بیوی پر تین طلاق کی قسم کھالی ہے کہ، مَیں اپنے بھائی سے بات نہیں کروں گا، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ایسا کرو کہ اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دو، پھر جب اُس کی عدت گزر جائے تو اپنے بھائی سے بات کرلو، اور پھر بیوی سے ازسرِنَو نکاح کرلو۔ (المبسوط ۳۰/۲۰۹)

اِس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو آدمی احکامِ شرعیہ میں غور فکر کرے گا تو دیکھے گا کہ تمام معاملات اِسی شان کے حامل ہیں، مثلاً: اگر کسی آدمی کو کسی عورت سے عشق و محبت ہوجائے، اور وہ پوچھے کہ: میرے لیے اُس کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ تو اُس کو کہا جائے گا کہ: اِس سے نکاح کرلو۔ کسی کو اپنی بیوی سے نفرت ہوجائے اور پوچھے کہ: میرے اِس سے خَلاصی کی کیا صورت ہے؟ تو جواب ملے گا کہ: طلاق دے دو۔ کوئی آدمی

اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے چکا ہو، اور اب نادم ہو اور پوچھے کہ: میرے لیے کیا تدبیر ہے؟ تو اُس کو کہا جائے گا کہ: رجوع کرلو۔ کوئی آدمی اپنی بیوی کو اُس کی بدخلقی کی وجہ سے تین طلاق دے چکا تھا، پھر وہ تائب ہوگئی، اور اب دونوں کوئی تدبیر چاہتے ہیں، جواب ملے گا کہ: حلالہ کے بعد نکاح کر سکتے ہو، تو جو آدمی احکام میں حیلہ کو ناپسند سمجھتا ہے تو در حقیقت وہ احکامِ شرعیہ سے ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا ہے، یہ باتیں قلتِ تدبر سے ناشی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے آدمی حرام سے بچے یا حلال حاصل کرے اچھا ہے؛ البتہ حیلہ کے ذریعہ کسی کے حق کو باطل کرنا، یا باطل میں ملاوٹ کر کے اُس کو خوبصورت بنانا ممنوع ہے۔(المبسوط ۲۱۰/۳۰)

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے بوقتِ ضرورت حیلہ کے جائز ہونے پر حدیث سے دو دلیلوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اِس کی وضاحت بھی مناسب ہے:

(۱) ابو داؤد شریف میں روایت موجود ہے کہ: ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، اور اُنھیں ایسی نقاہت لاحق ہوئی کہ ہڈی اور چمڑی رہ گئی، اِسی حالت میں کوئی باندی اُن کے پاس پہنچ گئی، اُس کو دیکھ کر اُن کی طبیعت میں سرور پیدا ہوا، اور اُس کے ساتھ جماع کرلیا، پھر جب اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس عیادت کے لیے گئے تو اِنھوں نے اُن لوگوں کو باخبر کیا، اور عرض کیا کہ: میرے لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم معلوم کرو کہ: مَیں ایک باندی سے جو میرے پاس آئی تھی، فعلِ بد کر بیٹھا؛ چنانچہ اُن لوگوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس واقعہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ: وہ آدمی جس آزار میں مبتلا ہے ایسا آزار ہم نے کسی پر نہیں دیکھا، وہ اِتنے کمزور ہوچکے ہیں کہ ہم اگر اُن کو اُٹھا کر آپ کی خدمت میں لے آئیں تب بھی اندیشہ ہے کہ اُن کی ہڈیاں ریزہ ریزہ

ہو جائیں، وہ تو محض ہڈی اور چمڑی کا مجموعہ ہیں، تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ: سوسینکیں لے کر یکبارگی اُن کو ماردو۔ (ابوداؤد شریف ۲/۶۱۴)

(۲) دوسری روایت جو تقریباً تمام کتب حدیث میں موجود ہے، یہاں ''بخاری'' شریف کے حوالہ سے پیش کرتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو خیبر پر عامل مقرر کیا، وہ شخص ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں عمدہ کھجوریں لے کر حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے سوال کیا کہ: خیبر کی تمام کھجوریں ایسی (عمدہ) ہوتی ہیں، اُنھوں نے عرض کیا: نہیں، بخدا! اے اللہ کے رسول! ہم اِس جیسی کجھوریں ایک صاع کی مقدار دیگر اقسام کی کھجوروں کے دو صاع کے عوض، اور اِس جیسی کھجوروں کے دو صاع دوسری کھجوروں کے تین صاع کے عوض حاصل کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ایسا نہ کرو؛ (بلکہ) دیگر اقسام کی کھجوریں دراہم کے عوض بیچو، پھر اُن دراہم سے عمدہ کھجوریں خریدو۔ (بخاری شریف ۱/۲۹۳)

اِن دونوں روایتوں کی حقیقت پر غور فرمایئے کہ اِن میں ایک حیلہ ہی تو بتلایا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ بوقتِ ضرورت حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے؛ البتہ اِس میں وہی شرط ہے جو ہم اوپر ''معارف القرآن'' کے حوالہ سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے کلام میں اور ''مبسوط'' کے حوالہ سے شمس الائمہ سرخسیؒ کے کلام میں نقل کر چکے ہیں، ایسے موقع پر جب شریعت حیلہ کی اجازت دیتی ہو تو اُس کو معیوب سمجھنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

اگر طمع خواہد زمن سلطان دیں	❁	خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

اب آپ حضرات حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے وہ الفاظ دوبارہ پڑھ لیجیے جو ہم اوپر ''کفایت المفتی'' کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں؛ اِس لیے اہلِ مدرسہ کو

چاہیے کہ مدرسین و ملازمین کی تنخواہ میں زکوۃ کا روپیہ حیلۂ شرعیہ کے بعد بھی بلا ضرورت ہرگز استعمال نہ کریں، طلبہ کی ضرورت میں یقیناً استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اِس لیے کہ وہ اِس کے اصلی حقدار ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

صدقۂ فطر اور زکوٰۃ کی ادائیگی عید کے بعد

مَیں یہاں نیوزی لینڈ کی مسجد جس کا نام ''مسجدِ عمر ماؤنٹ روسکل'' ہے، اُس میں پندرہ سال سے ٹرسٹی ہوں، اور ٹرسٹ کے اندر خزانچی کی ذمہ داری ادا کر رہا ہوں، اور الحمد للہ ہمیشہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اُس کو حاضر ناظر رکھ کر خدمت انجام دے رہا ہوں، اب چند سوال یہ ہیں:

سوال: مسلم آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا ایریہ (Area) ماؤنٹ روسکل ہے، اور کئی مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک کی آبادی یہاں پر ہے، اور ٹرسٹ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جمع کر کے عالمی پیمانے پر مختلف مسلم برادری کے ذریعہ ہر رمضان میں تقسیم کرتا ہے، شرعی اعتبار سے اِس میں کوئی تفصیل ہو تو مطلع فرمائیں؛ کیوں کہ صدقۃ الفطر نماز عید کے بعد مستحقین تک پہنچتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

''عمدۃ الفقہ'' میں ہے: لوگوں کے لیے مستحب یہ ہے کہ عید الفطر کے روز طلوع فجر کے بعد عیدگاہ کو جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کریں، اور یہ اِس لیے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے، اور آپ کے فعل کی پیروی ہو، اور اِس قول وفعل کو ''حاکم'' وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ عیدگاہ تشریف

لے جانے سے پہلے صدقۂ فطر نکالتے تھے، اور ہمیں حکم فرماتے تھے کہ ہم نمازِ عید سے پہلے صدقۂ فطر نکالیں، اور آں حضرت ﷺ مصلیٰ (عیدگاہ) کی طرف تشریف لے جانے سے پہلے اِس کو تقسیم فرماتے تھے، اور ارشاد فرماتے تھے کہ: غرباء کو اِس روز در بدر پھرنے سے بے نیاز کردو، اور صحیحین میں بھی اِس کی اصل موجود ہے، اور یہ غنی کر دینے کا حکم استحباب کے لیے ہے یعنی اَولیٰ ہے۔ (عمدۃ الفقہ ۳/ ۱۶۷،۱۶۸)

عبارتِ بالا سے معلوم ہوا کہ بہتر یہ ہے کہ صدقۂ فطر کی رقم عیدگاہ جانے سے پہلے فقراء کے ہاتھوں میں پہنچادی جائے؛ لیکن اگر ایسا نہ ہوا؛ بلکہ عید کے بعد وہ رقم مستحقین تک پہنچی تو بھی صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صدقۂ فطر اور زکوٰۃ تقسیم سے پہلے ہلاک ہو جائیں تو ضمان ہے یا نہیں؟

سوال: کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے اُس رقم کو محفوظ مقامات تک نہ پہنچایا جائے، مثلاً: اتوار ہے، بینک بند ہے، اور وہ رقم گھر میں محفوظ جگہ پر ہے، اُس میں اگر چوری ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ بڑے افسوس کے ساتھ مَیں آپ کو بتاؤں کہ پندرہ سال میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا، کہ زکوٰۃ اور فطرہ اور للہ رقم تقریباً ۱۲ یا ۱۴ ہزار ڈالر تھے، اتفاقاً عید اتوار کو تھی اور مَیں اُس کو بینک میں جمع نہیں کرسکا، اور گھر سے ہم لوگ غائب تھے، میری ساس کے مکان پر ملاقات کے لیے گئے ہوئے تھے، اِتنے وقفہ میں (۴۵ منٹ کے وقفہ) چور آئے اور دروازہ توڑ کر اُس روز کا ڈونیشن (زکوٰۃ، فطرہ، للہ) لے گئے، تو جن لوگوں نے زکوٰۃ دی تھی اُن کا فریضہ ساقط ہوا یا نہیں؟ جن لوگوں نے فطرہ دیا اُن کو فطرہ کا ثواب ملا یا نہیں؟ اُن کا ذمہ ساقط ہوا یا نہیں؟ یا اگر ہم ٹرسٹ مل کر اندازاً اِتنی رقم نکال دیں تو ذمہ ساقط ہو جائے گا؟ یاد رہے کہ ابھی تک مَیں اُس کو گِن نہیں پایا تھا، عید کی نماز کے بعد ۱۱ ربجے

کے قریب مَیں گھر پہنچا، اور یہ واردات پونے ایک سے ڈیڑھ بجے تک میں ہوئی، کیا مجھ پر اِس کی کسی طرح کی ذمہ داری ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ اِس کا شرعی حل فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ ٹرسٹی حضرات لوگوں کے پاس سے جو رقم زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور للہ کے نام سے وصول کر کے اُن رقوم کو حسبِ صواب دید مختلف مصارف پر خرچ کرتے ہیں، اور یہ سلسلہ سالہا سال سے اِسی طرح جاری ہے، عید الفطر کے موقعہ پر لوگ آپ ٹرسٹیان کو اِس نوع کی رقمیں سپرد کرتے ہیں، آپ ٹرسٹیان کی حیثیت اُن رقوم میں وکیل کی ہے، گویا آپ حضرات مالکانِ اموال کی طرف سے اُن کی زکوٰۃ یا صدقۂ فطر یا عطیات کی رقوم کو اُن کے مصارف تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں، آدمی کسی کام کے لیے وکیل بنایا جائے اُس کی انجام دہی کے لیے جو مال اُس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ مال وکیل کے قبضہ میں امانت کی حیثیت رکھتا ہے، اور شرعاً امانت کا حکم یہ ہے کہ: وکیل نے یا جس کے پاس امانت ہے اُس نے اُس کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی؛ بلکہ عام طور پر جس طرح اُس کی حفاظت کی جاتی ہے اور آدمی اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے، اِسی طرح اُس نے اُس کی حفاظت کی، اِس درمیان وہ مال ضائع ہو گیا، مثلاً: چوری ہو گیا یا آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا، تو وہ شخص اُس مال کا ضامن نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں عید کی نماز کے وقت زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور للہ کے نام سے جو رقمیں آپ حضرات نے لوگوں سے وصول کیں، اُن میں آپ کی حیثیت وکیل ہونے کی وجہ سے امانت دار کی ہے، اب اُس روز اتوار ہونے کی وجہ سے آپ وہ رقم بینک میں جمع نہ کرا سکے، اور جب تک بینک کھلے وہاں تک کے لیے اپنے گھر میں حفاظت سے رکھا جس

طرح اپنے مال کو رکھا جاتا ہے، اور تھوڑے سے وقت کے لیے اپنے سسرال میں ملاقات کے لیے گئے، اِس درمیان چوروں نے آکر اُن رقوم پر ہاتھ صاف کرلیا، تو اِس میں آپ پر کوئی ضمان نہیں، اور آپ گنہ گار بھی نہیں؛ البتہ زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی وہ رقمیں مستحقین تک نہیں پہنچیں؛ اِس لیے دینے والوں کی زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ادا نہیں ہوا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی زکوٰۃ کا حساب کرکے زکوٰۃ کی واجب شدہ مقدار الگ کرکے اپنے گھر میں رکھے اور چوری ہوجائے، یا جیب میں لے کر مستحقین کو دینے کے لیے جارہا تھا اور جیب کٹ جائے؛ بہرحال زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ادا نہ ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زکوٰۃ اور صدقۂ فطر دوبارہ نکال کر مستحقین تک پہنچائیں، آپ اِس کا اعلان کردیں اور اوپر جو مسئلہ بتلایا گیا اُس سے لوگوں کو واقف کردیں، آپ کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، اِس کے بعد بھی خدانہ کرے کوئی شخص آپ پر خیانت کا الزام عائد کرے تو صبر اور تحمل سے کام لیں، اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔

(٧٦٨) الأمانة غير مضمونة، يعني على تقدير هلاكها أو ضياعها بدون صنع الأمين وتقصيره، ولايلزم الضمان...... يعني إذا هلكت الأمانة أو فقدت أو طرأ نقصان على قيمتها في يد الأمين بدون صنعه وتعديه وتقصيره في الحفظ لايلزم الضمان على الأمين المذكور، سواء أهلكت بسبب ممكن التحرز منه كالسرقة، أم بسبب غير ممكن التحرزمنه كالحريق الغالب، وسواء أهلك مال الأمين مع الأمانة المذكورة أم لم يهلك، وسواء أشرط الضمان أم لم يشرط. راجع شرح المادة ٨٣ (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ٢٠٢/٢)

الوكالة المال الذي قبضه الوكيل والرسول من جهة الوكالة ومن

جهة الرسالة أمانة في يدهما. راجع المادة (١٤٦٣) (أيضا ٤/٢٠٣) المادة ١٤٦٣

(المال الذى قبضه الوكيل بالبيع والشراء وإيفاء الدين واستيفائه وقبض العين من جهة الوكالة في حكم الوديعة في يده، فإذا تلف بلا تعد ولاتقصير لا يلزم الضمان، والمال الذي في يد الرسول من جهة الرسالة أيضا في حكم الوديعة) (ايضا ٣/ ٥٨٢) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۴/شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ

زکوٰۃ کی رقم نفع بخش کاروبار میں مشغول کر کے غرباء وغیرہ پر منافع کی تقسیم

سوال: شہر حیدرآباد میں اور ملک کے دیگر مقامات پر بھی مال دار اور متموِّل اصحاب کی جانب سے زکوٰۃ کے ٹرسٹ قائم ہیں، بعض ٹرسٹ خاندان کے نام سے ہیں اور بعض ٹرسٹ عام نوعیت کے نام پر ہیں، ہر سال اِن ٹرسٹ میں متعلقہ اصحاب اور اُن کے قریبی رشتہ داروں اور دوست احباب کی رقم جمع ہوتی ہے، اور یہ رقم کسی آمدنی پیدا کرنے والے ذریعہ میں مشغول کی جاتی ہے، یا کسی معتبر بینک کے کھاتے میں اور خصوصاً میچوئل (Mutual) فنڈس میں یا حکومتِ ہند کے یونٹ ٹرسٹ میں مشغول کی جاتی ہے، اِن اصحاب کی نیتوں پر شک وشبہ نہیں ہے، نیت تو اِن کی یہ ہے کہ اِس سے زیادہ عرصہ تک ضرورت مندوں کو فائدہ پہنچتا رہے، متموِّل تجار وصنعت کاروں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ پیسے سے پیسہ پیدا کیا جائے، اور بغیر کسی آمد کے پیسہ دینا یا پیسہ لگانا وہ پیسہ کو ضائع کرنا سمجھتے ہیں، اِس لحاظ سے اُن کی نیت یہ ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کے پیسے کو مشغول کر کے اُس آمدنی سے زیادہ سے زیادہ افراد اور اداروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اِس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ کیا زکوٰۃ کی رقم نفع بخش کاروبار، تجارت، میچوئل فنڈس یا یونٹس میں مشغول کی جاسکتی ہے؟ چوں کہ زکوٰۃ کی رقم جس وقت نکالی گئی اُس کے ایک سال کے اندر صَرف ہو نہیں پاتی؛ بلکہ مشغول رہتی ہے، یہ سوال پیدا ہوگا کہ جن لوگوں نے یہ رقومات ٹرسٹ میں دی ہیں کیا اُن کی زکوٰۃ ادا ہوگئی؟

یہ سوالات ایک دینی مدرسہ کے استاذ سے پوچھے گئے تھے، اُنھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ایک واقعہ کی طرف نشان دَہی کی، جس میں وہ صاحب جن کو کسی بیت المال سے کچھ رقم لانے کے لیے کہا گیا تھا، اُنھوں نے راستہ میں رقم مشغول کر کے نفع کمایا اور مدینہ پہنچنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اِس کا تذکرہ کیا، اور اِس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی اعتراض نہیں فرمایا، جب استاذ موصوف سے پوچھا گیا کہ: کیا یہ رقم زکوٰۃ کی تھی؟ کیوں کہ بیت المال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی دوسرے کئی مدات کی رقم جمع ہوا کرتی تھی، اُنھوں نے جواب دیا کہ: اِس بات کی صراحت روایت میں نہیں ملتی، اُنھوں نے مزید کہا: کہ کسی دینی مدرسہ کے دارالافتاء سے صحیح اور دوٹوک جواب ملنا مشکل ہے؛ کیوں کہ ہر مدرسہ کو ایسے ٹرسٹس سے امداد جاری ہے؛ تاہم میرا یقین ہے کہ علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اِن مسائل میں کسی مصلحت کو پیشِ نظر نہیں رکھیں گے، اور شرع شریف کے مطابق صحیح جو بات ہے اُس کو بیان کریں گے؛ لہٰذا حاملینِ دینِ متین اور مفتیانِ شرعِ مبین سے گزارش ہے کہ وہ درجِ ذیل دو سوالات کا جواب نصوص کی روشنی میں عطا فرمائیں۔

(۱) کیا زکوٰۃ کی رقم کو زکوۃ کے مُدات پر خرچ کرنے کے بجائے اُن کو نفع بخش انداز میں مشغول کرنا، اور اِس طرح زکوۃ کی رقم کو محفوظ رکھنا، اور اِس سے حاصل ہونے والے نفع کو زکوٰۃ کی مدات پر لگانا جائز ہے؟

(۲) کیا اُس شخص کی زکوۃ شرعاً ادا ہوجائے گی جس نے اپنی زکوۃ کی رقم اُن اصحاب اور اداروں کے حوالہ کی ہے جو زکوۃ کی رقومات کو محفوظ اور مشغول رکھ کر صرف اُس کے نفع کو خرچ کرتے ہیں؟

بخدمتِ گرامی جناب مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ آیتِ کریمہ:﴿إنما الصدقٰت للفقراء﴾ الآیة کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: جمہور فقہاء اِس بات پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ اِن مصارف میں سے کسی مستحق کو مالِ زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیے اگر کوئی مال اُن ہی لوگوں کے فائدے کے لیے خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اِسی وجہ سے ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہائے امت اِس پر متفق ہیں کہ رقم زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا اُن کی دوسری ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں؛ اگرچہ اِن تمام چیزوں سے فائدہ فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرفِ زکوۃ ہیں؛ مگر اُن کا مالکانہ قبضہ اِن چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اِس سے ادا نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن ۴/ ۴۰۹)

آپ نے اپنے سوال میں جن صورتوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں زکوۃ کی رقم کو نفع بخش کاروبار، تجارت، میچوئل فنڈ یونٹس میں مشغول کر کے اُن سے آمدنی حاصل کی جاتی ہے، اور حاصل شدہ اِس آمدنی کو غرباء، مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے، تو ایسا کرنے سے اصحابِ اموال کی زکوۃ ادا نہ ہوگی؛ اِس لیے کہ مالِ زکوٰۃ کو کاروبار یا میچوئل فنڈس وغیرہ میں لگانے سے تملیک – جو زکوۃ کی ادائیگی کی بنیادی شرط ہے – نہیں پائی جاتی، اور مستحقینِ

زکوۃ کو مالِ زکوۃ کا مالک بنائے بغیر دوسرے طریقوں سے فائدہ پہنچانے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، جیسا کہ شروع جواب میں ''معارف القرآن'' کی عبارت سے واضح ہو چکا ہے، ''فتاویٰ رحیمیہ'' سے اِسی نوع کا ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

سوال: زید کے پاس زکوۃ کی بڑی رقم جمع ہے، اُس کو یکبارگی حق دار کو نہ دیتے ہوئے اِس رقم سے کوئی پراپرٹی یا زمین خرید کر اُس کی آمدنی میں سے مستحقین، مدارس اور دینی دنیوی طلباء جو اِس کے مستحق ہوں، اُن کو وظیفہ دینا چاہتا ہے؛ تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے آمدنی کا سامان کر کے آمدنی میں سے مستحقین پر خرچ کر سکتا ہے؟

الجواب: ادائیگیٔ زکوۃ کے لیے تملیک یعنی مستحقین کو بلاعوض مالک بنا دینا شرط ہے، اگر آمدنی کے لیے پراپرٹی قائم کی گئی یا کوئی زمین خریدی گئی تو یہ شرط پوری نہیں ہوئی؛ لہذا زکوۃ ادا نہ ہوگی؛ لہذا زکوۃ کی رقم سے آمدنی کی جائداد فراہم کرنا جائز نہیں ہے، حق دار کو بلاعوض مالک بنا دینا ضروری ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/۸)

اِس مسئلہ کی مزید وضاحت ہو جائے؛ اِس لیے ''فتاوی رحیمیہ'' سے ایک اور سوال و جواب بھی نقل کیا جاتا ہے:

سوال: ہمارے یہاں ایک کمیٹی ہے، کمیٹی کے اراکین زکوۃ کی رقم چندہ میں جمع شدہ رقم میں سے غرباء کو غیر سودی قرض دیتے ہیں؛ تاکہ وہ اپنے گزران کے لیے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکیں، اور قرض دینے کا مقصد ہوتا ہے کہ اِن کو قرض ادا کرنے کی فکر رہے گی تو محنت اور توجہ سے کام کریں گے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ کمیٹی کا یہ طریقۂ کار صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، قابلِ ترک ہے، زکوۃ کی رقم جمع کر کے اُس میں سے قرض دینا جائز نہیں ہے، جن لوگوں کی رقمیں ہیں اُن کی زکوۃ ادا نہ ہوگی، اور کمیٹی کے

ممبر اِس کے ذمہ دار ہوں گے، زکوۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ زکوۃ کی رقم مستحقِ زکوۃ کو بلاعوض مالک بنا کر دے دی جائے۔ ''درمختار'' میں ہے:

(هي تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكوة لايجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه. (در مختار مع الشامي ٢/٣)

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرض دینے کی صورت میں تملیک پائی نہیں جاتی، کمیٹی والے بھی اِس نیت سے دیتے ہیں کہ بعد میں اِس سے یہ رقم وصول کرنا ہے؛ لہذا یہ طریقہ واجب الترک ہے۔ اور یہ بات بھی خیال میں رہے کہ زکوۃ کی رقم مستحقینِ زکوۃ میں جلد از جلد تقسیم کر دی جائے؛ تا کہ لوگوں کی زکوۃ ادا ہو جائے، قرض دینے کے لیے دوسری رقم کا انتظام کیا جائے۔ (فتاوی رحیمیہ ۷/۳۶۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مستحق کو رقم دینے کے بعد زکوۃ کی نیت کب تک معتبر ہے؟

سوال: مَیں سرکاری ملازم ہوں، سرکار کی طرف سے وطن آنے جانے کا کرایہ ملتا ہے، مَیں نے بھی کرایہ لیا، صرف ٹکٹ دِکھانا پڑتا ہے، ایک مرتبہ ٹکٹ منسوخ کر کے اُس کا جو روپیہ بنتا ہے وہ لے لیا، اور ہمارے محکمہ کو دِکھایا کہ مَیں اِسی ٹرین سے وطن سے آیا؛ پھر کچھ عرصہ بعد مجھے گناہ کا احساس ہوا اور جتنے روپیے میرے وہ ٹکٹ کی قیمت سے بنتے ہیں، وہ مَیں نے ایک غریب مستحق کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دیے؛ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ وہ روپیے تو سرکاری محکمہ میں جانا چاہیے اور مَیں نے غریب کو دے دیا، پھر مَیں نے سوچا کہ اب اگلی بار جب وطن جانا نصیب ہو، تو ٹکٹ کے لیے سرکار سے روپیے لینے کے بجائے مَیں دوں گا اور اپنے خرچ پر وطن جاؤں گا، اور جو روپیے بغیر ثواب کی نیت کے

غریب کو دیے تھے اُس میں زکوۃ کی نیت کروں، تو کیا یہ درست ہے؟ زکوۃ ادا ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ زکوۃ دیتے وقت متصل ہی زکوۃ دینے کی نیت کرے، یا جو کچھ زکوۃ اُس کے ذمہ واجب ہے اُس کو اپنے مال سے نکال کر علاحدہ کرتے وقت متصل ہی زکوۃ دینے کی نیت کرے، ادا کرتے وقت یا علاحدہ کرتے وقت نیت کا متصل ہونا خواہ حکمی ہو تب بھی ادا ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر زکوۃ کسی فقیر کو بغیر نیت کے دے دی، پھر اُس مال کو زکوۃ میں دینے کی نیت کر لی، تو اگر جس وقت زکوۃ کی نیت کی جا رہی ہے اُس وقت تک وہ مال فقیر کے قبضہ میں موجود ہے یعنی ابھی اُس نے اُس کو خرچ نہیں کیا تو یہ زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور اگر فقیر اُس کو خرچ کر چکا ہے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ (عمدۃ الفقہ ۲/ ۴۹، ۵۰ ملخصاً)

لہذا آپ جس غریب مستحق کو ایک مدت پہلے وہ رقم دے چکے ہیں، اور جس وقت رقم دی گئی تھی اُس وقت آپ نے ادائے زکوۃ کی نیت نہیں کی تھی، اور اب اُس پر ایک مدت گزرنے کے بعد آپ اُس رقم کو ادائے زکوۃ میں دینے کی نیت کر رہے ہیں، تو اگر وہ رقم بعینہٖ ہُو بہُو اُس غریب کے پاس موجود ہے، اور ابھی تک اُس نے اُس کو خرچ نہیں کیا ہے تب تو آپ کی یہ نیت درست ہو کر آپ کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؛ ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

بطور قرض تجارت کا سامان لے کر بیچ دیا تو اُس کی زکوۃ کس دام سے ادا کرے؟

سوال: ہم نے رمضان سے قبل سو کوینٹل سرسوں بطورِ قرض دوسری پارٹی کے پاس سے لیا تھا، اور یہ کہہ دیا تھا کہ: ہم اِس سرسوں کو فروخت کر دیں گے، اور آپ کو جس وقت ضرورت ہوگی ہم ایسا ہی مال آپ کو دیں گے، وہ مال ہم نے ایک کوینٹل سات سو روپیے کے حساب سے بیچ دیا تھا، اور اِس وقت اُس کا دام چھ سو روپیے چل رہا ہے، اور جس

وقت اُس پارٹی کو دینا ہوگا اُس وقت نہ جانے کیا دام ہوگا؟ اور اُس پارٹی کو دینے کے لیے ہم نے سرسوں کا تیل خریدا نہیں ہے؛ لہٰذا یہ ہم پر جو قرض ہوا وہ جس دام سے ہم نے بیچا ہے اُس دام سے شمار کیا جائے گا، یا آج یعنی یکم شوال کو جو دام ہے اُس سے شمار کیا جائے گا؟ یا جس وقت خرید کر اُس پارٹی کو دیں گے اُس وقت کا دام شمار کیا جائے گا؟ اِس کی زکوۃ کس طرح ادا ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرض میں مستقرض کے ذمہ وہی چیز واجب سمجھی جاتی ہے جو اُس نے بطورِ قرض لی ہے، فقہ کا قاعدہ ہے: "الأقراض تقضى بأمثالها"؛ اِس لیے آپ پر سرسوں ہی واجب الادا ہیں، آپ جب زکوۃ ادا کریں اُس وقت ایک سو کوئنٹل سرسوں کا جو بھاؤ بازار میں ہو اُتنی رقم وضع کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوۃ ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سادات کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں

سوال: مَیں نسبی طور پر سید ہوں، ایک گاؤں کی مسجد میں اذان وغیرہ کی خدمت انجام دیتا ہوں، میرے اہل وعیال زیادہ ہونے کی وجہ سے موجودہ آمدنی سے گھر کا خرچ نہیں چل پاتا جس کی بناء پر مَیں بہت پریشان ہوں، تو کیا ایسی صورت میں مَیں زکوۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ لے سکتا ہوں یا نہیں؟ اِسی طرح مسجد کی روٹی لے سکتا ہوں یا نہیں؟ اِسی طرح مجھے اپنا گھر بنانے کے لیے رقم کی ضرورت تھی تو مَیں نے چند حضرات کو خط لکھا، تو اُن لوگوں نے کچھ رقم میرے لیے بھیجی، تو کیا مَیں اُس رقم کا حیلہ کر کے اپنے گھر میں استعمال کر سکتا ہوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سادات کے لیے زکوۃ جائز نہیں ہے، اِسی طرح صدقاتِ واجبہ بھی جائز نہیں ہیں۔

ولا إلى بني هاشم -إلى أن قال- وجازت التطوعات من الصدقات.

(درمختار) (قوله: جازت التطوعات إلخ) قيد بها ليخرج بقية الواجبات. (شامي ۲/ ۷۲،۷۳)

صدقاتِ نافلہ جائز ہیں، مسجد کی روٹی اگر صدقاتِ نافلہ کے قبیل سے ہے تو لے سکتے ہیں، صدقۂ فطر چوں کہ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے؛ اِس لیے زکوۃ کی طرح اِس کا بھی لینا جائز نہیں ہے، اگر کوئی سید عیال دار اور محتاج ہے تو لوگوں پر خصوصاً صاحبِ حیثیت اور اہلِ خیر حضرات کو لازم ہے کہ، وہ حضرات للہ رقوم سے سادات کی امداد کریں، اور اِن کو مصیبت و تکلیف سے نجات دلائیں، کہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے، اور حضور ﷺ کے ساتھ صحیح محبت کی دلیل ہے؛ ورنہ مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ)

اگر حیلہ کر کے سید کو زکوۃ دی جائے تو مضائقہ نہیں، حیلہ کی صورت یہ ہے کہ کسی غیر سید غریب کو یہ کہہ کر دے دیا جائے کہ: فلاں سید کو دینا تھا؛ مگر وہ سید ہے، اُس کے لیے زکوۃ جائز نہیں؛ لہذا تم کو دیتے ہیں، اگر تم یہ کل یا بعض اُس کو اپنی طرف سے دے دو تو بہتر ہے، اور وہ لے کر دے دے تو سید کے لیے جائز ہے۔ (کفایت المفتی ۴/۲۷۲)

اگر آپ کی بیوی سادات میں سے نہیں ہے تو مناسب صورت یہ ہے کہ لوگ اُس کو زکوۃ دے دیں، پھر وہ خود آپ کے گھریلو مصارف میں استعمال کرے یا آپ کو مالک بنادے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوۃ کی رقم سے بیوہ عورت کی لڑکیوں کا نکاح کرنا

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادی کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور اِس صورت میں زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مالک یا اُس کا وکیل زکوۃ کی رقم براہِ راست شادی کرانے میں استعمال نہیں

کرسکتے، اگر کریں گے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی؛ البتہ بیوہ عورت اگر مستحقِ زکوۃ ہے تو اُس کو مالک بنادے، اِس کے بعد وہ عورت اپنی لڑکی کے نکاح یا دوسرے کام میں اپنی مرضی سے خرچ کرسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حکومت کی طرف سے بچوں کو دی جانے والی امداد پر زکوۃ

سوال: اِس ملک میں حکومت کی طرف سے قانون ہے کہ: ہر بچہ کی پیدائش سے لے کر اٹھارہ سال تک حکومت کی طرف سے سالانہ ۴۰۰/ چار سو ڈالر کے حساب سے امداد کی جاتی ہے، اور یہ ساری رقم اٹھارہ سال پورے ہونے کے بعد اِس بچہ ہی کو دی جاتی ہے نہ کہ اُس کے والدین کو، اور بالفرض والتقدیر اگر یہ بچہ اٹھارہ سال پورے ہونے سے پہلے ہی وفات پاجائے، تو یہ ساری رقم اُس کے والدین کو نہیں دی جاتی؛ بلکہ حکومت غرباء، مساکین کے درمیان تقسیم کردیتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ: اِس رقم کا مالک بچہ ہوگا یا نہیں؟ نیز اٹھارہ سال پورے ہونے کے بعد یہ رقم بچہ کو دے دی گئی تو اِس رقم میں زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو والدین پر ہوگی یا بچہ پر؟ اگر بچہ پر ہوگی تو مکمل اٹھارہ سال کی واجب ہوگی یا پھر بعد البلوغ والے سالوں کی؟

اِس آخری مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ: حکومت کا ایک پلان ہے کہ بچے کے نام سے ہر ماہ ۵۰/ ڈالر جمع کروائیں، (پیدائش سے لے کر ۱۸/ سال کی عمر ہونے تک) اب اٹھارہ سال ہونے پر بچے کو مثلاً ستر ہزار ڈالر ملے گا، جو خاصۃً بچوں کی کالج یا یونیورسٹی کی پڑھائی کے خرچ میں کام آئیں گے، اُن ڈالر پے زکوۃ کا کیا مسئلہ رہے گا؟ زکوۃ کیسے ادا کریں گے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی طرف سے سالانہ چار سو ڈالر کے حساب سے جو امداد بچہ کو اٹھارہ

سال پورے ہونے کے بعد دی جاتی ہے، تو چوں کہ یہ رقم حکومت کی طرف سے ایک قسم کی امداد ہے؛ اِس لیے جب تک بچہ کے ہاتھ میں وہ نہیں آئے گی وہاں تک وہ اُس کا مالک نہیں کہلائے گا، اور چوں کہ اٹھارہ سال پورے ہونے پر یہ رقم اُس کو دی جاتی ہے؛ اِس لیے جس وقت یہ رقم اُس کو دی جائے گی، اُس وقت وہ اُس کا مالک ہوکر صاحب نصاب بھی کہلائے گا، اب رقم ملنے پر ایک سال پورا ہونے پر اُس رقم پر زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی؛ البتہ اگر اُس کی ملک میں پہلے سے بقدرِ نصاب مال موجود ہے تو اِس صورت میں اُس نصاب پر جب سال پورا ہوگا، اِس رقم کی زکوۃ بھی اُسی کے ساتھ لازم ہوگی۔

نوٹ: اِس سوال کے آخری پیراگراف میں مسئلہ کی جو صورت آپ نے تحریر فرمائی ہے، وہ سمجھ میں نہیں آئی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۹/صفر المظفر ۱۴۲۵ھ

مکان بنانے کے لیے زکوۃ کی رقم دینا کیسا ہے؟

سوال: ایک شخص (زید) اپنی بیوی اور چند نابالغ بچوں کو چھوڑ کر تقریباً دس سال سے غائب ہے، تمام رشتہ داروں، متعلقین اور دیگر ذرائع کے ذریعہ تلاش کیا؛ لیکن کہیں پتہ نہ چل سکا، اور اب امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی، زید کی بیوی گھریلو کام کاج کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی ہے، میکے والوں کی بھی اِتنی حیثیت نہیں کہ مالی تعاون کر سکے، گاؤں کے اہلِ خیر حضرات زکوۃ، فطرہ سے امداد کرتے ہیں، عورت نے اُسی رقم سے تھوڑا تھوڑا جمع کر کے ۲۵/ ہزار کی رقم جمع کی، اور ایک شخص کے کاروبار میں لگائی؛ البتہ اِس سے بھی جو منافع آتے ہیں وہ اِخراجات کے لیے ناکافی ہوتے ہیں، اور اِس عورت کے پاس

ذاتی مکان بھی نہیں ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: اُس عورت کو زکوۃ، فطرہ کے ذریعہ امداد کرنا اور مکان بنا کر دینا کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چوں کہ وہ عورت مالِ تجارت کی مالک ہے جس کی مقدار نصاب جتنی ہے؛ اِس لیے زکوۃ، فطرہ اُس کو دینا درست نہیں ہے؛ البتہ اُس کی اولاد میں جو بالغ ہو اُس کو زکوۃ، فطرہ کی رقم دی جاسکتی ہے، اگر اُس کو مکان کی ضرورت ہے تو مکان بنانے کے لیے اُس کو بطورِ قرض رقم دی جائے، اور بعد میں اُس قرض کی ادائیگی کے لیے زکوۃ یا فطرہ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شوہر مقروض ہو تو بھی بیوی کی ملکیت کے زیورات پر زکوۃ آئے گی

سوال: سید بشیر کے اوپر تقریباً دو لاکھ روپیہ کا قرض ہے، جب کہ اُس کی بیوی کے پاس ساڑھے آٹھ تولہ سونے کے زیورات ہیں، زیورات کی مالک بیوی ہی ہے، تو کیا شوہر کے مقروض ہونے کی وجہ سے اِن زیورات پر زکوۃ آئے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چوں کہ ساڑھے آٹھ تولہ سونے کے زیورات کی مالک بیوی ہے، اور اُس پر کوئی قرضہ بھی نہیں ہے؛ اِس لیے اُس پر اِن زیورات کی زکوۃ فرض ہے، اگر اُس کے پاس زکوۃ کی ادائیگی کے لیے کوئی رقم موجود نہ ہو تو اِس زیور کا چالیسواں حصہ نکال کر بطورِ زکوۃ غرباء میں تقسیم کردے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سونے چاندی کے زیورات کو نقد رقم کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا

سوال: ایک شخص کے پاس پونے سات تولہ سونا اور تیس ہزار روپے نقد ہیں،

صرف پانچ تولہ سونے پر سال مکمل ہوا ہے، جو بھی رقم موجود ہے اُس میں سے گھر کی ضروریات میں استعمال کیا جاتا ہے، جس کا سالانہ اندازہ آٹھ دس ہزار روپیے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: کیا سونے کے اندر زیورات کو نقد رقم میں ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا یا نہیں؟ جب کہ وہ نقدی گھر کی ضروریات میں استعمال ہوتی رہتی ہے؛ البتہ سال ختم ہونے پر اِتنی رقم باقی رہ جاتی ہے کہ ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت بن سکتی ہے، درمیانی سال میں اِس رقم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

پونے سات تولہ سونے کے ساتھ نقد رقم ملا کر نصاب مکمل کر لیا جائے گا، اور سال کے ختم پر سونے کے ساتھ جتنی رقم باقی ہوگی دونوں پر زکوۃ واجب ہوگی، درمیانی سال ہونے والے اضافہ یا کمی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اپنا قرض وصول کرنے کی شرط کے ساتھ زکوۃ دینا

سوال: میں ایک آدمی کا مقروض ہوں، ایک بڑی رقم اُس کی مجھ پر بطورِ قرض واجب الادا ہے، قرض خواہ مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ: مَیں تجھے اپنی زکوۃ کی رقم اِس شرط پر دینے کے لیے تیار ہوں کہ تم اِس رقم سے میرا قرض ادا کردو، اِس وقت میری حیثیت اُس کا قرض ادا کرنے کی بالکل نہیں ہے، میرے پاس کوئی رقم یا جائداد قرض کی ادائیگی کے لیے نہیں، تو سوال یہ ہے کہ: مَیں اپنے اُس قرض خواہ کے پاس سے زکوۃ اِس شرط پر لے سکتا ہوں کہ بعد میں وہ رقم اُنہیں کو اُن کے قرض کی ادائیگی میں لوٹا دوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرض خواہ کے لیے اِس طرح کی شرط لگانا مناسب نہیں، اِس کو اِس طرح کی

شرط لگائے بغیر بھی شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ، اپنی زکوۃ کی رقم بنیتِ ادائے زکوۃ آپ کو دے کر آپ سے جبراً وصول کر لے، پھر بھی اگر ایسی شرط کر کے زکوۃ کی رقم آپ کو دی اور اِس سے آپ نے اُس کا قرض ادا کیا، تو یہ بھی درست ہے، اِس طرح اُس کی زکوۃ ادا ہو جائے گی اور آپ کا قرضہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاٗہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　۲۱/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

زکوۃ کی رقم ضائع ہونے پر ضمان نہیں

سوال: ہمارے شہر میں غریب فنڈ کے نام سے ایک سوسائٹی ہے، اِس میں لوگ اپنی زکوۃ کی رقم جمع کرواتے ہیں، پھر ذمہ دارانِ فنڈ بتدریج غرباء اور مستحقین پر صَرف کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ زکوۃ کا روپیہ فنڈ میں داخل کرتے ہی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا غرباء اور مستحقین پر تقسیم کرنے کے بعد ادا ہوگی؟ اگر ثانی صورت ہے تو قبل التقسیم خدانہ خواستہ کسی آفت یا چوری وغیرہ سے نقصان ہو گیا تو زکوۃ نکالنے والے کے ذمہ سے زکوۃ ساقط ہوگی یا ذمہ دارانِ فنڈ پر ضمان آئے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فقراء و مساکین میں تقسیم ہونے کے بعد ہی زکوٰۃ ادا ہوگی؛ اِس لیے چوری ہو جانے یا آفت کا شکار ہو جانے کی صورت میں معطیین کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اگر سوسائٹی کے ذمہ داران نے حفاظت میں غفلت نہیں برتی تو اُن پر ضمان بھی نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۲۸۹، فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۴۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سوال: دوسری صورت یہ ہے کہ، ذمہ دارانِ فنڈ کسی دوسرے معتمد شخص کو تقسیمِ

زکوۃ کے لیے وکیل بنائیں، اور یہ وکیل اپنی ذمہ داری پوری کوشش اور حفاظت کے ساتھ پوری کر رہا ہے، اِس کے باوجود خدانخواستہ کسی آفت یا چوری وغیرہ سے رقم ضائع ہوجائے تو اِس پر ضمان آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں وہ ضامن نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوۃ کی رقم کو تعمیری کام میں براہِ راست استعمال کرنا درست نہیں ہے

سوال: مہاراشٹر اسٹیٹ میں ''بُدنیرہ'' ایک مقام ہے، جس کی مسلم آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے، یہاں دینی تعلیم کا معقول نظم نہ ہونے کی وجہ سے آبادی کا اکثر حصہ دین سے ناواقف ہے؛ لہذا بڑی جدوجہد سے ایک انتظامیہ کمیٹی تشکیل پائی، جس کے تحت ایک مکتب کا قیام عمل میں آیا، مکتب میں تقریباً سو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، مکتب کے لیے ایک بہت پرانی عمارت تھی جو پہلے سے مکتب کے لیے وقف کی گئی تھی، جو نہایت شکستہ حالت میں تھی، انتظامیہ نے باہمی چندہ کر کے عمارت کی مَرمَّت کی؛ لیکن سرمایہ کی کمی کی وجہ سے فرش کی تکمیل نہ ہوسکی، معلمین کی تنخواہ کا نظم بھی چندہ ہی سے ہوتا ہے، مکتب میں پندرہ فیصد طلبہ غرباء کے ہیں، انتظامیہ کے پاس صدقات کی رقم جمع ہے جس سے غریب طلبہ کی مدد کی جارہی ہے، انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ صدقات کی رقم سے مکتب کا فرش پختہ کر دیا جائے تو کیا یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ کی رقم کو تعمیری کام میں براہِ راست استعمال کرنا درست نہیں ہے؛ اِس لیے کہ اِس میں تملیک ضروری ہے، آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ جن غرباء کے بچے اِس میں تعلیم

حاصل کررہے ہیں اُن میں سے چند دین دار حضرات کو یہ کہہ کر زکوۃ کی رقم دیں کہ: یہ رقم زکوٰۃ کی ہے، ہم آپ کو اِس کا مالک بناتے ہیں، آپ اِس رقم کو اپنی ملک میں لینے کے بعد مدرسہ کی تعمیری ضروریات کے لیے ہمیں اپنی مرضی سے عطا فرمائیں، اب اگر وہ اِس طرح اپنی ملک میں لینے کے بعد اپنی رَضامندی واختیار سے اِس کام کے لیے دیں تو اِس کا استعمال درست ہے؛ لیکن اِس معاملہ میں اُن پر جبر نہیں ہوسکتا، اگر وہ حضرات اپنی ملک میں لانے کے بعد اپنی دیگر ضروریات میں استعمال کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خرید وفروخت میں جو رقم ابھی تک وصول نہیں ہوئی اُس کی زکوۃ کب ادا کرے؟

سوال: ایک آدمی نے ایک زمین بیچی، جس آدمی کو زمین دی وہ قسط وار اُس کی قیمت ادا کرتا ہے، جس آدمی نے زمین بیچی ہے اُس نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے زکوۃ ادا کرنے کے لیے، (صاحبِ نصاب آدمی ہے)، اب جب وہ دن آیا تو اُس کی زمین کی کل قیمت کی وصولیابی نہیں ہوئی تھی، جب زکوۃ ادا کرے گا تو صرف اُتنے حصے کی ادا کرے گا جو وصول ہوچکا، یا ابھی جو رقم آنی باقی ہے اُس کی بھی زکوۃ ادا کرے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو رقم ابھی تک وصول نہیں ہوئی ہے اُس کی زکوۃ کی ادائیگی اِس وقت واجب نہیں ہے؛ بلکہ جب وہ وصول ہوگی اُس وقت گزشتہ تمام مدت کی زکوۃ ادا کرے گا۔ (درمختار)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بعض رقم پر سال پورا ہوا ہے اور بعض پر نہیں، تو زکوۃ کس طرح نکالے؟

سوال: بھینسوں کے کاروبار میں سال بھر کا کل منافع ایک لاکھ ہوا ہے؛ مگر بعض رقم پر سال گزرا ہے اور بعض پر نہیں گزرا؛ کیوں کہ منافع ہر ماہ تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے تو زکوۃ کی

ادائیگی کس طرح ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

منافع کی مقدار نصاب تک پہنچنے سے سال کی ابتداء شمار ہوگی، اِس کے بعد اُس کی جنس کا جتنا اضافہ ہوا ہے اُس کو بھی اصل نصاب کے ساتھ ملا لیا جاوے گا، اور سال پورا ہونے پر سب مال (اصل نصاب اور بعد کا اضافہ) پر زکوۃ واجب ہوگی۔

والمستفاد ولو بهبة أو إرث وسط الحول يضم إلى نصاب من جنسه، فيزكيه بحول الأصل. (درمختار) (قوله: إلى نصاب) قيد به؛ لأنه لو كان النصاب ناقصا وكمل بالمستفاد فإن الحول ينعقد عليه عند الكمال. (شامي ۲/ ۲۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

وکیل کا صدقہ کی رقم کو اپنے استعمال میں لے آنا

سوال: اگر کسی صاحب نے یا گاؤں کے ذمہ داروں نے کچھ رقم جو للہ تھی امام صاحب کو دی، اور وکیل بنایا کہ جہاں ضرورت ہو آپ اِس رقم کو چندہ میں دیتے رہیں، اب امام صاحب خود مقروض ہیں، اور کوئی ذرائعِ آمدنی نہیں ہے، تو کیا وہ للہ رقم کو اپنی ضروریات میں لا سکتے ہیں؟ اور اگر امام صاحب گاؤں والوں کے سامنے ظاہر بھی کریں تو یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر امام صاحب کو صرف اِتنا کہا گیا ہے کہ: آپ یہ رقم مواقعِ ضرورت میں صَرف فرمائیں یا اُس کو اختیار دیا ہے، تو اِس صورت میں اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے؛ لیکن اگر چندہ میں دینے کا لفظ کہا گیا ہے تو اِس صورت میں اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتا؛ اِس لیے

کہ ہمارے عرف میں چندہ میں دینے کا مطلب اپنے اوپر خرچ کرنا نہیں ہے۔

وللوكيل بدفع الزكوة أن يدفعها إلى ولد نفسه كبيرا كان أو صغيرا وإلى امرأته. الخ (البحرالرائق ۲/ ۲۲۷)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سو روپیے پر کتنی زکوۃ ہوگی؟

سوال: اِس دور کے سو روپیے میں کتنے روپیے بطورِ زکوۃ واجب ہوں گے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے؛ اِس لیے سو روپیے پر ڈھائی روپیہ نکالے بشرطیکہ مقدارِ نصاب ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زِیرا، سونف اور رائی پر زکوۃ

سوال: اگر کسی کے پاس اپنے کھیت کا زِیرا، سونف اور رائی وغیرہ زکوۃ نکالتے وقت موجود ہے اور یہ نصاب کی مقدار بھی ہیں، اور یہ مال فروخت کرنے کی نیت سے رکھا ہوا ہے، تو کیا زکوۃ نکالتے وقت ایسے مال کی بھی زکوۃ نکالنی پڑے گی یا نہیں؟ ایسے مال پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اُس کو مالِ تجارت کہتے ہیں یا نہیں؟ مالِ تجارت کی تعریف کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اِس کی زکوۃ واجب نہیں ہے؛ البتہ اگر اِس کو فروخت کر چکا ہے اور زکوۃ نکالتے وقت اِس کی قیمت موجود ہے تو اُس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

ومثله الخارج من أرضه؛ لأن الملك ثبت فيه بالنبات، ولا اختيار له فيه، ولذا قال في البحر: وخرج أي بقيد العقد ما إذا دخل من أرضه حنطة تبلغ قيمتها نصابا، ونوى أن يمسكها ويبيعها، فأمسكها حولا لاتجب فيها الزكوة

كما في الميراث. (شامي ۲/۱۱)

تجارت کی تعریف: التجارة كسب المال ببدل هو مال. (شامي ۲/۱۵)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

ترجمہ: تجارت مال کے عوض مال کمانا ہے۔از مرتب عفی عنہ

تجارتی غلہ کی زکوٰۃ کے چند مسائل

سوال: زید نے غلہ کے علاوہ دیگر پیداوار میں سے زِیرا، تمباکو، رائی کو اپنے پاس بطورِ ذخیرہ روک رکھا، کچھ مدت بعد اُس کو ادھار قیمت سے بکر کو بیچ دیا؛ لیکن پھر وہی مال دوبارہ بکر سے تجارت کی غرض سے خرید بھی لیا، اِس صورت میں زید کی اِن اشیاء کے متعلق سوال یہ ہے کہ:

(الف) اب اِس دوبارہ خریدنے کے بعد اِن اشیاء کو مالِ تجارت شمار کریں گے یا حسبِ سابق یہ کھیتی کی پیداوار ہی شمار کی جائے گی؟

(ب) اب سے حولانِ حول پر اِن اشیاء کی زکوٰۃ زید پر واجب ہوگی یا نہیں؟

(ج) زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں اِن اشیاء کی خرید کی قیمت معتبر ہوگی یا فی الحال کا بازاری بھاؤ معتبر ہوگا؟

(د) بالفرض اب تک اگر اِن اشیاء کا عُشر یا خراج نہیں ادا کیا گیا تو عشر یا خراج کا کیا حکم ہوگا؟

(ھ) اب ادائیگی واجب ہونے کی صورت میں کس طرح سے عشر یا خراج ادا کیا جائے گا؟

(و): بعض مرتبہ زید کا مال بکنے اور دوبارہ خریدنے تک زید ہی کے گھر اُسی جگہ جہاں پہلے سے رکھا ہوا ہے، اُسی ہیئت میں جو پہلے سے ہے، رکھا رہتا ہے، اِس طرح

تجارت میں شرعاً کوئی حرج تو نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) جب بغرضِ تجارت خریدا گیا تو خریدتے ہی وہ مالِ تجارت شمار ہوگا۔

وما اشتراه لها أي للتجارة كان لها، لمقارنة النية لعقد التجارة. (درمختار)

(ب) ہوگی۔

(ج) سال پورا ہونے پر جس قدر مال موجود ہو اُس وقت اُس کی جتنی قیمت ہو، اُس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۳/۵۰)

(د) اب ادا کرے۔

(ھ) قیمت لگا کر۔

(و) جب قبضہ نہیں ہوا ہے تو پہلی بیع کے بعد دوسری بیع کیسے درست ہوگی؟۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

بیوی کا شوہر کے مال میں سے زکوۃ یا قربانی دینا

سوال: کیا بیوی شوہر کی چوری سے زکوۃ اور قربانی دے سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیوی اگر اپنے مال میں سے زکوۃ ادا کر رہی ہے یا قربانی دے رہی ہے تو اِس میں شوہر کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اِس کا یہ تصرف اپنے مال میں ہونے کی وجہ سے شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں؛ البتہ اُس کو بتلا دینا مناسب ہے؛ تاکہ غلط فہمی کا باعث نہ ہو۔ اور اگر شوہر کے مال میں سے دے رہی ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں، پھر بھی اُس کی قربانی اور زکوۃ

ادا ہو جائے گی، اور شوہر کی اتنی رقم کا تاوان عورت پر باقی رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صدقہ کو ہدیہ کے نام سے دیا جا سکتا ہے

سوال: صدقہ دیتے وقت سامنے والے کو یہ کہنا لازمی ہے کہ: یہ صدقہ کی رقم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ صدقہ کا مصرف ہے تو اُس کو صدقہ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ: یہ رقم صدقہ کی ہے؛ بلکہ مصرف ہونے کے باوجود اگر وہ لینے میں شرم محسوس کرتا ہو تو ہدیہ کے نام سے بھی دیا جا سکتا ہے، اپنے دل میں نیت صدقہ کی کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوۃ کی رقم سے تعمیراتی کام درست ہے یا نہیں؟

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیرونی طلبہ کے لیے دارالاقامہ کی تعمیر درست ہے یا غیر درست؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ کی رقم براہِ راست بغیر تملیکِ شرعی، دارالاقامہ یا کسی اَور تعمیراتی کام میں استعمال کرنا درست نہیں۔ (شامی ۲/ ۶۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوۃ کی رقم تعمیراتی کام میں لگائی گئی تو اِس کا ذمہ دار کون؟

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیرونی طلبہ کے لیے دارالاقامہ کی تعمیرِ نو کی گئی؛ لیکن پلان کے تحت اب تک مدرسہ جاری نہ ہو سکا، اور مستحقین طلبہ وہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، تو اِس تعمیر شدہ دارالاقامہ کو کرایہ سے دینا اور اُس کی آمدنی سے مسجد کے امام کی یا مکتب کے معلم کی تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز مسجد کی کمیٹی کا یہ فعل درست ہے یا غیر درست؟ نیز دہندگانِ زکوۃ کی زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ ادا نہ ہوئی ہو تو اُس کی ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟ جب کہ زکوۃ دہندگان کو زکوۃ ادا کیے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے، اور اُن کو اندرونی

معاملات کی اطلاع بھی نہیں؛ لہٰذا اِس زکوۃ کی عدمِ ادائیگی کا ذمہ دار کون ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر براہِ راست بغیر تملیکِ شرعی زکوۃ کی رقم سے عمارت تعمیر کی گئی تو مالکین کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، جس کی ذمہ داری حضراتِ منتظمین پر عائد ہوتی ہے، اُن پر اِتنی رقم کا ضمان واجب ہے، جس کو وہ مالکین کی خدمت میں ادا کریں؛ اور مالکین ازسرِ نو زکوۃ ادا کریں، منتظمین پر لازم ہے کہ وہ مالکین کو صورتِ حال سے باخبر کریں؛ ورنہ پورا گناہ اُن پر ہوگا، حضراتِ منتظمین جب مالکین کو ضمان ادا کردیں گے تو عمارت کی ملکیت منتظمین کی ہوگی، اور اُس کی آمدنی کو جہاں چاہیں خرچ کریں بشرطیکہ یہ عمارت اُن کی اپنی زمین میں بنائی ہو؛ لیکن ضمان کی ادائیگی سے قبل اِس آمدنی کو خرچ کرنا بھی درست نہیں۔ (کما هو مقتضی الأصول والکتب الفقهية). فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

زکوۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء خرید کر فقیر کو دینا درست ہے

سوال: ہمارے یہاں ایک ٹرسٹ ہے جو لوگوں سے زکوۃ کی رقم وصول کرتا ہے اور فقیروں، حاجت مندوں کی ضروریات میں صَرف کرتا ہے، اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مریضوں کی دوائیاں خرید کر اُن کو دی جاتی ہیں، اِسی طرح علاج معالجہ کی فیس ٹرسٹ ادا کرتا ہے، یا مکان کی تعمیری اشیاء خرید کر غریبوں کو دیتا ہے، یا اپنی ماتحتی میں گھر کا پورا کام کرواتا ہے، اور مزدور کی مزدوری بھی زکوۃ کی رقم سے دیتا ہے، تو کیا اِس طرح زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زکوۃ کی رقم سے دوائی یا اَور کوئی چیز جو فقیر کی ضرورت کی ہے خرید کر فقیر کو دینے سے بھی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (شامی ۲/۲۴) اِسی طرح اُس کے علاج معالجہ کا بل مریض کے

کہنے سے ادا کیا گیا تو زکوۃ ادا ہوگی؛ ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/ ۶۸)

اِس لیے بہتر یہ ہے کہ معالجہ کے بِل کی رقم اُس کے ہاتھ میں دے کر یہ کہا جائے کہ: تُو اِس رقم سے یہ بِل ادا کر دے، مکان کی مَرمَّت میں جو سامان وغیرہ خریدا جاتا ہے اُس کا حکم دوائی کی طرح ہے، اور معمار وغیرہ کی مزدوری دی جاتی ہے اُس کا حکم معالجہ کے بِل کی طرح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ

سوال: (۱) سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ میں لاکھوں روپے جمع رہتے ہیں، یہ ایسی رقم ہوتی ہے جسے ملازمین اپنی ضرورت کے وقت نکال سکتے ہیں، کیا اِس رقم پر زکوۃ واجب ہے؟

قرض کی زکوۃ قرض دینے والے پر ہے

سوال: (۲) زید نے بکر کو ایک لاکھ روپیہ قرض دیا، بکر نے یہ رقم اپنی ضرورت پر خرچ کر دی، اور چار سال تک قرض دَہندہ کو لوٹا نہیں سکا، کیا زید کی اِس رقم پر جو کہ اُس کے پاس نقد کی صورت میں نہ تو زید کے پاس موجود ہے نہ بکر کے پاس، کیا اِس صورت میں اُس رقم پر زکوۃ واجب ہے؟ اور اگر ہے تو اُس کی ادائیگی کی ذمہ داری کس پر ہے؟ زید پر یا بکر پر؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) تنخواہ سے جو رقم پراویڈنٹ فنڈ میں کاٹی جاتی ہے اور اُس پر ماہ بہ ماہ جو اضافہ محکمہ اپنی طرف سے جمع کرتا ہے، پھر مجموعہ پر جو رقم سالانہ (بنام سود یا انٹرسٹ) ملازم کے حساب میں جمع کرتا ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مذہب پر اِن میں سے کسی رقم پر سالہائے گذشتہ کی زکوۃ واجب نہیں، ہاں! وُصول ہونے کے بعد سے ضابطہ کے مطابق اُس پر زکوۃ

واجب ہوگی، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے؛ مگر صاحبینؒ کے نزدیک یہ رقم وصول ہونے کے بعد سالہائے گذشتہ کی زکوۃ بھی واجب ہوگی؛ لہذا اگر کوئی شخص تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرتے ہوئے سالہائے گذشتہ کی زکوۃ بھی دے دے تو افضل اور بہتر ہے، نہ دے تو کوئی گناہ نہیں؛ کیوں کہ فتویٰ امام اعظمؒ کے قول پر ہے، فنڈ خواہ جبری ہو یا اختیاری، زکوۃ کے مسائل میں دونوں کے احکام یکساں ہیں۔

مذکورہ بالا حکم اُس وقت ہے جب کہ ملازم نے اپنے فنڈ کی رقم اپنی ذمہ داری پر کسی دوسرے شخص یا کمیٹی وغیرہ کی تحویل میں منتقل نہ کروادی ہو، اگر ایسا کیا یعنی اپنے فنڈ کی رقم اپنی طرف سے اپنی ذمہ داری پر کسی شخص یا بینک، بیمہ کمپنی، کسی اَور مستقل تجارتی کمپنی یا ملازمین کے نمائندوں پر مشتمل بورڈ وغیرہ کی تحویل میں دِلوادی، تو یہ ایسا ہے جیسے خود اپنے قبضہ میں لے لی ہو؛ کیوں کہ اِس طرح جس کمپنی وغیرہ کو یہ رقم منتقل ہوئی وہ اُس ملازم کی وکیل ہوگئی، اور وکیل کا قبضہ شرعاً مؤکل کے قبضہ کے حکم میں ہے؛ لہذا جب یہ رقم اُس کمپنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوگی اُس وقت اُس پر زکوۃ کے احکام جاری ہوجائیں گے، اور ہر سال کی زکوۃ ضابطہ کے مطابق واجب ہوتی رہے گی۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ ۲۶، ۲۷)

(۲) زید نے جو رقم بکر کو بطورِ قرض دی ہے اُس کی زکوۃ زید پر واجب ہے، چاہے تو ابھی دے دے اور چاہے تو قرض وصول ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی ادا کردے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

شرکت والے کاروبار کی زکوۃ کس طرح نکالی جائے؟

سوال: ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو دکان کھلوائی ہے، رقم ایک بھائی کی ہے

اور چلاتا دوسرا بھائی ہے، نفع برابر کا ہے، اُس کی زکوٰۃ کون ادا کرے؟ جب کہ یہ کاروبار شرکت میں ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ جب کسی کاروبار کے لیے مال دیا جائے اور نفع میں حصہ رکھا جائے تو شرعی اصطلاح میں اِس کو ''مضارَبت'' کہتے ہیں، اور ہمارے یہاں عام طور سے اِس کو ''شرکت'' کہہ دیا جاتا ہے، اِس کاروبار میں ایک اصل رقم ہوتی ہے اور ایک اُس کا منافع، اصل رقم کی زکوۃ اُس کے مالک کے ذمہ ہے، اور اُس کے ذمہ منافع کے اُس حصہ کی زکوۃ بھی واجب ہے جو اُسے ملے گا، اور جو نفع پر کام کرتا ہے اگر اُس کا نفع نصاب کی مقدار کو پہنچے اور اُس پر سال بھی گزر جائے، تو اپنے حصہ کی زکوۃ اُس پر بھی ہوگی۔ جو قِطعہ زمین کا دکان کے لیے خریدا ہے اُس پر زکوۃ نہیں۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/۳۵۰)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فلاحی ادارے میں زکوۃ دینا کیسا ہے؟

سوال: کسی خدمتی ادارہ یا کوئی وقف ٹرسٹ یا فاؤنڈیشن کو زکوۃ دینے سے کیا زکوۃ ادا ہو جاتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو فلاحی ادارے زکوۃ جمع کرتے ہیں وہ زکوۃ کی رقم کے مالک نہیں ہوئے؛ بلکہ زکوۃ دَہندگان کے وکیل اور نمائندے ہوئے ہیں، جب تک اُن کے پاس زکوۃ کا پیسہ جمع رہے گا وہ بدستور زکوۃ دَہندگان کی مِلک ہوگا، اگر وہ صحیح مصرف پر خرچ کریں گے تو زکوۃ دَہندگان کی زکوۃ ادا ہوگی؛ ورنہ نہیں۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/۴۰۳)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لڑکی کے لیے زیور بنوا کر رکھا تو اُس کی زکوۃ کس پر ہے؟

سوال: جو زیور لڑکیوں کی شادی کے لیے بنوا کر رکھا جاتا ہے تو لڑکی کے لیے ایسے زیور پر زکوۃ اُس کے والدین پر ہے یا لڑکی پر؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ زیور لڑکی کی مِلک کر دیا ہے تو اُس پر زکوۃ بلوغ سے پہلے فرض نہیں ہے، نہ لڑکی پر، نہ والدین پر؛ بالغ ہونے کے بعد خود لڑکی پر فرض ہوگی، اگر لڑکی کی ملک نہیں کیا تو جس کی ملک ہے اُس پر زکوۃ فرض ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۱/۱۲۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قرض دی ہوئی رقم میں زکوۃ کی نیت کرنا کیسا ہے؟

سوال: کوئی غریب شخص قرض لی ہوئی رقم کو آج تک واپس نہیں کر سکا اور نہ ہی امید ہے، اب کیا ہم اُس قرض دی ہوئی رقم کو زکوۃ کی نیت کر کے چھوڑ دیں تو زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو صورت آپ نے لکھی ہے اُس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی؛ کیوں کہ زکوۃ ادا کرتے وقت نیت کرنا شرط ہے۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/۳۸۳)

نوٹ: اپنی قرض میں دی ہوئی رقم وُصول کرنے میں یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ مقروض کو زکوۃ کی رقم دے کر مالک بنا دیں، پھر جب وہ مالک ہو جائے اپنا قرض وُصول کر لیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نہ فروخت ہونے والی چیز زکوۃ میں دینا کیسا ہے؟

سوال: ایک دکان دار سے ایک چیز نہیں بکتی، کیا وہ چیز زکوۃ میں دی جا سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

رَدّی، خراب چیز زکوۃ میں دینا اخلاص کے خلاف ہے، تاہم اِس چیز کی جتنی

مالیت بازار میں ہو اُس کے دینے سے اُتنی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳۸۲/۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا دَلالی سے جمع کی ہوئی رقم پر زکوۃ ہے؟

سوال: زید دلالی کرتا ہے، اور خریدار سے کہتا ہے کہ: فلاں شخص اِتنے روپے دیتا تھا؛ مگر مَیں نے اُس کو نہیں دیا، گاہک اِس ترغیب سے خرید لیتا ہے، اور زید کو اجرت دلالی کی دیتا ہے، زید کے پاس ایسی اجرت سے بقدرِ نصاب روپیہ جمع ہو گیا ہے، تو زید پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اِس صورت میں زید جھوٹ بولنے کی وجہ سے گنہ گار ہوا، اور حدیث شریف میں ہے کہ: ایسی بیع میں برکت نہیں ہوتی؛ لیکن زید اُس رقم کا مالک ہو جاتا ہے، اور زکوۃ لازم ہوگی۔ (فتاویٰ دارالعلوم بحوالۂ ہدایہ ۹۴/۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

امانت کی رقم پر زکوۃ کا حکم

سوال: میرے پاس کسی کی امانت ہے تو اُس پر زکوۃ دینا میرا فرض ہے یا جس کی رقم ہے وہ زکوۃ دے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس شخص کی امانت آپ کے پاس ہے، آپ کے ذمہ اُس کی زکوۃ نہیں؛ بلکہ اُس کی زکوۃ امانت رکھوانے والے کے ذمہ ہے، اگر اُس نے آپ کو اختیار دے دیا ہے تو آپ بھی اُس رقم سے ادا کر سکتے ہیں۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳۵۲/۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فیکٹری کی جگہ اور مشینری پر زکوۃ واجب نہیں

سوال: ہمارے پاس الیکٹرک وائرنگ کی پٹیاں اور پائپ اور لائٹ باکس بنانے

کی مشین ہے، اب ہمیں زکوۃ اُس مشین پر نکالنی ہے یا اُس سے حاصل ہونے والی آمدنی پر؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فیکٹری کی جگہ اور مکان اور مشینری پر زکوۃ واجب نہیں ہے، آپ کے پاس جو کچا مال اور تیار شدہ مال اور اُس کی قیمت سے حاصل شدہ رقم جمع ہو، اُس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، جس دن سال پورا ہوا اُس دن کچے اور تیار شدہ مال کی جو قیمت بازار میں ہو وہ لگا کر اُس میں نقد رقم ملا کر جو مجموعی مالیت ہوتی ہو، اُس کا چالیسواں حصہ بطورِ زکوٰۃ ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

عُشر وخراج کے مسائل

عشری وخراجی زمین کسے کہتے ہیں؟

سوال: (۱) عشری اور خراجی زمین کسے کہتے ہیں؟

بناس کانٹھا کی زمین عشری ہے یا خراجی؟

سوال: (۲) ہمارے علاقہ یعنی ضلع بناس کانٹھا کہ جہاں کی زمینیں مسلم نواب کی تھیں، اور ضلع مہسانہ جہاں کی زمینیں غیر مسلم راجہ گائکواڑ کی تھیں، عشری ہیں یا خراجی؟

عشر وخراج کی مقدار

سوال: (۳) عشر وخراج کی مقداریں کیا ہیں؟

عشر وخراج کے مصارف

سوال: (۴) عشر وخراج کے مصارف کیا ہیں؟

زمین کا محصول ادا کرنے سے عشر ساقط نہیں ہوگا

سوال: (۵) آج کل غیر مسلم حکومت ہماری عشری یا خراجی زمین پر جو ٹیکس لیتی

ہے، اُس سے خراج اور عشر ادا ہوجائے گا یا الگ سے دوسری رقم اِس کے لیے خرچ کرنی ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) الأرض العشرية ما فيها عشر أو نصف عشر، وليس فيها الخراج، وهي: ما أسلم أهله طوعا أو فتح عنوة وقسمت على جيش المسلمين، وإن تركت عند أهلها من الكفرة فهي خراجية. الأرض الخراجية وهي التي يوخذ منها الخراج. (قواعد الفقه: ١٦٨)

(۲) موجودہ حالت میں جب کہ زمین ملکِ سرکار ہے، تو نہ وہ عشری ہیں نہ خراجی۔ هذا نوع ثالث لاعشرية ولاخراجية من الأراضي، تسمىٰ أراضى المملكة وأراضى الحوز. (بحواله شامي، فتاوىٰ محموديه ٣/٦٨)

(۳) جس زمین کی آب پاشی کی جاتی ہے یا محنت کر کے کنویں وغیرہ سے پانی دیا جاتا ہے، اُس کی پیداوار میں نصف عشر واجب ہے، اور جس زمین میں بارش کے پانی سے کھیتی ہوتی ہے اور مستقل پانی دینا نہیں پڑتا، اُس کی پیداوار میں عشر واجب ہوتا ہے۔

(و) تجب في (مسقى سماء) أي مطر وسيح كنهر .... (و) يجب (نصفه في مسقى غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب؛ لكثرة المؤنة، إلخ. (درمختار على هامش الشامي ٢/ ٥٣، ٥٥)

خراج کی دو قسمیں ہیں: ایک خراجِ مقاسمہ، یعنی پیداوار ہی کا ایک حصہ، مثلاً نصف یا رُبع یا ثُلث مقرر کر دیا جائے، اِس صورت میں اُس کی مقدار وہی ہوگی جو مقرر کی گئی ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ نصف سے زیادہ نہ ہو۔ دوسری قسم خراجِ مُوظَّف ہے، یعنی پیداوار کا کوئی حصہ متعین نہ ہو؛ بلکہ مالکِ زمین کے ذمہ ڈال دیا گیا ہو، جیسا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، اِس کی مقدار مختلف ہے، ہر جریب (ساٹھ ذراع لمبی اور ساٹھ ذراع چوڑی زمین) پر اگر غلہ ہے تو ایک صاع غلہ اور ایک درہم، اور سبزی ہے تو پانچ درہم، اور انگور و کھجور کا باغ ہے تو دس درہم۔

وهو نوعان: خراج مقاسمة، إن كان الواجب بعض الخارج كالخمس ونحوه، وخراج وظيفة، إن كان الواجب شيئا في الذمة. الخ

(درمختار على هامش الشامي ٣/ ٢٨٤،٢٨٥)

(۴) عشر کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے۔

باب المصرف أي مصرف الزكوٰة والعشر. (درمختار على هامش الشامي ٢/ ٦٤)

خراج کا مصرف مصالحِ مسلمین ہیں، مثلاً: سرحدوں کی حفاظت، پُل کی تعمیر، مساجد، حوض، رِباط وغیرہ کی تعمیر، نہروں کا بنانا، علماء وقضاۃ وعُمّال حکومت، طلبۂ علم کے وظائف۔

مصرف الجزية والخراج ومال التغلبي وهديتهم للإمام، وما أخذ منهم بلا حرب مصالحنا، كسد ثغور، وبناء قنطرة، وجسر، وكفاية العلماء والقضاة والعمال. (تنوير الأبصار مع الدر المختار على هامش الشامي ٣/ ٣٠٦،٣٠٧)

(۵) اصح قول یہ ہے کہ: محصول مذکور زمینوں کا کرایہ ہے جس کی وجہ سے عشری زمین سے عشر ساقط نہیں ہوگا؛ لیکن جب زمین خراجی ہو تو یہ محصول خراج کے قائم مقام ہوگا۔ كذا في فتاوى رشيدية (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۴۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

سوال: (۶) ہمارے علاقہ شمالی گجرات کی خراجی زمینوں میں خراجِ مقاسمہ

واجب ہے یا خراج مُوظَّف؟

سوال: (۷) خراجِ مقاسمہ وخراج موظَّف کی تعریف اور مقدار کیا ہے؟

سوال: (۸) زید نے اپنی زمین کی قیمت قسط وار حکومت کو ادا کردی ہے، ایسی زمین کو ہمارے یہاں ’’ہٹ کی زمین‘‘ کہتے ہیں، اور زید اُس کو بیچنے کا مختار ہے، اُس پر عشر یا خراج زمین کی نوعیت کے اعتبار سے آئے گا یا نہیں؟

سوال: (۹) زید کے پاس ایک زمین ہے جس کی قیمت زید نے حکومت کو ادا نہیں کی، اور حکومت کی طرف سے زید اُس کے بیچنے کا مختار بھی نہیں ہے، ایسی زمین اگر عشری ہے تو عشر، اور خراجی ہے تو خراج اُس پر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۶) جواب نمبر۲/ پڑھ لیجیے۔

(۷) جواب نمبر۳/ پڑھ لیجیے۔

(۸،۹) جواب نمبر۲/ دیکھیے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

كتاب الصوم

ثبوتِ ہلال میں گزشتہ ماہ کا اعتبار

سوال: ذی الحجہ کے ۲۹/ چاند کی کہیں سے بھی اطلاع نہیں تھی؛ لیکن ذیقعدہ کے ۲۹/ چاند کی اطلاع موصول ہوگئی، تو اِس حساب سے ذیقعدہ کے ۳۰/ دن منگل کو پورے ہوجاتے تھے، جس کی بنا پر چند جگہ عید الاضحیٰ بدھ ۵/ اگست ۱۹۸۷ء کو منائی گئی، تو کیا ثبوتِ ہلال میں گذشتہ مہینہ کا اعتبار کیا جائے گا؟ برائے کرم اِس مسئلہ کو ضرور واضح فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر شوال کی رویتِ ہلال بطریقِ موجب حاصل ہوئی اور اُس کے حساب سے ذوالقعدہ کے تیس دن پورے کیے ہیں تو عید کر سکتے ہیں۔

فيلـزم أهـل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبـت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب كما مر. (درمختار على هامش الشامي ۲/ ۱۰۵)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

ثبوتِ ہلال میں شہادت کا محل ہونا ضروری ہے

سوال: محترم المقام حضرت قبلہ مفتی صاحب (مدظلکم العالی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

سعودی عربیہ میں قرانِ شمس وقمر سے پہلے اور قرانِ شمس وقمر کے وقت یا قرانِ شمس وقمر کے چند گھنٹوں ہی کے بعد رویتِ ہلال کا فیصلہ کیا جاتا ہے، آیا اُسے معتبر مانا جائے گا یا نہیں؟ وہاں کے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہم آبزرویٹ رصد گاہوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتے ہیں، ہم صرف رویتِ ہلال کا اعتبار کرتے ہیں، تو اب شریعتِ اسلامیہ کا اِس بارے میں کیا حکم ہے؟ آیا چاند کی رویت کو بھی کیا آبروزیٹ کی کسوٹی پر پرکھا جانا ضروری

ہے یا صرف دین دار مسلمانوں کی رویت کا اعتبار کر کے اُسے قبول کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سعودیہ کے علمائے کرام قبول فرماتے ہیں؟ حالاں کہ وہ رویت قرانِ شمس وقمر سے قبل یا متصل یا چند ہی گھنٹے بعد ہو۔

اِس بارے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں، ہم انگلینڈ میں - جہاں کبھی بھی چاند نظر نہیں آتا ہے- مجبورِ محض ہیں، ملک میں سعودیہ کے چاند پر فیصلہ کرنا چاہتے تھے؛ مگر ایک عالمِ دین نے یہ بات کہہ کر کہ: سعودیہ میں قرانِ شمس وقمر سے پہلے یا متصل یا چند ہی گھنٹوں کے بعد رویتِ ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے جو غلط ہے، ہمارے فیصلہ کو ٹھکرا دیا؛ اِس لیے آں جناب کی طرف رجوع ہو کر دریافت کرتے ہیں، اِس سے قبل آں جناب کی خدمت میں سعودیہ کے علمائے کرام کے فیصلوں کی نوعیت کا رسالہ ارسال کیا جا چکا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چاند کا نکلنا سب مقامات پر بیک وقت نہیں ہے؛ بلکہ اِس میں قدرت کا پیدا کیا ہوا اختلاف ہے، کہیں ایک دن پہلے طلوع ہوتا ہے، کہیں دو دن پہلے، اگر شرعی اصول کے مطابق ایک ملک میں چاند کی رویت ثابت ہو جائے اور دو عادل شاہد بذریعۂ ہوائی جہاز ایسے ملک میں آکر شہادت دیں جہاں اُس روز اٹھائیس تاریخ ہو تو شاہدوں کے عادل وثقہ ہونے کے باوجود اُن کی شہادت قابلِ سَماعت نہیں ہوگی، شہادت کے لیے محل ہونا ضروری ہے، اُس کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹/تاریخ، اور ۲۸ تاریخ کو تو شہادت لی بھی نہیں جائے گی، نہ شاہد کا ذب قرار دیا جائے گا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ: ہم نے اِس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مجبوب ہے یعنی اُس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں؛ بلکہ مقطوع ہے، تو اِن شاہدوں کی

وجہ سے اُس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں کے حدِ قذف جاری ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۱۳۹، ۱۴۰)

صورتِ مسئولہ میں حکومتِ سعودیہ کا یہ فیصلہ ۲۹ تاریخ کو شہادتِ رویت کی بنیاد پر ہے تو محلِ شہادت موجود ہے؛ اِس لیے قابلِ قبول ہے؛ ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ

چاند کے ثبوت کے بارے میں چند سوالات کے جوابات

مکرمی ومحترمی حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

رویتِ ہلال کے موضوع پر سوالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا جارہا ہے، اگر ممکن ہو تو اِس کے جوابات اکیڈمی کو ارسال فرمادیں؛ ورنہ اپنے ساتھ سیمینار میں لیتے آئیں، اِس علمی تعاوُن پر ہم آپ کے بہت مشکور ہوں گے۔ والسلام

مجاہد الاسلام قاسمی (جنرل سکریٹری)

اسلام نے متعدد عبادات اور شرعی احکام کو قمری ماہ وسال سے وابستہ کیا ہے، اور قمری ماہ کے آغاز کا مدار ہلال کی بصری رویت پر رکھا ہے، خصوصاً روزہ جیسی اہم ترین اسلامی عبادت کا آغاز واختتام، اِسی طرح دونوں اسلامی تہواروں عید الفطر اور عید الاضحیٰ (جن کی حیثیت اصلاً عبادت کی ہے) کی ادائیگی بھی قمری ماہ وتاریخ سے وابستہ ہے؛ اِس لیے رویتِ ہلال سے متعلق قدیم وجدید سوالات کا شرعی حل ایک اسلامی فریضہ ہے، جو بابصیرت اور دقیقُ النظر علماء اور اصحابِ افتاء پر عائد ہوتا ہے، رویتِ ہلال کے بارے میں کچھ اہم اور

بنیادی مسائل پر علماء کی طرف سے متفقہ رائے نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے، جس سے روزہ جیسی اہم عبادت اور عید الفطر وعید الاضحیٰ کی پُر مسرت تقریبات متأثر ہوتی ہیں، ذرائعِ ابلاغ کی نئی ایجادات اور بعض علاقوں میں نظامِ قضاء کے فُقدان کی وجہ سے بھی بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں؛ لہٰذا اِس سلسلہ میں چند بنیادی سوالات اصحابِ علم وتحقیق اور علماء وفقہاء کی خدمت میں اِس امید کے ساتھ پیش کیے جارہے ہیں کہ، آپ حضرات اِن سوالات پر واضح اور مدلل جواب تحریر فرمائیں گے۔

(۱)[الف]: رویتِ ہلال کے سلسلہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

[ب]: اگر مطالع کے اختلاف کا اعتبار ہے تو اُس کے حدود کیا ہیں؟

[ج]: ہندوستان بشمولِ پاکستان و بنگلہ دیش و نیپال کا مطلع ایک ہے یا مختلف؟ بالخصوص جب کہ اِن علاقوں میں بلندی کی سطح کافی مختلف ہے۔

[د]: اگر مطلع ایک ہے تو کیا کسی حصہ میں ۲۹ر تاریخ کو رویتِ ہلال کا ثبوت اور اُس کا اعلان بھی کر دیا جائے، تو ملک کے دوسرے خطہ کے مسلمانوں پر کیا یہ لازم ہے کہ وہ اِس اعلان کے مطابق عمل کریں، یا اپنے مقامی قاضی اور جہاں نظامِ قضا نہ ہو وہاں کسی رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کریں؟ اور کیا اِس دوسرے خطہ کے قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی اِس اعلان کی پابند ہے؟

[ھ]: ایک خطہ میں اگر رویت ہو جائے تو دوسرے خطہ تک اُس کی خبر بذریعۂ فون یا فیکس یا ٹیلی گرام یا ریڈیو ملتی ہے، تو اِس خبر پر کیا عمل کرنا صحیح ہوگا؟ کیا اِن کے اعتبار کے لیے کچھ شرائط ہیں؟ اور کیا اِن کے مابین احکام میں کچھ فرق ہے؟

(۲): ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اکثر موسم کا فرق رہتا ہے، اور فضا میں

ابر، گرد و غبار یا مختلف طرح کی کثافت کے اعتبار سے بھی اِن کے مابین فرق ہے؛ اِس لیے قمری مہینے کی ۲۹ ؍تاریخ کو ہر جگہ مطلع یکساں صاف یا گرد آلود نہیں رہتا ہے تو......

(الف) کیا رویت کے لیے فلکیاتی حساب سے مدد لی جاسکتی ہے؛ تاکہ یہ معلوم ہو کہ آج اُفق پہ چاند کی بصری رویت کا امکان ہے یا نہیں؟

(ب) بعض قدیم اور جدید علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی خطہ میں فلکیاتی حساب سے قمری ماہ کی ۲۹/ تاریخ کو چاند کی بصری رویت کا امکان نہ ہو، اور اِس کے باوجود اُس خطہ سے رویتِ ہلال کی شرعی شہادت ملتی ہے، تو کیا اُسے قبول کیا جائے گا؟ یا یہ کہہ کر کہ: اِن کو غلط فہمی ہوئی ہے، شہادت رد کردی جائے گی؟

(ج) چاند کی رویت کے لیے کیا محکمۂ موسمیات سے مدد لی جاسکتی ہے؟ یعنی اِس کے علم کے لیے کہ آج مطلع صاف ہے یا گرد آلود و کثافت زدہ ہے، اور چاند کی رویت ممکن ہے یا نہیں؟

(د) اگر ۲۹ ؍شعبان کو مطلع ابر آلود ہوا اور ایک شخص کی شہادت کی بنا پر قاضی نے آغازِ رمضان کا اعلان کردیا ہو، اِس کے بعد رمضان کی ۳۰/ تاریخ مکمل ہوچکی ہو، ۳۰ ؍رمضان کی شام کو موسم بالکل صاف ہوا اور عید کا چاند دیکھنے کی بہت کوشش کے باوجود کسی کو عید کا چاند دِکھائی نہ دیا ہو، تو کیا اگلے دن کو عید الفطر کا دن قرار دے کر عید منائی جائے گی؟ یا یہ سمجھا جائے گا کہ جس فردِ واحد نے رمضان کے چاند کی گواہی دی تھی اُسے مغالطہ ہوا یا اُس نے غلط بیانی سے کام لیا؛ لہٰذا اگلے دن کو رمضان کی ۳۰/ تاریخ قرار دے کر روزہ رکھنے کا فیصلہ کیا جائے گا؟

(۳) (الف) رمضان وعیدین کے ثبوت کے لیے جب کہ مَطلع صاف ہو تو

کتنے افراد کی چاند دیکھنے کی شہادت کافی ہوگی؟ چاند دیکھنے والوں کے لیے عدل کا وہ معیار ضروری ہے جو فقہاء نے عام طور پر لکھا ہے؟ یا موجودہ دور میں اِتنا کافی ہے کہ چاند دیکھنے والا معاشرہ میں جھوٹا نہیں سمجھا جاتا، اور صوم وصلوۃ کا پابند ہے؟ اور کیا مستورالحال کی شہادت معتبر ہوگی؟

(ب) چاند دیکھنے والوں کے لیے کیا قاضی کے پاس جاکر یا جہاں نظامِ قضا نہ ہو وہاں کے مقامی علماء یا رویتِ ہلال کمیٹی کے ذمہ دار کے پاس جاکر شہادت دینا ضروری ہے؟ چاند دیکھنے والوں کا بیان اصولی طور پر شہادت ہے یا خبر؟ اگر شہادت ہے تو کیا اُس کے لیے شہادت اور مجلسِ قضا اور شہادت کی دیگر شرائط کا پایا جانا ضروری ہے؟

(ج) دیکھنے والوں کے لیے کیا فوری طور پر شہادت دینا ضروری ہے؟ اور اگر چاند دیکھنے کے بعد چند گھنٹوں کی تاخیر یا ایک دن یا اِس سے زائد کی تاخیر کے بعد شہادت دے، تو کیا اُن کی شہادت قبول کی جائے گی یا رد کردی جائے گی؟ خصوصاً جب کہ رمضان وعیدالفطر کے موقع پر تاخیر سے اعلان کی صورت میں مسلمانوں کے مابین شدید اختلاف وانتشار پیدا ہوجاتا ہے۔

(۴): (الف) صوبۂ بہار واُڑیسہ اور ملک کے دیگر صوبوں میں جہاں نظامِ قضا موجود ہے، اگر وہاں کے قاضی چاند ہونے کا ثبوت ہونے کے بعد اعلان کرتے ہیں تو کیا اُس کے حلقۂ قضا کے تمام مسلمانوں پر اُس اعلان پر عمل ضروری ہوگا یا نہیں؟

(ب) قاضی کی طرف سے اگر ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے ذریعہ مُتعیَّنہ الفاظ میں اعلان ہوتا ہے، تو اُس کا اعلان اعلانِ سلطان کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟

(ج) ہندوستان اور اِس جیسے ملکوں میں اگر ایک صوبہ کے قاضی یا رویتِ ہلال

کمیٹی نے شرعی اصولوں کی روشنی میں رویتِ ہلال کا اعلان کیا، تو کیا یہ صرف اُسی صوبہ کے مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہوگا یا پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے؟ یعنی دوسرے علاقہ کے مسلمانوں کے حق میں وہ محض ایک خبر ہے یا اُن کے حق میں بھی اعلانِ سلطان کا درجہ رکھتا ہے؟

(د) ریڈیو سے رویتِ ہلال کے اعلان کے معتبر ہونے کے لیے کیا معلن کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کوئی بھی شخص اعلان کرے؟ اگر تجربات سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شخص قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی کی طرف خبر کی صحیح نسبت کیا کرتا ہے تو کیا اُس پر اعتماد کر لینا کافی ہے؟

(۵): (الف) بعض علاقوں میں بالعموم مطلع ابر آلود رہتا ہے، اور بہت کم چاند کی رویت ۲۹/ تاریخ کو ممکن ہوتی ہے، جیسے برطانیہ، کہ سال کے کچھ یا اکثر مہینوں میں وہاں چاند ۲۹/ تاریخ کو نظر ہی نہیں آتا، تو کیا ایسی جگہوں پر ہمیشہ ۳۰/ دن کا مہینہ شمار کر کے رمضان وعیدین کا فیصلہ کیا جائے؟

(ب) اگر ہر مہینہ ۳۰/ دن کا شمار کیا جاتا ہے تو سال کے دنوں میں دیگر ممالکِ اسلامیہ کے حساب سے ہفتہ دس دنوں کا فرق پڑ جاتا ہے، اور چار سال میں ایک مہینہ کا فرق ہو جاتا ہے، تو کیا ایسی جگہوں میں چاند کی رویت کے لیے ماہرینِ فلکیات کے قول پر اعتماد کیا جائے؟ یا دیگر ممالک میں رویتِ ہلال کے اعلان پر عمل کیا جائے؟

(ج) ملک کے چند شہروں یا صوبوں کے رویتِ ہلال کمیٹی کے ذمہ داران کی طرف سے رویت کے ثبوت کا فیصلہ ہو جانے پر اُن جگہوں کے ریڈیو اسٹیشن، اُن کی طرف سے رویت کا جو اعلان کرتے ہیں، دوسرے علاقوں کے ذمہ داران کس حد تک اِن

اعلانات پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ کیا اِن اعلانات کی بنیاد پر وہ رویت کا ثبوت مان کر اپنے علاقوں میں اعلان کر سکتے ہیں؟ اور اِس کے لیے کیا کم ازکم تین جگہوں کا اعلان درکار ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) (الف) امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ظاہر روایت یہ ہے کہ: اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے، اِسی کو عام فقہائے احناف نے راجح قرار دیا ہے، یہاں تک کہ مشرق ومغرب کے فاصلہ میں اختلافِ مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر ایک جگہ کی رویت کو دوسری جگہ کے لیے حجت قرار دیا ہے۔ ''درمختار'' میں ہے:

(واختلاف المطالع) ورؤيته نهاراً قبل الزوال وبعده (غير معتبر على ظاهر (المذهب)، وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة. (فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب) إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب كما مرّ. وقال الزيلعي: الأشبه أنه يعتبر؛ لكن قال الكمال: الأخذ بظاهر الرواية أحوط. (در مختار على هامش الشامي ۲/ ۱۰٤، ۱۰۵)

ہمارے اکابر میں سے سرخیلِ علمائے دیوبند حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے ''فتاویٰ رشیدیہ'' ۱/ ۴۱ میں، اور حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ نے ''فتاویٰ دارالعلوم'' (مطبوعہ کراچی) ۱/ ۳۷۶ میں، اور حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ نے ''امداد الفتاویٰ'' ۲/ ۱۱۲ میں، اور مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے ''کفایت المفتی'' ۴/ ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲ میں اِسی پر فتویٰ دیا ہے، حنابلہ اور مالکیہ بھی اِسی کے قائل ہیں۔ اِس کے برخلاف فقہائے حنفیہ میں سے بعض حضرات نے بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مَطالع کو معتبر مانا ہے، ہمارے اکابر میں سے

حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ''العُرف الشَّذی'' ۱/۲۰۳ میں، اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ''فتح الملہم'' ۳/۱۱۳ میں، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''رویتِ ہلال'' ص: ۴۸، ۴۹ میں اِسی کو اختیار فرمایا ہے، شوافع اِسی کے قائل ہیں، علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: وإنما الخلاف في اعتبار اختلاف المطالع بمعنى أنه هل يجب على كل قوم اعتبار مطلعهم، ولا يلزم احداً العمل بمطلع غيره أم لايعتبر اختلافها؛ بل يجب العمل بالأسبق رؤيةً، حتى لو رؤى في المشرق ليلة الجمعة وفي المغرب ليلة السبت وجب على أهل المغرب العمل بما رآه أهل المشرق، فقيل بالأول، واعتمده الزيلعي وصاحب الفيض وهو الصحيح عند الشافعية؛ لأن كل قوم مخاطبون بماعندهم كما في أوقات الصلاة، وأيده في الدرر بما مرّ من عدم وجوب العشاء والوتر على فاقد وقتهما، وظاهر الرواية الثاني، وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة.

(شامی ۲/۱۰۵)

''مجموعۂ رسائل ابن عابدین'' میں علامہ شامیؒ کا ایک رسالہ بنام ''تنبيه الغافل والوسنان على أحكام هلال رمضان'' ہے، اِس میں اُنہوں نے اختلافِ مطالع کی شرعی حیثیت بیان کرنے کے لیے مستقل ایک فصل بعنوان ''الفصل الرابع في بيان حكم اختلاف المطالع'' قائم فرمائی ہے، اُس میں احناف، حنابلہ، اور مالکیہ کے یہاں اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار والے قول کے معتمد اور راجح ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

لكن المعتمد الراجح عندنا أنه لااعتبار به، وهو ظاهر الرواية وعليه المتون كالكنز وغيره، وهو الصحيح عند الحنابلة كما في الأنصاف، وكذا

هو مذهب المالكية. الخ (مجموعۂ رسائل ابن عابدین ۱/۲۵۱)

نیز اختلافِ مَطالع کے اعتبار والا قول جمہور مشائخ اور ظاہر مذہب کے خلاف ہونے کے علاوہ وجوہ ذیل کی بناء پر بھی نا قابلِ عمل ہے۔

(۱): قوله تعالىٰ: ﴿يسئلونك عن الأهلة، قل هي مواقيت للناس والحج﴾ وقوله تعالىٰ: ﴿قدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب﴾ **میں واضح ہدایت** ہے کہ احکامِ شرع کا مدار قمری حساب پر ہے، شمسی پر نہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ، شمسی تاریخوں کو ہر شخص معلوم نہیں کرسکتا؛ بلکہ دنیا کے چند افراد یہ تاریخیں متعین کرتے ہیں اور باقی ساری دنیا محض اُن کی تقلید کرتی ہے، اِس کے برعکس قمر کے مُشاہَدہ سے ہر ناخواندہ شخص بھی تاریخ معلوم کرسکتا ہے، چونکہ احکامِ شرع ہر شہری وجنگلی اور خواندہ اور ناخواندہ کے لیے یکساں ہیں؛ اِس لیے اُن کا مدار یُسر وسہولت اور عام فہم طریقہ پر رکھا گیا ہے؛ مگر مَطالِع قمر کے اختلاف کا علم اِتنا مشکل اور اِس قدر پیچیدہ ہے کہ تسخیرِ قمر کے موجودہ دورِ ترقی میں بھی ایسے لوگ بہت ہی کم؛ بلکہ کالعدم ہیں جو اختلافِ مطالع کا خط کھینچ کر یہ بتادیں کہ اِس خط کے ایک جانب رویت کا امکان ہے اور دوسری جانب نہیں، اختلافِ مطالِع قمر کے علم کی بہ نسبت تو شمسی حساب بھی ہزاروں درجہ سہل اور آسان ہے، پس جب کہ شریعت نے شمسی حساب کو عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے غیر معتبر قرار دیا ہے، تو اختلافِ مطالِع قمر جیسے پیچیدہ اور مشکل ترین حساب کا مکلّف بنانا بطریق اولیٰ مقتضائے شرع کے خلاف ہے۔

(۲) اگر یہ مسئلہ مقتضائے شرع کے خلاف اختلافِ مطالِع قمر کے علم میں مہارت رکھنے والے چند افراد کے سپرد کر بھی دیا جائے، تو اِس میں ایک مزید قباحت یہ لازم آئے گی کہ ایک ہی مملکت کے اندر واقع دو متقارب مقامات کے درمیان خط اختلافِ

مطالع واقع ہونے کی صورت میں ایک شہر میں مرکزی حکومت رویت کی بناء پر عید کا فیصلہ کرے اور دوسرے ملحق شہر میں اختلافِ مطالع کی بناء پر روزہ کا حکم دے، ایسے فیصلہ کی نظیر تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی۔

(۳)(الف)خطِ اختلافِ مطالع کا محلِ وقوع ہر ماہ مختلف ہوتا ہے؛لہذا ہر مہینہ میں اِس کی تعیین کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت پڑے گی جو کالعدم ہیں؛ نیز اِس میں ہر ماہ تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے اِجرائے احکام میں تعسّر اور عوام میں انتشار پیدا ہونا لازمی امر ہے۔(از:احسن الفتاوی ۴/۴۹۳)

(ب)جوابِ سابق میں اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار کی تصریح وترجیح مذکور ہے، نیز اعتبار کی صورت میں تحدید بھی دشوار ہے، مسیرتِ شہر کی تحدید جس قول میں کی گئی ہے وہ متعدد وجوہ کی بناء پر باطل ہے۔

(ج)یہ یاد رہے کہ بلندی کی سطح مختلف ہونے سے مطالعِ قمر میں اختلاف نہیں ہوتا، ہاں !مَطالع ومَغاربِ شمس میں ہوتا ہے۔

(د):اگر ہندو پاک وبنگلہ دیش ونیپال کے تمام مسلمان رویتِ ہلال کے فیصلہ کے لیے کسی کمیٹی کو اختیار دے دیں، اور اُس کمیٹی کے سامنے رویتِ ہلال کا شرعی ثبوت مہیا ہونے پر وہ فیصلہ واعلان کردے، تو اُن تمام مسلمانوں پر وہ اعلان وفیصلہ واجب العمل ہوگا؛ بشرطیکہ کمیٹی کے ارکان میں ماہرینِ فقہ کی اکثریت ہو، اور اُن کی رائے کو قانونی غلبہ حاصل ہو، اور اگر ایسا نہیں ہے تو مقامی قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ کا انتظار ضروری ہے۔

(ھ)ہلالِ رمضان کے علاوہ دیگر اسلامی مہینوں کے ہلال کے لیے خبر کافی نہیں؛ بلکہ شہادت شرط ہے،(کما هو مصرح في كتب الفقه) ؛اِس لیے اِن میں

محض خبرِ رویت پر عمل درست نہیں، چاہے وہ فون یا فیکس یا ٹیلی گرام یا ریڈیو سے ملی ہو؛ البتہ اگر ہلالِ رمضان میں خبر اِس طرح پہنچی کہ اِس میں احتمالِ تزویر نہ ہوتو اُس پر عمل کر سکتے ہیں؛ بشرطیکہ جس جگہ خبر پہنچ رہی ہے وہاں کا مطلع صاف نہیں تھا۔

(۲)(الف) صرف اِتنی مدد میں تو بظاہر کوئی اشکال نہیں ہے۔

(ب) اگر رویتِ ہلال کی شرعی شہادت ملی ہے تو محض فلکیاتی حساب سے عدمِ امکان کی بنیاد پر اُس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

رویتِ ہلال کے معاملہ میں آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ کے نا قابلِ اعتبار ہونے کا مسئلہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شرحِ بخاری میں فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها، ولم يكونوا يعرفون من ذلك أيضاً إلا النزر اليسير، فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم في معاناة حساب التسيير، واستمر الحكم في الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك؛ بل ظاهر السياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب أصلاً، ويوضحه قوله في الحديث الماضى: (فإن غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين) ولم يقل: فسلوا أهل الحساب، والحكمة فيه كون العدد عند الإغماء يستوي فيه المكلفون، فيرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم إلى الرجوع إلى أهل التسيير في ذلك وهم الروافض، ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم. قال الباجي: وإجماع السلف الصالح حجة عليهم، وقال ابن بزيزه: وهو مذهب باطل، فقد نهت الشريعة عن الخوض في علم النجوم؛ لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولا ظن غالب، مع أنه لو ارتبط الأمر بها لضاق؛ إذ

لا يعرفها إلا القليل. (فتح الباري ٤/١٢٧)

علامہ ابنِ رُشد مالکیؒ فرماتے ہیں: فإن العلماء أجمعوا على أن الشهر العربي يكون تسعاً وعشرين ويكون ثلاثين وعلى أن الاعتبار في تحديد شهر رمضان إنما هو الرؤية. (بداية المجتهد ١/٢٠٧)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: واختلف العلماء في معنى ﴿فاقدروا له﴾ فقالت طائفة من العلماء: معناه ضيقوا له وقدروه تحت السحاب، وممن قال بهذا أحمد بن حنبل وغيره، ممن يجوّز صوم يوم ليلة الغيم عن رمضان كما سنذكره إن شاء الله تعالىٰ، وقال ابن سريج وجماعة منهم مطرف بن عبدالله وابن قتيبة وآخرون: معناه قدروه بحساب المنازل، وذهب مالك والشافعي وأبو حنيفة وجمهور السلف والخلف إلىٰ أن معناه: قدروا له تمام العدد ثلاثين يوماً ...... قال المازري حمل جمهور الفقهاء قوله ﷺ: "فاقدروا له" علىٰ أن المراد إكمال العدة ثلاثين، كما فسره في حديث آخر. قالوا: ولا يجوز أن يكون المراد حساب المنجمين؛ لأن الناس لو كلفوا به ضاق عليهم؛ لأنه لايعرفه إلا أفراد، والشرع إنما يعرف الناس بما يعرفه جماهيرهم. (نووي شرح مسلم ١/٣٤٧)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ "أوجز المسالك شرح مؤطا إمام مالك" **میں تحریر فرماتے ہیں**: والثالث: معناه قدروه بحسب المنازل، قاله أبوالعباس ابن سريج من الشافعية، ومطرف بن عبدالله من التابعين، وابن قتيبة من المحدثين، قال ابن عبدالبر: لا يصح عن مطرف، وأما ابن قتيبة فليس هو ممن يعرج إليه في مثل هذا ...... قال الباجي: وذكر الداودي أنه قيل في معنىٰ

قوله "فاقدروا له" أي قدروا المنازل، وهذا لانعلم أحداً قال به إلا بعض أصحاب الشافعي، أنه يعتبر في ذلك بقو ل المنجمين، والإجماع حجة عليه. (أوجز ٥/١٦)

ملاعلی قاریؒ شرحِ مشکوۃ میں فرماتے ہیں: وفي شرح السنة قال ابن سريج: "فاقدروا" خطاب لمن خصه اللّٰه بهذا العلم، وقوله: "فاكملوا العدة" خطاب للعامة. اه. وهو مردود لحديث: "إنا أمة أمية، لانكتب ولانحسب" فانه يدل علىٰ أن معرفة الشهر ليست إلى الكتاب والحساب كما يزعمه أهل النجوم، وللاجماعِ على عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا على أنه يرى، ولقوله تعالى مخاطباً لخير أمة: ﴿أخرجت للناس﴾ خطاباً عاماً، ﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾، ولقوله ﷺ بالخطاب العام: "صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته"؛ ولما في نفس هذا الحديث "لاتصوموا حتىٰ تروه" ولما في حديث أبي داؤد والترمذي عن أبي هريرة أنه عليه الصلوٰة والسلام قال: "الصوم يوم يصومون، والفطر يوم يفطرون؛ بل أقول: لو صام المنجم عن رمضان قبل رؤيته بناءً على معرفته يكون عاصياً في صومه، ولا يحسب عن صومه إلا إذا ثبت الهلال على خلاف فيه، ولو جعل عيدالفطر بناءً على زعمه الفاسد يكون فاسقاً، وتجب عليه الكفارة في قول وهو الصحيح، وإن استحل افطاره فرضاً عن عده واجباً صار كافرا. (مرقاة٤/٢٤٢جديد)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله: لا عبرة بقول الموقتين) أي في وجوب الصوم على الناس؛ بل في "المعراج": لا يعتبر قولهم بالإجماع، ولايجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه. وفي "النهر": فلايلزم بقول الموقتين أنه أي

الهلال يكون في السماء ليلة كذا وإن كانوا عدولاً في الصحيح، كما في الايضاح. (شامي ٢/ ١٠٠)

اِن تمام عباراتِ منقولۂ بالا سے یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ، رویتِ ہلال کے معاملہ میں حساباتِ ریاضیہ اور آلاتِ رصدیہ کا اعتبار نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے، بعض شافعیہ حساب کے معتبر ہونے کے قائل ہیں؛ لیکن خود اُن کے ہم مسلک مشائخ نے اُن کا رد کیا ہے۔ علامہ شامیؒ نے اپنے رسالہ "تنبيه الغافل والوسنان على أحكام هلال رمضان" میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اِس مسئلہ پر کلام فرمایا ہے، جس میں مذاہبِ اربعہ کی کتبِ معتبرہ کی نقول پیش فرما کر اِس کا اجماعی ہونا ثابت فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: رسائل ابنِ عابدین ۱/ ۲۴۶ تا ۲۴۹۔

عمومی طور پر جب یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ حساباتِ ریاضیہ کا اِس معاملہ میں اعتبار نہیں، تو اِس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اِس کا اعتبار جس طرح وجوبِ صوم میں نہیں کیا گیا اِسی طرح اگر ثقہ اور عادل گواہوں نے اِس بات کی گواہی دی کہ: ہم نے چاند دیکھا ہے، اور حساباتِ ریاضیہ کے اعتبار سے اُس روز رویت کا امکان نہیں، تو اِس صورت میں بھی محض حساباتِ ریاضیہ کی وجہ سے اِن شاہدوں کی شہادت کو رد نہیں کیا جائے گا؛ لیکن چونکہ عام طور پر حضراتِ مصنفین جہاں حساباتِ ریاضیہ کے عدمِ اعتبار کو بیان فرماتے ہیں، وہاں بطورِ مثال پہلی صورت تحریر فرماتے ہیں، کہ اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا اور منجمین واہلِ ہیئت یہ بتلاتے ہیں کہ: چاند موجود ہے، تو محض اُن کی بات پر روزہ واجب نہ ہوگا؛ (بلکہ ملا علی قاریؒ کی عبارت میں تو یہاں تک ہے کہ: کسی حساب داں نے محض اپنے حساب کی بنیاد پر بلا رویتِ شرعی روزہ رکھا تو وہ گنہگار ہوگا، اور اِسی بنیاد پر

عید الفطر منائی تو فاسق ہوگا، اور افطار کو وجوبی طور پر حلال سمجھا تو کافر قرار دیا جائے گا) اِس سے شاید یہ غلط فہمی ہو کہ دوسری صورت میں یعنی جب کہ حساباتِ ریاضیہ سے رُویت کا عدمِ امکان ثابت ہوتا ہو، اور شرعی شہادت رُویت کی میسر ہوجائے تو وہ رد کردی جائے گی؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ علامہ شامیؒ نے جہاں علامہ سبکی شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اہلِ حساب کے قول کا اعتبار کیا جائے گا؛ اِس لیے کہ حساب قطعی چیز ہے'' وہیں اُنہوں نے اِس کی صراحت فرمائی ہے کہ: علامہ سبکیؒ کے اِس قول کی خود اُن کے ہم مسلک مشائخ نے تردید فرمائی ہے، اِس موقع پر جو عبارات مشائخِ شافعیہ کی نقل فرمائی ہیں، اُس میں اِس دوسری صورت کی صراحت موجود ہے، اور اِس میں صاف صاف لکھا ہے کہ: اہلِ حساب کے قول کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ شہادت پر ہی عمل ہوگا؛ اِس لیے کہ شارع نے شہادت کو یقین کا قائم مقام قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو:

وللإمام السبكي الشافعي تاليف، مال فيه إلى اعتماد قولهم؛ لأن الحساب قطعي. اه. ومثله في شرح الوهبانية، قلت: ما قاله السبكي رده متأخرو أهل مذهبه، منهم: ابن حجر والرملي في شرح المنهاج، وفي فتاوى الشهاب الرملي الكبير الشافعي سئل عن قول السبكي: لو شهدت بينة برؤية الهلال ليلة الثلاثين من الشهر وقال الحساب بعدم إمكان الروية تلك الليلة عمل بقول أهل الحساب؛ لأن الحساب قطعي والشهادة ظنية، وأطال في ذلك، فهل يعمل بما قاله أم لا؟ وفيما إذا رؤى الهلال نهاراً قبل طلوع الشمس يوم التاسع والعشرين من الشهر وشهدت بينة برؤية الهلال رمضان ليلة الثلاثين من شعبان فهل تقبل الشهادة أم لا؟ لأن الهلال إذا كان الشهر كاملاً يغيب ليلتين، أو ناقصاً يغيب

ليلة، أو غاب الهلال الليلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء؛ لأنه ﷺ كان يصلي العشاء لسقوط القمر الثالثة، هل يعمل بالشهادة أم لا؟ فاجاب: بأن المعمول به في المسائل الثلاث ما شهدت به البينة؛ لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين، وما قاله السبكي مردود، ردّه عليه جماعة من المتأخرين، وليس في العمل بالبينة مخالفة لصلاته ﷺ، ووجه ما قلناه أن الشارع لم يعتمد الحساب؛ بل ألغاه بالكلية بقوله: "نحن أمة أمية، لانكتب ولانحسب، الشهر هكذا وهكذا"، وقال ابن دقيق العيد: الحساب لايجوز الاعتماد عليه في الصلاة، انتهى. والأحتمالات التي ذكرها السبكي بقوله: "ولأن الشاهد قد يشتبه عليه" الخ لا أثر لها شرعاً؛ لإمكان وجودها في غيرها من الشهادات. اه (رد المحتار على الدر المختار ٢/١٠٠)

اِس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر رَصدگاہ والے یہ اعلان کریں کہ: فلاں روز رویت ممکن نہیں، اورشہادتِ شرعیہ سے اُس روز رویت ثابت ہوجائے تو شہادت پر ہی عمل ہوگا، محض رَصدگاہ کی تحقیق وحساب کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جاسکتی، ہاں! یہ ضرور ہے کہ اِس شہادت کو ماننے کی وجہ سے مہینہ ۲۹ر سے کم کا لازم نہ آتا ہو، اِس لیے کہ اگر مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم آتا ہے تو وہ دن محلِ شہادت ہی نہیں۔ لقوله عليه الصلوة والسلام: الشهر هكذا وهكذا، وعقد الإبهام في الثالثة، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا، يعني تمام الثلاثين، يعني مرة تسعاًوعشرين ومرة ثلاثين. (متفق عليه)

اِس جگہ اُن حضرات کو جو حساب کے قطعی ہونے کے قائل ہیں بڑا اشکال یہ پیش آتا ہے کہ: جب آیتِ قرآنی سے شمس وقمر کا ایک حساب سے جاری ہونا ثابت ہے تو پھر ہم حساب کی قطعیت کی بنیاد پر شہادت کو کیوں رَد نہ کریں؟ کیا اِن آیاتِ قرآنی سے

صَرفِ نظر کرلیا جائے؟ تو اُن حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ: جو بات قرآن مجید سے ثابت ہے وہ تو صرف اِتنی ہے کہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ شمس وقمر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حساب مقرر فرمایا ہے، اور یہ دونوں اُس حساب سے سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتے؛ لیکن اِس حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہلِ ہیئت وریاضی جس حساب کے دعویدار ہیں وہی مراد ہو۔ اور اگر مان بھی لیں کہ وہی حساب مراد ہے تب بھی یہ دعویٰ کہ وہ حساب قطعی ہے، محلِ نظر ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: خود اِن فنی معلومات کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ، اگرچہ حساب بحیثیتِ حساب کے قطعی ہو کہ دو اور دو چار ہی ہو سکتے ہیں، تین یا پانچ نہیں ہو سکتے؛ لیکن اِن دو کا دو ہونا یہ ہماری نظر اور اندازے وتخمینہ ہی کا حکم ہوسکتا ہے، کتنے ہی باریک سے باریک پیمانوں سے تولا اور پرکھا جائے یہ احتمال ختم کرنا ہماری قدرت میں نہیں کہ ہم نے جس کو دو سمجھا ہے وہ دو سے کسی قدر کم یا زیادہ ہو، خواہ یہ کمی یا زیادتی ایک بال کے ہزارویں حصہ کے برابر ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زمین کے فرش پر کسی زاویہ میں ایک بال کے ہزارویں حصہ کی کمی یا زیادتی اگرچہ بالکل غیر محسوس زیادتی ہے؛ مگر اوپر کی فضاء اور سیاروں تک جب اِس زاویہ کے خطوط ملائے جائیں گے تو میلوں کا فرق ہوجائے گا۔ ''مذہب اور سائنس'' کتاب میں گارڈن بلیف کا ایک اقتباس لیا ہے، جس میں صراحت ہے کہ: چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے، سورج قریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ (ص:۶۹) ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ، مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے، اِس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ (ص:۷۱) ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اِتنی دور

ہے کہ اُس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں، حالاں کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔ (ص:۲۷) اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ کیمرہ کی طرح ترقی یافتہ آلات جھوٹ نہیں بولتے؛ مگر اِن آلات کو واقعات پر منطبق کرنا تو بہر حال انسانی نظر اور انسانی عمل ہے، اِس میں غیر محسوس فرق ہو جانا کسی وقت بھی مستبعد نہیں؛ بلکہ واقع ہے، جس کا مشاہدہ ہمیشہ اہلِ فن کے باہمی اختلافات سے ہوتا رہتا ہے، دنیا میں جتنی جدید اور قدیم تقویمیں اور جنتریاں اور کیلنڈر وجود میں آئے ہیں اُن میں سے صرف اُن کو لیا جائے جو مسلم ماہرینِ فن نے تیار کیے ہیں، تو اُن میں بھی باہمی اختلاف نظر آتا ہے، اگر اُن حسابات اور آلات کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے تو ماہرینِ فن کے اختلافِ رائے کا کوئی احتمال نہ رہتا، سائنس کی نئی ترقیات اور فنِ ریاضی وفلکیات کی جدید ترقیات کا آج کی دنیا میں بڑا ہنگامہ ہے، اور اِس میں شبہ نہیں کہ بہت سی نئی تحقیقات نے پرانے فلسفہ اور ریاضی کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں اور اِس کے خلاف مشاہدہ کرادیا؛ لیکن اِس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آج ایک محقق ماہر نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرفِ آخر ہے، اِس کی تغلیط آئندہ کوئی نہیں کرسکے گا، آئندہ کو چھوڑ کر اِسی موجودہ دور میں اِسی درجہ کے دوسرے ماہرین اُس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ (رویتِ ہلال ص:۳۸/۳۹)

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: اِتنی بات اِس اختلاف میں سب کے لیے واضح ہوگئی کہ اِن قواعد وآلات سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی اور یقینی کہنا محض خوش گمانی ہے، صحیح یہ ہے کہ اِس میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں، چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہرِ نجوم وفلکیات ابوریحان البیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدتِ دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے، اور اِن فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے، اِس نئی روشنی

اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اُس کی امامت سب کے نزدیک مسلَّم ہے، روسی ماہرین نے اُس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے، اُن کی مشہور کتاب ”الآثار الباقية عن القرون الخالية“ ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اُس میں اِن آلاتِ رصدیہ کے اِن نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرینِ فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے، اُس کے الفاظ یہ ہیں:

إن علماء الهيئة مجمعون على أن المقادير المفروضة في أواخر أعمال رؤية الهلال هي إبعاد لم يوقف عليها إلا بالتجربة، وللمناظر أحوال هندسية يتفاوت لأجلها المحسوس بالبصر في العظم والصغر، وفي ما إذا تاملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال أو امتناعها. (الآثار الباقية، ص: ۱۹۸، طبع ليزك ۱۹۲۳ء)

علمائے ریاضی وہیئت اِس پر متفق ہیں کہ رویتِ ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں، وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، اور فضائی وفلکی حالات ایسے ہیں کہ اُن میں جو بھی ذرا غور کرے گا تو رویتِ ہلال کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کرسکے گا۔

اور ”کشف الظنون“ میں بحوالہ زیچ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ یہی لکھا ہے کہ: اِن معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ (کشف الظنون ۲/ ۹۶۹، رویتِ ہلال، ص: ۴۱/ ۴۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ رَصد گاہوں اور آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رُویتِ ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلاسکتی؛ بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے تو اُس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اَور بھی تائید ہوگئی جو رسولِ امی ﷺ نے اِس معاملہ میں اختیار فرمایا، کہ اِن کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو اُلجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رویت ہونے نہ ہونے پر احکامِ شرعیہ کا مدار رکھ دیا، جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کرسکے۔ (رویتِ ہلال،ص:۴۲)

شہادت کے لیے جب ایک ضابطہ شریعت نے مقرر فرمایا تو اُس میں مزید قیود کا اضافہ دلیلِ شرعی کے بغیر ممکن نہیں۔ ''وہ شہادت اہلِ ہیئت کے قطعی حساب کے خلاف نہ ہو'' یہ ایک ایسی قید ہے جس کا کوئی شرعی ماخذ نہیں۔ پھر حساب کو قطعی کہنا خود بلا دلیل اور اہلِ ہیئت کی تصریحات کے خلاف ہے، جو حضرات قطعیتِ حساب کے دعویدار ہیں اُن کے غور وفکر کے لیے دو واقعے پیش کررہا ہوں:

دو واقعے

(۱): علمائے امت کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد محض تحری وتخمینہ سے قائم کی گئی ہیں؛ لیکن مسجدِ نبوی کی سمت بطورِ وحی ومکاشفہ قائم کی گئی ہے، حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے سامنے بیت اللہ کو بطورِ معجزہ کردیا تھا، اُس کو دیکھ کر آپ نے مسجدِ مدینہ کی بنیاد رکھی۔

''بحرالرائق'' میں ہے: نقل عن أبي بكر الرازي في محراب المدينة أنه مقطوع به، فإنه إنما نصبه رسول الله ﷺ بالوحي. (۳۰۳/۱)

''درمختار'' میں ہے: وكذا المدني لثبوت قبلتها بالوحي. (در مختار على هامش الشامي ۳۱۵/۱) اِس لیے باجماعِ امت مسجدِ نبوی کی سمت بالکل یقینی ہے؛ لیکن

حساباتِ ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اتری؛ چنانچہ امیرِ مصر احمد ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا، تو چند ماہرینِ ھندسہ کو مدینہ منورہ بھیج کر پہلے مسجدِ نبوی کی سمتِ قبلہ کو آلاتِ ریاضیہ سے جانچا، تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خط سمتِ قبلہ سے مسجد نبوی کی سمتِ قبلہ دس درجہ مائل بجنوب ہے، جیسا کہ علامہ مقریزی نے ''کتاب الخطط'' ۲/۲۵۶ میں بالفاظِ ذیل اس کا ذکر کیا ہے:

إن أحمد ابن طولون لما عزم على بناء هذا المسجد بعث إلى محراب رسول الله ﷺ من أخذ سمته، فإذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج إلى جهة الجنوب.

اب جو لوگ آلاتِ رصدیہ پر مدار رکھتے ہیں اور اِس پر فخر کرتے ہیں، وہ دیکھیں کہ اُن کی تجویز پر تو مسجدِ نبوی کی سمتِ قبلہ بھی پوری نہیں اُترتی، اگرچہ موجودہ زمانہ کے آلات کے مطابق مسجدِ نبوی کی سمت، قبلہ کے عین مطابق ہے؛ لیکن اِس سے اِتنا تو معلوم ہوا کہ آلات پر مدار رکھنا اور اصولِ شرع کو محض آلاتِ رصدیہ کی وجہ سے چھوڑنا غلط طریقہ ہے۔

(۲): نبیٔ کریم ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اُس کی نماز بھی پڑھی اور پڑھائی تھی۔ ''بخاری شریف'' اور دیگر کتبِ حدیث میں اِس کی صراحت موجود ہے کہ، سورج گرہن کا یہ واقعہ اُس روز پیش آیا تھا جس روز آپ ﷺ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ اِس موقع پر علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اکثر اہل سِیر کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات دس چاند کو ہوئی تھی، دو قول اَور بھی ذکر کیے ہیں جن میں ایک چار چاند کا اور دوسرا چودہ کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(قوله: يوم مات ابراهيم) يعني ابن النبي ﷺ، وقد ذكر جمهور أهل السير أنه

مات في السنة العاشرة من الهجرة، فقيل: في ربيع الاول، وقيل: في رمضان، وقيل: في ذي الحجة، والأكثر على أنها وقعت في عاشر الشهر، وقيل: في رابعه، وقيل: في رابع عشرة. (فتح الباري ۲/ ۴۲۳)

چنانچہ خود حافظ ابن حجرؒ نے اپنی دوسری تصنیف "الإصابة" **۱/۹۳ میں اور علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے** "الاستيعاب على هامش الإصابة" (۱/۴۳) **میں بھی دس چاند والا قول نقل فرمایا ہے۔**

ملا علی قاریؒ نے ''مرقات شرحِ مشکوۃ'' میں حافظ کے حوالہ سے اِسی کو ذکر کیا ہے: قال ابن حجر: وكان ذلك يوم عاشر الشهر، كماقاله بعض الحفاظ.

(مرقات ۲/۲۷۵)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے "أوجز المسالك" **میں اِس کو ''شرحِ احیاء'' اور ''تاریخ الخمیس'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:**

قلت: وذكره في تاريخ الخميس في السنة السادسة، فقال: وفي هذه السنة كسفت الشمس أول مرة قبل الكسوف الذي كان فيه موت إبراهيم، كذا في الوفاء، ثم ذكر في السنة العاشرة، فقال: وفي هذه السنة يوم الثلثاء لعشر ليال خلون من ربيع الأول توفى إبراهيم بن رسول اللهﷺ وانكسفت الشمس يوم مات، فقال الناس: إنما كسفت لموت ابراهيم، قيل: إن الغالب أن الكسوف يكون يوم الثامن والعشرين أو التاسع والعشرين وانكسفت في العاشر، فقالوا: إنها كسفت لموته، انتهىٰ. (أوجز المسالك ۴/۲۵)

اہلِ ہیئت کے نزدیک یہ بات اصولِ مسلمہ میں سے ہے کہ سورج گرہن قمری

مہینہ کی آخری تاریخوں (۲۷/۲۸/۲۹) میں ہوتا ہے، اور یہاں حدیث میں تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز سورج گرہن ہوا، اور اکثر اہلِ سیر یہ فرماتے ہیں کہ: اِن کی وفات دس چاند کو ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دس چاند کو سورج گرہن ہوا، اب اگر اہلِ ہیئت سے اِس سلسلہ میں دریافت کیا جائے تو وہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ: یہ ناممکن اور محال ہے؛ لیکن علمائے کرام اور محدثینِ عظام اِسی واقعہ کو اُن کی تردید کے لیے پیش فرماتے ہیں؛ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اِسی موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

وفيه رد على أهل الهيئة لأنهم يزعمون أنه لا يقع في الأوقات المذكورة، وقد فرض الشافعي وقوع العيد والكسوف معاً، واعترضه بعض من اعتمد على قول أهل الهيئة، وانتدب أصحاب الشافعي لدفع قول المعترض فأصابوا. (فتح الباري ۲/۴۲۳)

دیکھیے حافظ نے اِس موقع پر اہلِ ہیئت کی تردید فرمائی ہے؛ (بلکہ اُن کی اِس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ عید اور کسوف دونوں جمع ہوجائیں، اور اہلِ ہیئت کی بات کا اعتبار کرنے والوں کی طرف سے امام پر جو اعتراض وارد کیا گیا اُس کا اصحابِ شوافع نے جواب دیا، اور اُن کے اِس جواب کی خود حافظ ”فأصابوا“ فرما کر تصویب وتائید کررہے ہیں)۔

ملا علی قاریؒ بھی شرح مشکوۃ میں یہی بات فرماتے ہیں:

وفيه رد لقول أهل الهيئة: لايمكن كسوفها في غير يوم السابع أو الثامن أو التاسع والعشرين؛ إلا أن يريد أن ذلك باعتبار العادة وهذا خارق لها. (مرقاة ۲/ ۲۷۵)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ”اوجز“ میں اِس مسئلہ پر مستقل

بحث فرمائی ہے:

والسادس فيما قال أهل الهيئة: أن الكسوف لايكون إلا في الثامن والعشرين أوالتاسع والعشرين، وقد ورد عند أهل التاريخ وقوعهما في الأوقات المختلفة، وورد أن الشمس كسفت عند شهادة الإمام حسين في العاشوراء، وتقدم عن العيني راداً على أهل الهيئة أنه لو كان الكسوف لوقوعه في ظل الأرض في وقت لكان ذلك الوقت محدوداً معلوماً؛ لان المجرى منهما محدود معلوم، فلما كان تأتي في الأوقات المختلفة والجرى واحد و الحساب واحد علم قطعاً فساد قولهم، انتهى. (أوجز المسالك ٤/٥ ٢)

اِس لیے رویتِ ہلال کی شہادت بھی محض اِس وجہ سے رد نہیں کی جاسکتی کہ رَصدگاہ والے اُس روز رویت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔

(ج): مطلع کا صاف یا گردآلود ہونا حِسّی چیز ہے، جس کا فیصلہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، اِس کے لیے محکمۂ موسمیات کی مدد لینا سمجھ میں نہیں آتا۔ رہا رویت کے امکان وعدمِ امکان کا سوال، تو جب اِس سلسلہ میں اُن کی بات کا شرعاً اعتبار ہی نہیں تو پوچھنے سے کیا حاصل؟

(د): اگر ہلالِ رمضان میں خبرِ واحد عادل پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ کا حکم دیا گیا اور تیس روزے پورے ہوجانے کے بعد بھی رویت ہلال نہ ہوئی، تو بحالتِ صحو عید کرنا جائز نہیں، اور بحالتِ علت عید کرنا جائز ہے۔

إذا صاموا بشهادة الواحد وأكملوا ثلاثين يوماً ولم يروا هلال شوال لا يفطرون فيما روى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالى للأحتياط، وعن محمد رحمه الله تعالى أنهم يفطرون، كذا في التبيين، وفي غاية البيان:

قـول مـحـمـد أصـح، كـذا فـي النهر الفائق، وقال شمس الأئمة الـحلواني: هذا الاختـلاف فيـمـا إذا لـم يـروا هـلال شـوال والسماء مصحية، فأما إذا كانت متغيمة فإنهم يفطرون بلا خلاف، كذا فى الذخيرة. (عالمگيري ۱/۱۹۸)

(و) لـو صاموا (بقول عدل) حيث يجوز و غم هلال الفطر (لا) يحل على المذهب، خلافاً لمحمد، كذا ذكره المصنف؛ لكن نقل ابن الكمال عن الذخيرة: أنـه إن غـم هـلال الفطر حل اتفاقاً. وفي الزيلعي: الأشبه إن غم حل وإلا لا. (در مختار)

وفـي الشـامية: (قـولـه: وفي الزيلعي إلخ) نقله لبيان فائدة لم تعلم من كـلام الـذخيـرة، وهـي تـرجيـح عـدم حل الفطر إن لم يغم شوال، لظهور غلط الشاهد؛ لأنـه الأشبه من ألفاظ الترجيح، لكنه مخالف لما علمته من تصحيح غـاية البيـان لقول محمد بالحل، نعم! حمل في الإمداد ما في غاية البيان على قـول مـحـمـد بـالـحـل إذا غـم شـوال، بـنـاء على تحقق الخلاف الذي نقله الـمـصـنف، وقـد علمت عدمه، وحينئذ فما في غاية البيان في غير محله؛ لأنه ترجيح لما هو متفق عليه، تأمل. (شامي ۲/۱۰۳)

(قـولـه: وهـي تـرجيـح عـدم حل الفطر إن لـم يغم الخ) هو وإن أشعر بـالتـرجيـح يشـعـر بـالخلاف في المسئلة على خلاف عبارة الذخيرة، وعبارة مـجمع الروايات المنقولة في السندي تشهد بالخلاف أيضاً، حيث قال: وفي الإمداد عن مجمع الروايات عن الزاهدى: لو قبل الإمام شهادة الواحد وأتموا ثلاثين، ثم غم عليهم هلال شوال، قال الإمام والثاني: يصومون من الغد، وقال

محـمد: يفطرون، وقال شمس الأئمة الحلواني: الخلاف فيما إذا لم ير هلال شـوال والسـماء مصحية، فإن كانت متغيمة يفطرون بلاخلاف. اه. والأظهر أن مـا نـقله عن الزيلعي إنما ذكره لبيان أن ما ذكره عن المصنف من تصحيح عدم الحل صحح الزيلعي خلافه، وإن ما حكاه ابن الكمال من الاتفاق حكى الزيلعى ما يدل على الخلاف. (تقريرات الرافعي ١/١٤٦، ١٤٧)

نوٹ: اِس مسئلہ میں علمائے پاکستان نے اُسی پر اتفاق فرمایا ہے جو احقر نے جواب میں لکھا ہے، اِن اتفاق کرنے والوں میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ بھی شامل ہیں۔

علامہ شامیؒ اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں: ثـم اعـلـم! أنـه إذا تـم عـدد رمـضان ثلاثين بشهادة فرد ولم ير هلال الفطر والسماء مصحية لايحل الفطر اتـفاقاً؛ لظهور غلط الشاهد ويعزر. ...... ولاخلاف في حل الفطر إذا تم العدد وكـان بـالسماء علة ليلة الفطر وإن ثبت رمضان بشهادة الفرد، كما حرره في إمداد الفتاح. (رسائل ابن عابدين ١/٢٣٦)

(۳):(الف) مطلع صاف ہونے کی صورت میں جمعِ عظیم کی رویت شرط ہے؛ البتہ صاحبِ بحر الرائق علامہ ابن نجیمؒ کے بقول دو کی گواہی سے بھی کام چل جائے گا، اور اگر خارجِ مصر یا بلند مقام سے دیکھنے والا ایک بھی ہو تو اُس کی شہادت سے ثبوت ہو جائے گا۔ علامہ شامیؒ اپنے رسالہ "تـنبيـه الـغـافـل والوسنان" **میں اِس مسئلہ پر تفصیلی بحث فرمانے کے بعد آخر میں خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:** حـاصـل مـامـر فيمـا يتوقف عليـه وجـوب الصوم عندنا رؤية الهلال من عدل أو مستور لو في السماء علة، وإلا

فجمع عظيم أو اثنان على ما اختاره في البحر في زماننا، أو واحد عدل إذا جاء من خارج المصر أو من مكان عال. (رسائل ابن عابدين ۱/ ۲۳۸)

فاسق کے صدق کا اگر ظنِ غالب ہو تو اُس کی شہادت قبول کرنا جائز ہے۔

درمختار میں ہے: (فلو قضى بشهادة فاسق نفذ) وأثم. فتح (در مختار)

علامہ شامیؒ اِس پر تحریر فرماتے ہیں: (قوله: بشهادة فاسق نفذ) قال في جامع الفتاوى: وأما شهادة الفاسق فإن تحرى القاضي الصدق في شهادته تقبل، وإلا فلا. اه. فقال: وفي الفتاوى القاعدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه، وهو مما يحفظ، درر، أول كتاب القضاء. وظاهر قوله: وهو مما يحفظ اعتماده. اه (شامي ٤/ ٤١٣، ٤١٤)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ''کیونکہ اگر فاسق کی شہادت کو مطلقاً رد کرنا قرار دیا جائے تو ساری دنیا کا نظام مختل ہو جائے، کیونکہ معاملات کے لیے قابل قبول شہادت ہزار میں ایک بھی میسر آنا مشکل ہو جائے گا، ہاں! یہ ظاہر ہے کہ قاضی کے لیے غلبۂ ظن بصدقِ مخبر ضروری ہے، جو فاسق اِس درجہ میں نہ ہو اُس کی شہادت رد کی جائے گی؛ ورنہ قبول کرنا چاہیے؛ تاکہ حقوق ضائع نہ ہو جائیں۔

"معین الحکام" میں "باب الثاني والعشرين" میں اِس مسئلہ پر مفصل کلام کر کے اِس کو ترجیح دی ہے:

(مسئله): قال القرافي في باب السياسة: نص بعض العلماء على أنا لم نجد في جهة إلا غير العدول أقمنا أصلحهم وأقلهم فجوراً للشهادة عليهم، ويلزم ذلك في القضاة وغيرهم؛ لئلا تضيع المصالح، قال: وما أظن أحداً يخالف في هذا؛ فإن التكليف شرط في الإمكان، وهذا كله للضرورة؛ لئلا تهدر الأقوال

وتضيع الحقوق، قال بعضهم: وإذا كان الناس فساقاً إلا القليل النادر قبلت شهادة بعضهم على بعض، ويحكم بشهادة الأمثل فالأمثل من الفساق، هذا هو الصواب الذي عليه العمل وإن أنكره كثير من الفقهاء بألسنتهم، كما أن العمل على صحة ولاية الفاسق ونفوذ أحكامه وإن أنكروه بألسنتهم، وكذلك العمل على صحة كون الفاسق وليا في النكاح ووصياً في المال، وهذا يؤيد ما نقله القرافي: وإذا غلب على الظن صدق الفاسق قبلت شهادته وحكم بها، والله تعالى لم يأمر برد خبر الفاسق، فلايجوز رده مطلقاً؛ بل يتثبت فيه حتى يتبين صدقه من كذبه، فيعمل على ما تبين وفسقه عليه. (معين الحكام، ص ١٤٥)

در بابِ رویتِ ہلالِ رمضان مستور الحال کی شہادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ (كما مر في عبارة العلامة الشامي)

(ب) حاکم مسلم نہ ہونے کی صورت میں تمام شرائطِ شہادت ساقط نہ ہوں گی؛ بلکہ ممکنہ شروط کا اعتبار ضروری ہے۔

ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة، وأفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة. (در مختار مع الشامي ٢/٩٩، ١٠٠)

اِس میں عدد کی صراحت ہے، جو شروط شہادت میں سے ہے۔

''بحر الرائق'' میں ہے: فيشترط فيه ما يشترط في سائر حقوقهم، من العدالة، والحرية، والعدد، وعدم الحد في القذف، ولفظ الشهادة، والدعوى على خلاف فيه إن أمكن ذلك ؛ وإلا فقد تقدم أنهم لو كانوا في بلدة لا قاضي فيها ولا وال فإن الناس يصومون بقول الثقة، ويفطرون بإخبار عدلين للضرورة. (٢٨٧/٢)

اِس میں خط کشیدہ الفاظ "إن أمــكــن ذلك" سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکنہ شروط کی رعایت ضروری ہے۔

(ج): اگر ثبوتِ رؤیت اُن کی شہادت پر موقوف ہے تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر شہادت دیں۔

ويـجـب عـلـى الـجارية المخدرة أن تخرج في ليلتها بلاإذن مولاها وتشهد، كـما في الحافظية. (در مختار) (قـولـه: ويجب على الجارية المخدرة) أي التي لاتخالط الرجال، وكذا يجب على الحرة أن تخرج بلاإذن زوجها، وكذا غير المخدرة والمزوجة بالأولى، قال ط: والظاهر أن محل ذلك عند توقف إثبات الرؤية عليها؛ وإلا فلا. (شامي ۲/۹۹)

اگر اِن کی یہ تاخیر اِس لیے ہے کہ مقامی علماء یا چاند کمیٹی تک پہنچنا اُن کے لیے فوری طور پر ممکن نہ تھا، تب تو اُن کی شہادت رَد نہیں کی جائے گی؛ ورنہ رَد کی جاسکتی ہے۔

وعـلـيـه تـفـرع ما لو شهدوا في آخر رمضان برؤية هلاله قبل صومهم بيوم، إن كانوا في المصر ردت لتركهم الحسبة، وإن جاء وا من خارج قبلت. من الفتح ملخصاً. (شامي ۲/۹۹)

نوٹ: آج کل عوام مسلمین میں مسائلِ شریعت سے جہالت و ناواقفیت بھی عام ہے، اگر اُن کی یہ تاخیر اِسی جہالت کی وجہ سے تھی تو اُن کی شہادت رد کی جائے یا نہیں؟ اِس کی صراحت نہیں ملی۔

(۴): (الف، ب) اگر قاضی کا تقرر تمام مسلمین کی تراضی سے عمل میں آیا ہے تو سب کے حق میں واجب العمل ہے۔

(ج) دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے حق میں واجب العمل نہیں ہے، محض خبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(د) اگر اعلان بایں الفاظ ہو کہ: فلاں رویتِ ہلال کمیٹی چاند کا شرعی ثبوت مل جانے کے بعد یہ اعلان کررہی ہے، یا اپنے انتظام سے کرا رہی ہے کہ: رویت شرعاً ثابت ہو چکی ہے، اور یہ کمیٹی جانی پہچانی اور معتبر ہو، اور اُس کے تمام ارکان پابندِ شرع ہوں تو یہ اعلان مقبول اور واجب العمل ہوگا۔

اور اگر اعلان کے طور پر نہیں؛ بلکہ محض خبر کے طور پر نشر کر رہی ہے، اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہو کہ یہ ریڈیو کسی خاص ضابطہ کے تحت ہے، بلا اجازت معتبر خبر شائع نہیں کی جاسکتی، تو ہلالِ رمضان کے اثبات کے لیے کافی ہے، ہلالِ فطر کے اثبات کے لیے کافی نہیں۔

﴿۵﴾: (الف، ب) دیگر قریبی ممالک جہاں مطلع عموماً صاف رہتا ہو اور رویت ہوتی ہو، اُن سے رابطہ قائم فرما کر بطریقِ موجَب ثبوت مہیا کیا جائے۔

(ج) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کی خبریں بھی جب وہ حد تواتر کو پہنچ جائیں تو استفاضہ میں داخل ہیں''۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۲/ ۴۸۷ مطبوعہ کراچی)

تین ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی حصولِ استفاضہ ممکن ہے:

قال الحافظ ابن حجر العسقلاني: والثاني –وهو أول أقسام الآحاد– ما له طرق محصورة بأكثر من اثنين، وهو المشهور عند المحدثين، سمي بذلك لوضوحه، وهو المستفيض على رأى جماعة من أئمة الفقهاء. (شرح نخبة الفكر)

مگر حقیقت یہ ہے کہ استفاضہ کے لیے کوئی عدد متعین نہیں؛ بلکہ جتنی اخبار سے

غلبۂ ظن متحقق ہوجائے وہ خبر مستفیض ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد خانپوری، ٦/ جمادی الأخری ۱۴۱۵ھ

اہلِ برطانیہ کے لیے دربابت رویتِ ہلال مشعلِ راہ

محترم ومکرم مفتی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! امید ہے کہ مزاج سامی بخیر ہوگا۔

دیگر عرض ایں کہ: یہاں برطانیہ میں ''مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی'' کی طرف سے ایک کتاب ''سعودی عرب کی رویت کے اصول شریعت ومفتیان کرام کی نظروں میں''، اِس میں تقریباً ۲۰ مفتیانِ عظام کے حوالہ سے برطانیہ کو چاند کی تاریخوں کے تعیین کے بارے میں سعودیہ کے تابع بنانے کو جائز قرار دیا ہے، اِن مفتیانِ کرام میں آں جناب کا بھی نام ہے، تقریباً چھ سال سے اِس پر عمل ہورہا ہے، اِس کی وجہ سے ہندوستان پاکستان وغیرہ ممالک سے کبھی دو دن کبھی تین دن کا فاصلہ ہورہا ہے، دو دن، تین دن پہلے رمضان المبارک کا آغاز ہورہا ہے، سعودیہ کے مشرقی ومغربی علاقوں میں سعودیہ اور اُن کے متبعین علاقوں کے علاوہ کہیں بھی دنیا بھر میں رویت نہیں ہوتی، مثلاً سعودیہ کے مغربی علاقہ افریقہ، پناما، بارباڈوز وغیرہ؛ حالاں کہ اِن علاقوں میں موسم صاف مطلع اکثر صاف ہوتا ہے۔

دیگر عرض ایں کہ یہاں ہلال کمیٹی صرف مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ دو جگہ فون کرکے فیصلہ کرلیتی ہے، کیا یہ طریقہ تواتر واستفاضہ کی تعریف دو فون پر صادق آتی ہے؟ حکیم الامتؒ نے ''اصلاحِ انقلاب امت'' میں ''رمضان کے متعلق کوتاہیاں'' کے ماتحت لکھا ہے: رویتِ ہلال کی خبر کے بارے میں جب بے احتیاطی ہوتی ہے تو بدونِ ثبوتِ رمضانیت باعتقادِ رمضان

فرض روزہ رکھا جاتا ہے، حالاں کہ یوم شک میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، جب بناء غیر صحیح پر روزہ شروع کیا اور ختم رمضان پر اتفاق سے ابر ہونے کی وجہ سے اکمالِ ثلثین کے قاعدے پر عید کرے گا، اور ممکن ہے وہ تاریخ رمضان کی ہو تو کس قدر سخت بات ہے!۔

آں جناب سے بندہ صرف یہی تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ، سعودیہ کے تابع بن کر مغربی ممالک سے دو دن، تین دن پہلے رمضان کا آغاز اور اختتام کرنا عین اصولِ شریعت پر عمل کرنا ہے؟ اِس بارے میں مفصل جواب تحریر فرما کر ہم طالب علموں کی ہمت افزائی فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

(۲): احسن الفتاویٰ ج ۴ رمیں ''سعودیہ میں رویت کا اعلان پاکستان کے لیے حجت نہیں ہے'' اِس کی فوٹو کاپی ساتھ میں ارسالِ خدمت ہے، اِس جواب کے مطابق برطانیہ کو سعودیہ کے تابع بن کر عمل کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ خلافِ ظاہر ہونے کی وجوہ بیان میں پائی جاتی ہیں، ساتھ اختلافِ مطالع کے بارے میں علامہ شیخ عبداللہ بن محمد کے مضمون کی فوٹو کاپی شیخ بن باز کی، نیز مفتیٔ گجرات مفتی عبدالرحیم لاجپوری مدظلہ کا ماہِ جولائی ۱۹۷۸ء میں ''سفرِ برطانیہ کے درمیان متفقہ فیصلہ'' کی فوٹو کاپی ساتھ میں ارسالِ خدمت ہے۔ آں جناب سے گذارش ہے کہ: اِن سب باتوں کو مدنظر رکھ کر جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

علاقہ برطانیہ میں رویتِ ہلال کا مسئلہ نیا نہیں ہے، ایک مدت سے اہلِ علم اور اربابِ فتویٰ کے درمیان موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، اور یہ حضرات اُس کے حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، قرآنی آیات، حدیثی روایات، فقہی عبارات، اقوالِ مشائخ اور قواعدِ ہیئات سے استنباط اور استشہاد بھی فرماتے ہیں؛ لیکن کسی ایک بات پر اتفاق نہیں ہو پاتا،

اور متفق ہونا بظاہر دشوار ہونے کے ساتھ ضروری بھی نہیں ہے؛ اِس لیے اہلِ علم اور دلائل سے واقف حضرات کے لیے تو دیانۃً یہ ضروری ہے کہ جس دلیل کو قوی اور راجح قرار دیں اُسی پر عمل کریں، اور عوام اپنے علماء کا اتباع کریں، اور اگر اُن میں بھی اختلاف ہو تو جس پر زیادہ اعتماد ہو اُس کا اتباع کریں۔

ایک بات یاد رہے کہ اہلِ علم اپنے اختیار کردہ قول و عمل کو دوسرے اہلِ علم پر زبردستی چپکانے کی کوشش نہ کریں، اور اُن کے قول و عمل کو باطل محض قرار دے کر نزاع پیدا نہ کریں، اور عوام پر لازم ہے کہ اہلِ علم کے اختلاف میں دخل دے کر اِس کو باعثِ نزاع وفساد ہرگز نہ بنائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد خانپوری، ۶/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ

برطانیہ میں دیگر ممالک سے آنے والی چاند کی خبر پر عمل کرنے کی وجہ سے اٹھنے والے چند سوالات کے جوابات

بخدمتِ اقدس حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا، ایک نہایت ہی اہم استفتاء جس میں فوری رہبری کی ضرورت کے پیشِ نظر جناب کی خدمت میں معروض ہے، امید ہے کہ مبارک ماہ کی قیمتی گھڑیوں میں سے تھوڑا وقت نکال کر رہبری سے فوری طور پر نوازیں گے، اللہ رب العزت ہر قسم کی عافیت سے نوازیں۔ آمین

استفتاء:

برطانیہ میں اُفق اور موسم ہمیشہ غبار آلود ہونے کی وجہ سے چاند کی رویت نہ

ہونے کے باعث رمضان وعیدین کی تعیین کے بارے میں ہمیشہ برطانیہ سے باہر کی آمدہ خبروں پر اعتماد کرتے ہوئے علمائے کرام فیصلہ کرتے ہیں۔

اب تک دو مختلف طریقوں سے فیصلہ کیا جاتا تھا، بعض علماء اِس طرح فیصلہ کرتے تھے کہ برطانیہ سے باہر کسی بھی ملک سے ملنے والی رویتِ ہلال کی خبر پر رمضان شروع کر دیا جائے، اور عیدالفطر کے موقع پر بھی جس ملک کی رویت کی خبر پر رمضان شروع کیا ہے اُس کی پابندی کے بغیر وہ یا کسی اَور ملک کی خبر پر عیدالفطر کا تعین کرلیا جائے۔

دوسرے بعض علماء رمضان وعیدین دونوں کے تعین کے لیے برطانیہ سے قریب مسلم ملک مراکش کی رویت کی خبر پر (جہاں ہر ماہ رویتِ ہلال کا باقاعدہ نظم ہے) رمضان وعیدین کا تعین کرتے۔

سالِ رواں علمائے کرام نے نئی صورت یہ تجویز کی کہ، سعودی عرب کی رویتِ ہلال کی خبر پر برطانیہ میں بھی رمضان وعیدین کا تعین کیا جائے۔

مراکش کی رویت پر برطانیہ میں رمضان وعیدین کرنے والے علماء نے اِس سے اِس بنیاد پر اختلاف کیا کہ سعودی عرب کی رویت صحیح نہیں ہوتی، اور اِس بارے میں شواہد و دلائل اور مفتیان کرام کے اقوال پیش کیے۔

مذکورہ دو مختلف صورتوں کی بناء پر ۱۴۰۷ھ سالِ رواں رمضان کی ابتدا میں برطانیہ میں حسبِ ذیل کیفیت پیدا ہوئی: سعودی عرب میں رویتِ ہلال کا اعلان بروز پیر ۲۷/ اپریل ۱۹۸۷ء کی شام کو ہوا، کہ آئندہ کل بروز منگل ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء کو یکم رمضان ہوگی؛ چنانچہ برطانیہ میں بھی اِس کے مطابق یکم رمضان کا اعلان کیا گیا۔

مراکش کی تحقیقِ رویت کے مطابق ۲۷/ اپریل ۱۹۸۷ء کو ۲۸/ شعبان ۱۴۰۷ھ

ہونے کی وجہ سے منگل کو رمضان شروع ہونے کا امکان ہی نہیں تھا، ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز منگل ۲۹/ شعبان کو مراکش میں چاند کی رویت نہ ہوئی، اور ۳۰/ شعبان ۱۴۰۷ھ بروز بدھ ۲۹/ اپریل ۱۹۸۷ء کو برطانیہ میں مختلف شہروں میں سیکڑوں لوگوں نے چاند دیکھا، اور اُنھوں نے بروز جمعرات ۳۰/ اپریل ۱۹۸۷ء سے رمضان شروع کیا، یوں دونوں میں دو دن کا فرق ہوگیا۔

سوال طلب امور

(۱) مقامی رویت ہونے کے بعد باہر کی مقدم آمدہ خبر کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟ بالخصوص جب کہ وہ مشتبہ ہونے کے علاوہ بداہت کے بھی خلاف ہو؛ نیز اِس خبر کی وجہ سے مقامی ماہ ۲۸ دن کا ہوجاتا ہو۔

(۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برطانیہ میں ۳۰ شعبان ۲۹ اپریل کو جو چاند دیکھا گیا وہ دو دن پہلے کا تھا، کیا چاند کے بارے میں اِس طرح قیاس کرنا اور یوں اندازہ کرنا صحیح ہے؟ یا چاند چھوٹا ہو یا بڑا اور بعد غروبِ آفتاب زیادہ دیر اُفق پر رہے یا کم، اُسی رات کا شمار ہوگا جس رات وہ دیکھا گیا؟

(۳) برطانیہ میں ۳۰ شعبان کو چاند کی رویت ہونے کی وجہ سے جنھوں نے سعودی عرب کی خبر پر دو روز مقدم رمضان شروع کیا، اُن کے دو روزے رمضان میں شمار ہوں گے یا نفل شمار ہوں گے؟

(۴) اُن کو رمضان کا اختتام برطانیہ کی مقامی رویت کے مطابق ۲۹ یا ۳۰ روزے شمار کر کے کرنا چاہیے؟ یا سعودی عرب کی خبر کے مطابق عید الفطر مقدم رمضان میں منانی چاہیے؟

(۵) برطانیہ کی آبزرویٹری نے اخبارات میں یہ لکھا تھا کہ: قرانِ شمس وقمر ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء گرینچ وقت کے مطابق رات ایک بج کر ۳۴ منٹ پر ہوگا، اور سعودی معیاری وقت کے مطابق صبح ۴ بج کر ۳۴ منٹ پر ہوگا۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ چاند محاق سے پہلے دنیا میں کہیں بھی نظر نہیں آسکتا، تو سعودی میں وہ محاق سے تقریباً دس گھنٹے پہلے کیسے دیکھا گیا؟ چناں چہ یہ اعلان محالِ عادی ہونے کی وجہ سے کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ کیا علمِ ہیئت کا قاعدہ شریعت کے خلاف ہے؟

(۶) بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عیدالاضحیٰ سعودی عرب میں حج کے دوسرے دن برطانیہ میں منائی جائے، کیا حدیث شریف میں یا شریعتِ مطہرہ میں اِس کی کوئی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں جس دن حج ہو اُس کے دوسرے دن برطانیہ میں عیدالاضحیٰ منائی جائے؟

نوٹ: مسئلہ اہم اِس وجہ سے ہے کہ رمضان مبارک کے اختتام سے پہلے اِس کا جواب ہو؛ تاکہ لوگ اپنے روزوں کے بارے میں صحیح رہبری حاصل کرسکیں، بناء بریں امید کرتا ہوں کہ جناب والا جلد جواب سے نوازیں گے۔ احقر شبیر ٹیلر

SHABBIR TAILOR 3,Kertland Street

Savlle Town WEST Dewsbury

شرعی احکام کی بنیاد سادگی پر ہے

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے چند باتیں تمہیدی طور پر عرض کرتا ہوں، جن سے آپ کے اشکالات بھی انشاء اللہ تعالیٰ دور ہوں گے۔

شریعت کے تمام احکام کی بنیاد یسر وسہولت اور سادگی اور بے تکلفی پر ہے، فلسفیانہ

تدقیقات پر نہیں؛ کیونکہ اِس شریعت کا دائرۂ حکومت تمام عالم کے بحر و بر اور اسود و احمر، شہری و دیہاتی، آبادیوں اور اُن کے سُکّان پر حاوی ہے، اسلامی فرائض نماز، روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں پر عائد ہیں اِسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑوں، درّوں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ، ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اِس درجہ عام ہوں اُن میں مقتضائے عقل وحکمت و رحمت یہی ہے کہ اُن کو تدقیقاتِ فلسفیہ اور قواعدِ ریاضیہ یا آلاتِ رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے؛ تاکہ ہر خاص وعام، خواندہ و ناخواندہ بہ آسانی اپنے فرائض انجام دے سکے، شریعت کے تمام تر احکام اِسی نظریہ کے تحت بالکل آسان اور سادہ طریقہ پر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جن کا تعلق خاص وقت سے ہے، نماز وغیرہ، اِن کے لیے معیار سورج کے طلوع وغروب اور اُس کے استواء و اِنحناء کو بنایا گیا، روزۂ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا، حساباتِ ریاضیہ کا اعتبار نہیں کیا گیا، مہینے قمری رکھے گئے جن کا مدار رویتِ ہلال پر ہے، شمسی مہینوں کو نہیں لیا گیا؛ اِس لیے کہ اِن کا مدار حساباتِ ریاضیہ پر ہے، احکامِ اسلامیہ کے تتبُّع سے بکثرت اِس کے نظائر معلوم کیے جاسکتے ہیں؛ کیوں کہ آلات اور فنی چیزیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں مہیا نہیں ہوسکتیں، اور اُن کا فراہم ہوجانا یقینی نہیں ہوتا، اگر ایسی چیزوں پر احکام کا دار و مدار رکھ دیا جائے تو وہ بہت سے لوگوں بلکہ اکثریت کے لیے ناقابلِ عمل ہوجائیں گے۔

چنانچہ رمضان اور عید کی آمد و رفت کے لیے صحیح احادیث میں وہی فطری اور سادہ اصول بتایا گیا ہے جو اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، کہ فنی چیزوں کی فراہمی، آلاتِ رصدیہ اور علمِ حساب کی احتیاج کے بغیر اِس مسئلہ کو حل کیا جائے؛ اِس لیے یہ حکم دیا گیا: ”صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته، فإن أغمی علیکم فاقدروا له ثلثین“ مطلب یہ

ہے کہ مسلمانوں کو کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ دُوربین و دیگر آلاتِ رصدیہ وقواعدِ حسابیہ سے مدد لینے کی حاجت، بس جب چاند ۲۹ تاریخ کو نظر آجائے تب وہ روزہ رکھنا شروع کردیں (اگر رمضان کا چاند ہے)، اور عید کرلیں (اگر عید کا مہینہ ہے)، اور نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرنے کے بعد اگلا دن اُس کے لیے خود ہی متعین ہے، اب اِس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ چاند دیکھا جائے۔

''بذل المجہود'' میں ہے: فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم في معانـاة حساب التسيير، واستمر الحكم في الصوم، ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك؛ بل ظاهر السياق يشعر بنفي تعليق الحكم بالحساب أصلا، وقد ذهب قوم إلى الرجوع إلى أهل التسيير في ذلك، وهم الروافض. قال الباجی: وإجماع السلف الصالح حجة عليهم، وقال ابن بزيزة: وهو مذهب باطل، فقد نهت الشريعة عن الخوض في علم النجوم؛ لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولاظن غالب، مع أنه لو ارتبط الأمر بها لضاق؛ إذ لايعرفها إلا القليل. (۱۱/ ۱۰۵)

اور پھر مزید یہ آسانی کہ ہر شخص پر چاند دیکھنا لازم نہیں کیا گیا؛ بلکہ بتا دیا گیا کہ اگر دو ایک (عید کے لیے کم سے کم دو) معتبر دین دار مسلمان (بحالتِ ابر وغبار وغیرہ) چاند دیکھ کر گواہی دے دیں تو سب کے لیے کافی ہے، اور محض اِتنی بات سے ہی مہینہ کی آمد ثابت ہوجائے گی؛ لہٰذا اِس کے تقاضے پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

''بذل المجہود'' میں ہے: (فلاتصوموا حتى تروه ولاتفطروا حتى تروه) قال الحافظ: ليس المراد تعليق الصوم بالرؤية في حق كل أحد؛ بل المراد

بـذلك رؤية بـعـضهم، وهو من يثبت به ذلك، أما واحد على رأي الجمهور أو الإثـنان على رأي آخرين، ووافق الحنفية على الأول؛ إلا أنهم خصوا ذلك بما إذا كـان فـي السـمـاء عـلة الـغيم وغيره، وإلا متى كان صحوا لم يقبل إلا من جمع كثير يقع العلم بخبرهم. (۱۱/۱۰٦)

حسابی قواعد اور آلاتِ رصدیہ کا دخل

حسابی قواعد اور علمِ ہیئت کے اصول سے ہلال کا ثبوت مان کر اُس کے مطابق عمل کرنا روحِ شریعت سے میل نہیں کھاتا؛ بلکہ اِس کو نا قابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ: "إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب" الخ **کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ بحوالہٗ طیبی فرماتے ہیں:** قـال الـطيبي: إنا كناية عن جيل العرب، وقوله: "لا نـكـتـب ولا نحسب" بيان لقوله أمّية، وهذا البيان ثم الإشارة باليد ثم القول باللسان ينبهك على أن الاستقصاء في معرفة الشهر لا إلى الكتاب والحساب كـمـا عليه أهل النجامة. اه. فالمعنى أن العمل على ما يعتاده المنجمون ليس مـن هـدينا وسنّتنا؛ بل علمنا يتعلق برؤية الهلال، فإنا نراه مرة تسعا وعشرين و مرة ثلاثين. (مرقات شرح مشكوة ۲/۵۰۳)

آگے چل کر حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: قـــال ابـن حـجـر: وإنما بالغ في البيان بما ذكر مع الإشارة المذكورة ليبطل الرجوع إلى ما عليه الحساب والمنجمون. (مرقات ۲/ ۵۰٤)

جب مدار رویت پر ٹھہرا تو فقہاء نے چاند کے تتبع اور تلاش کو واجب علی الکفایۃ قرار دیا ہے۔

''فتح القدیر'' میں علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں: (قوله: وينبغي للناس) أي يجب عليهم وهو واجب على الكفاية. (فتح القدير ٢/٣١٣)

''مراقی الفلاح شرح نور الایضاح'' میں علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں: يجب كفاية التماس الهلال ليلة الثلاثين من شعبان؛ لأنه قد يكون ناقصا. (مراقي الفلاح على هامش الطحطاوي ٣٥٤) علامہ طحطاویؒ اِس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (يجب) الظاهر منه الافتراض؛ لأنه يتوصل به إلى الفرض، وكذا يجب التماس هلال شوال في غروب التاسع والعشرين من رمضان. (طحطاوی علی المراقی ٣٥٤)

''فتاویٰ عالمگیری'' میں بحوالہ ''الاختیار شرح المختار'' لکھا ہے: يجب أن يلتمس الناس الهلال في التاسع والعشرين من شعبان وقت الغروب، فإن رأوه صاموه، وإن غم أكملوه ثلاثين يوما. (١/١٩٧)

''تبیین الحقائق'' شرحِ کنز الدقائق میں ہے: ويجب التماس الهلال في التاسع والعشرين من شعبان. (١/٣١٧)

اِس پر علامہ شبلیؒ حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله: يجب التماس الهلال الخ) هو واجب على الكفاية. اه. فتح (حاشيه شبلي على الزيلعي شرح الكنز ١/٣١٧)

فقہِ حنفی کے مشہور متن ''مختصر القدوری'' میں ہے: وينبغي للناس أن يلتمسوا الهلال في يوم التاسع والعشرين من شعبان.

اِس کی شرح فرماتے ہوئے علامہ ابوبکر حدادؒ رقم طراز ہیں: أي يجب، وكذا ينبغى أن يلتمسوا هلال شعبان أيضا في حق إتمام العدة. (الجوهرة النيرة ١/١٦٧)

عبارات منقولۂ بالا سے شعبان، رمضان اور شوال تینوں مہینوں کے چاند کی تلاش

اور جستجو کا واجب ہونا معلوم ہوا؛ اس لیے مسلمانوں پر ضروری اور واجب ہے، کہ چاند دیکھنے کی سعی کریں۔ محض اس بنیاد پر کہ کسی جگہ کا مطلع ہمیشہ ابر آلود یا غبار آلود رہتا ہے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی گنجائش نہیں نکلتی، برطانیہ کے رہنے والے اس عذر کو پیش کر کے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، یہ بات الگ ہے کہ باوجود سعی کے مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے؛ لیکن رویت کا انتظام واہتمام کرنا ان پر ضروری ہو جاتا ہے، اور چاند نظر آنے کی صورت میں شہادت دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے، اگر چاند دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ میری شہادت پر ثبوت رویت موقوف ہے تو اس پر شہادت دینا واجب ہو جاتا ہے؛ یہاں تک کہ اگر چاند دیکھنے والی پردہ نشین منکوحہ عورت ہے تب بھی اسی رات گھر سے نکل کر قاضی کے سامنے شہادت پیش کرے، اگر شوہر اجازت نہ دے تو بلا اجازت نکل سکتی ہے۔

''درمختار'' میں ہے: ویجب علی الجارية المخدرة ان تخرج فی ليلتها بلا اذن مولاها وتشهد كما فی الحافظية ......

علامہ شامیؒ اس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: قوله ويجب على الجارية المخدرة ای التی لاتخالط الرجال، وكذا يجب على الحرة ان تخرج بلا اذن زوجها وكذا غير المخدرة والمزوجة بالاولى قال ط: والظاهر ان محل ذلك عند توقف اثبات الرؤية عليها والا فلا. (شامی ۲/۹۹)

اب اگر کسی جگہ باوجود سعی وتتبع کے مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے، تو اس صورت میں دوسری جگہ سے بطریق موجب آئی ہوئی خبر پر عمل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کو ماننے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا لازم نہ آتا ہو۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۱۲۲)

رویت ہلال کے معاملہ میں آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ کے ناقابل اعتبار ہونے کا مسئلہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها، ولم يكونوا يعرفون من ذلك ايضاً الا النزر اليسير، فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم فى معاناة حساب التسيير واستمر الحكم فى الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك بل ظاهر السياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب اصلاً، ويوضحه قوله فى الحديث الماضى: (فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين) ولم يقل فسلوا اهل الحساب والحكمة فيه كون العدد عند الاغماء يستوى فيه المكلفون فيرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم الى الرجوع الى اهل التسيير فى ذلك وهم الروافض، ونقل عن بعض الفقهاء موانقتهم قال الباجى واجماع السلف الصالح حجة عليهم وقال ابن بزيزه وهو مذهب باطل فقد نهت الشريعة عن الخوض فى علم النجوم لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولا ظن غالب مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذلايعرفها الا القليل. (فتح البارى ۱۰۲/۴)

علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں: فان العلماء اجمعوا على ان الشهر العربى يكون تسعاً و عشرين ويكون ثلاثين وعلى ان الاعتبارفى تحديدشهر رمضان انماهوالرؤية. (بداية المجتهد ۲۰۷/۱)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: واختلف العلماء فى معنى ﴿فاقدروا له﴾ فقالت طائفة من العلماء: معناه ضيقوا له وقد روه تحت السحاب، وممن قال بهذا احمد بن حنبلؒ وغيره ممن يجوّز صوم يوم ليلة الغيم عن رمضان كما سنذكره

انشـاء اللّٰہ تعالیٰ، وقال ابن سریج وجماعة منهم مطرف بن عبداللّٰه وابن قتيبة وآخـرون: معناه قدروه بحساب المنازل، وذهب مالكؒ و الشافعیؒ وابو حنيفةؒ وجـمهـور السلف والخلف الیٰ ان معناه قدروا له تمام العدد ثلاثين يوماً ...... قـال الـمـازری حـمل جمهور الفقهاء قوله ﷺ ﴿فـاقـدروا له﴾ علیٰ ان المراد اكـمـال الـعـدة ثـلاثين كما فسره فی حديث آخر، قالوا ولا يجوز ان يكون الـمـراد حساب المنجمين لان الناس لو كلفوا به ضاق عليهم لانه لا يعرفه الا افراد والشرع انما يعرف الناس بما يعرفه جماهير هم. (نووی شرح مسلم ۱/۳٤۷)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ "او جـز الـمسـالك شرح مؤطـا امـام مالك" **میں تحریر فرماتے ہیں:** والثـالـث: مـعـنـاه قـدروه بحسب المنازل، قاله ابو العباس ابن سريج من الشافعية، ومطرف بن عبد اللّٰه من التابعين، وابن قتيبة من المحدثين، قـال ابن عبدالبر: لايصح عن مطرف، واما ابن قتيبةفليس هو ممن يـعـرج اليه فی مثل هذا ...... قال الباجی: وذكر الداودی انه قيل فی معنیٰ قوله فـاقدروا له ای قدروا المنازل وهذا لا نعلم احداً قال به الا بعض اصحاب الشافعی انه يعتبر فی ذلك بقول المنجمين والاجماع حجة عليه. (اوجز ٥/١٦)

ملا علی قاریؒ شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں: وفـی شرح السنة قال ابن السريج: فـا قدروا خطاب لمن حصه اللّٰه بهذا العلم، وقوله فاكملوا العدة خطاب للعامة. اه. وهـو مـردود لـحديث (انا امة امية لانكتب ولانحسب) فانه يدل علیٰ ان معرفة الشهر ليست الی الكتاب والحساب كما يزعمه اهل النجوم، و للاجماعِ علی عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا علی انه يری ولقوله تعالی مخاطباً

لخير امة اخرجت للناس خطاباً عاماً فمن شهد منكم الشهر فليصمه، ولقوله ﷺ بالخطاب العام (صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته) ولما فى نفس هذا الحديث لاتصوموا حتىٰ تروه ولما فى حديث ابى داؤد والترمذى عن ابى هريرةؓ انه عليه الصلوٰة والسلام قال: الصوم يوم يصومون والفطر يوم يفطرون؛ بل اقول لو صام المنجم عن رمضان قبل رؤيته بناءً على معرفته يكون عاصياً فى صومه، ولا يحسب عن صومه الا اذا ثبت الهلال على خلاف فيه ولو جعل عيد الفطر بناءً على زعمه الفاسد يكون فاسقاً وتجب عليه الكفارة فى قول وهو الصحيح وان استحل افطاره فرضاًعن عده واجباًصار كافراً. (مرقات ٢٤٢/٤جديد)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله لا عبرة بقول الموقتين) اى فى وجوب الصوم على الناس بل فى المعراج لا يعتبر قولهم بالاجماع، ولا يجوز للمنجم ان يعمل بحساب نفسه وفى النهر، فلا يلزم بقول الموقتين انه اى الهلال يكون فى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولاً فى الصحيح كما فى الايضاح .(شامى ١٠٠/٢)

ان تمام عبارات منقولۂ بالا سے یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ رویت ہلال کے معاملہ میں حسابات ریاضیہ اور آلات رصدیہ کا اعتبار نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ بعض شافعیہ حساب کے معتبر ہونے کے قائل ہیں لیکن خود ان کے ہم مسلک مشائخ نے ان کا رد کیا ہے، علامہ شامیؒ نے اپنے رسالہ "تنبيه الغافل والوسنان على احكام هلال رمضان" میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام فرمایا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی کتب معتبرہ کی نقول پیش فرما کر اس کا اجماعی ہونا ثابت فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: رسائل ابن عابدين ٢٤٦/١تا ٢٤٩۔

عمومی طور پر جب یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ حسابات ریاضیہ کا اس معاملہ میں اعتبار نہیں تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس کا اعتبار جس طرح وجوب صوم میں نہیں کیا گیا، اسی طرح اگر ثقہ اور عادل گواہوں نے اس بات کی گواہی دی کہ ہم نے چاند دیکھا ہے اور حسابات ریاضیہ کے اعتبار سے اس روز رویت کا امکان نہیں تو اس صورت میں بھی محض حسابات ریاضیہ کی وجہ سے ان شاہدوں کی شہادت کو رد نہیں کیا جائے گا، لیکن چونکہ عام طور پر حضرات مصنفین جہاں حسابات ریاضیہ کے عدم اعتبار کو بیان فرماتے ہیں، وہاں بطور مثال پہلی صورت تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا اور منجمین واہل ہیئت یہ بتلاتے ہیں کہ چاند موجود ہے تو محض ان کی بات پر روزہ واجب نہ ہوگا، (بلکہ ملا علی قاریؒ کی عبارت میں تو یہاں تک ہے کہ کسی حساب داں نے محض اپنے حساب کی بنیاد پر بلا رویت شرعی روزہ رکھا تو وہ گنہگار ہوگا، اور اسی بنیاد پر عید الفطر منائی تو فاسق ہوگا، اور افطار کو وجوبی طور پر حلال سمجھا تو کافر قرار دیا جائے گا) اس سے شاید یہ غلط فہمی ہو کہ دوسری صورت میں یعنی: جب کہ حسابات ریاضیہ سے رویت کا عدم امکان ثابت ہوتا ہو اور شرعی شہادت رویت کی میسر ہو جائے تو وہ رد کر دی جائے گی؛ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ علامہ شامیؒ نے جہاں علامہ سبکی شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اہل حساب کے قول کا اعتبار کیا جائے گا؛ اس لیے کہ حساب قطعی چیز ہے'' وہیں انہوں نے اس کی صراحت فرمائی ہے، کہ علامہ سبکیؒ کے اس قول کی خود ان کے ہم مسلک مشائخ نے تردید فرمائی ہے، اس موقع پر جو عبارات مشائخ شافعیہ کی نقل فرمائی ہیں، اس میں اس دوسری صورت کی صراحت موجود ہے اور اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ اہل حساب کے قول کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جا سکتی، بلکہ شہادت پر ہی عمل ہوگا؛ اس لیے کہ شارع نے شہادت کو یقین کا

قائم مقام قرار دیا ہے ملاحظہ ہو:

ولـلامام السبکی الشافعیؒ تالیف مال فیه الی اعتماد قولهم لان الحساب قـطـعـی. اه. ومثله فی شرح الوهبانیة، قلت: ما قاله السبکی رده متأخرو اهل مذهبه منهم ابن حجرؒ والرملیؒ فی شرح المنهاج، وفی فتاوی الشهاب الرملی الـکبیر الشافعی سئل عن قول السبکی لو شهدت بینة برؤیة الهلال لیلةالثلاثین مـن الشهـر وقال الحساب بعدم امکان الرویة تلك اللیلة عمل بقول اهل الحساب لان الحساب قطعی والشهادة ظنیة، واطال فی ذلك فهل یعمل بما قاله ام لا؟ وفیـما اذا رؤی الهلال نهاراً قبل طلوع الشمس یوم التاسع والعشرین من الشهر وشهـدت بینة برؤیة الهلال رمضان لیلة الثلاثین من شعبان فهل تقبل الشهادة ام لا؟ لأن الهـلال اذا کـان الشهـر کاملاً یغیب لیلتین او ناقصاً یغیب لیلة او غاب الهلال اللیلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء لأنه ﷺ کان یصلی العشاء لسقوط الـقـمـر الثـالثة هل یعمل بالشهادة ام لا؟ فاجاب: بأن المعمول به فی المسائل الثـلاث مـا شهـدت بـه البیـنة لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة الیقین، ومـا قاله السبکی مردود ردّه علیه جماعة من المتأخرین ولیس فی العمل بالبینة مخالفة لصلاته ﷺ ووجـه ما قلناه ان الشارع لم یعتمد الحساب بل الغاه بالکلیة بقوله (نـحـن امة امیة لا نکتب ولا نحسب الشهر هکذا وهکذا) وقـال ابن دقیق العید الـحسـاب لا یـجـوز الاعتـمـاد عـلیـه فی الصلوة، انتهی. والاحتمالات التی ذکـرها السبکی بقوله ولأن الشاهد قد یشتبه علیه الخ لا اثر لها شرعاً لامکان وجودها فی غیرها من الشهادات اه(رد المحتار علی الدر المختار ۲/۱۰۰)

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر رصد گاہ والے یہ اعلان کریں کہ فلاں روز رویت ممکن نہیں، اور شہادت شرعیہ سے اس روز رویت ثابت ہو جائے تو شہادت پر ہی عمل ہوگا، محض رصد گاہ کی تحقیق وحساب کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جا سکتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس شہادت کو ماننے کی وجہ سے مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم نہ آتا ہو؛ اس لیے کہ اگر مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم آتا ہے تو وہ دن محل شہادت ہی نہیں۔ لقوله عليه الصلوة و السلام: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، وعقد الابهام فى الثالثة ثم قال: الشهر هكذا وهكذا وهكذايعنى تمام الثلاثين يعنى مرة تسعاًو عشرين ومرة ثلاثين (متفق عليه)

اس جگہ ان حضرات کو جو حساب کے قطعی ہونے کے قائل ہیں، بڑا اشکال یہ پیش آتا ہے کہ جب آیت قرآنی سے شمس وقمر کا ایک حساب سے جاری ہونا ثابت ہے، تو پھر ہم حساب کی قطعیت کی بنیاد پر شہادت کو کیوں رد نہ کریں؟ کیا ان آیات قرآنی سے صرف نظر کرلیا جائے؟ تو ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ جو بات قرآن مجید سے ثابت ہے، وہ تو صرف اتنی ہے کہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ شمس وقمر کے لیے اللہ تعالی نے ایک حساب مقرر فرمایا ہے، اور یہ دونوں اس حساب سے سرِ موتجاوز نہیں کر سکتے؛ لیکن اس حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہل ہیئت و ریاضی جس حساب کے دعویدار ہیں وہی مراد ہو، اور اگر مان بھی لیں کہ وہی حساب مراد ہے تب بھی یہ دعوی کہ وہ حساب قطعی ہے محل نظر ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خود ان فنی معلومات کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر چہ حساب بحیثیت حساب کے قطعی ہو کہ دو اور دو چار ہی ہو سکتے ہیں، تین یا پانچ نہیں ہو سکتے لیکن ان دو کا دو ہونا یہ ہماری نظر اور اندازے وتخمینہ ہی کا حکم ہوسکتا ہے کتنے ہی باریک سے باریک

پیمانوں سے تولا اور پرکھا جائے یہ احتمال ختم کرنا ہماری قدرت میں نہیں کہ ہم نے جس کو دو سمجھا ہے وہ دو سے کسی قدر کم یا زیادہ ہو، خواہ یہ کمی یا زیادتی ایک بال کے ہزارویں حصہ کے برابر ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زمین کے فرش پر کسی زاویہ میں ایک بال کے ہزارویں حصہ کی کمی یا زیادتی اگرچہ بالکل غیر محسوس زیادتی ہے؛ مگر اوپر کی فضاء اور سیاروں تک جب اس زاویہ کے خطوط ملائے جائیں گے تو میلوں کا فرق ہو جائے گا ''مذہب اور سائنس'' کتاب میں گارڈن بلیف کا ایک اقتباس لیا ہے، جس میں صراحت ہے کہ چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے، سورج قریبا نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ (ص ۶۹) ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے اس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے (ص ۷۱) ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں حالانکہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔ (ص ۲۷) اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ کیمرہ کی طرح ترقی یافتہ آلات جھوٹ نہیں بولتے؛ مگر ان آلات کو واقعات پر منطبق کرنا تو بہر حال انسانی نظر اور انسانی عمل ہے اس میں غیر محسوس فرق ہو جانا کسی وقت بھی مستبعد نہیں؛ بلکہ واقع ہے جس کا مشاہدہ ہمیشہ اہل فن کے باہمی اختلافات سے ہوتا رہتا ہے، دنیا میں جتنی جدید اور قدیم تقویمیں اور جنتریاں اور کیلنڈر وجود میں آئے ہیں ان میں سے صرف ان کو لیا جائے جو مسلم ماہرین فن نے تیار کیے ہیں، تو ان میں بھی باہمی اختلاف نظر آتا ہے، اگر ان حسابات اور آلات کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے تو ماہرین فن کے اختلاف رائے کا کوئی احتمال نہ رہتا، سائنس کی نئی ترقیات اور فن ریاضی وفلکیات کی جدید ترقیات کا آج کی دنیا میں بڑا ہنگامہ ہے، اور

اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی نئی تحقیقات نے پرانے فلسفہ اور ریاضی کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس کے خلاف مشاہدہ کرا دیا؛ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج ایک محقق ماہر نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرف آخر ہے اس کی تغلیط آئندہ کوئی نہیں کر سکے گا۔ آئندہ کو چھوڑ کر اسی موجودہ دور میں اسی درجہ کے دوسرے ماہرین اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ (رویت ہلال ص ۳۸/۳۹)

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: اتنی بات اس اختلاف میں سب کے لیے واضح ہوگئی کہ ان قواعد وآلات سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی اور یقینی کہنا محض خوش گمانی ہے، صحیح یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں، چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہر نجوم وفلکیات ابو ریحان البیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدت دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے اور ان فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے، اسی نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اس کی امامت سب کے نزدیک مسلم ہے، روسی ماہرین نے اس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے، ان کی مشہور کتاب "الاثار الباقية عن القرون الخالية" ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اس میں ان آلات رصدیہ کے ان نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرین فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان علماء الهيئة مجمعون على ان المقادير المفروضة فی اواخر اعمال رؤية الهلال هی ابعاد لم يوقف عليها الا بالتجربة، وللمناظر احوال هندسية يتفاوت لاجلها المحسوس بالبصر فی العظم والصغر، وفی ما اذا تاملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال او

امتناعها. (الاثار الباقية ص ١٩٨ طبع ليزك ١٩٢٣ء)

علماء ریاضی و ہیئت اس پر متفق ہیں کہ رویت ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، اور فضائی وفلکی حالات ایسے ہیں کہ ان میں جو بھی ذرا غور کرے گا، تو رویت ہلال کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا۔

اور ''کشف الظنون'' میں بحوالہ زیچ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ یہی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ (کشف الظنون ۲/ ۹۶۹، رویت ہلال ص ۴۱/۴۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ رصد گاہوں اور آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رویت ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلاسکتی، بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے تو اس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اور بھی تائید ہوگئی، جو رسول امی ﷺ نے اس معاملہ میں اختیار فرمایا کہ ان کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو الجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رویت ہونے نہ ہونے پر احکام شرعیہ کا مدار رکھدیا، جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کر سکے۔ (رویت ہلال ص ۴۲)

شہادت کے لیے جب ایک ضابطہ شریعت نے مقرر فرمایا تو اس میں مزید قیود کا اضافہ دلیل شرعی کے بغیر ممکن نہیں، وہ شہادت اہل ہیئت کے قطعی حساب کے خلاف نہ ہو، یہ ایک ایسی قید ہے جس کا کوئی شرعی ماخذ نہیں۔ پھر حساب کو قطعی کہنا خود بلا دلیل اور اہل ہیئت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ جو حضرات قطعیت حساب کے دعویدار ہیں ان کے

غور وفکر کے لیے دو واقعے پیش کر رہا ہوں۔

دو واقعے

(۱) علمائے امت کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد محض تحری و تخمینہ سے قائم کی گئی ہیں، لیکن مسجد نبوی کی سمت بطور وحی و مکاشفہ قائم کی گئی ہے، حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے سامنے بیت اللہ کو بطور معجزہ کر دیا تھا، اس کو دیکھ کر آپ ﷺ نے مسجد مدینہ کی بنیاد رکھی۔

''بحرالرائق'' میں ہے: نقل عن ابی بکر الرازی فی محراب المدینة انه مقطوع به فانه انما نصبه رسول الله ﷺ بالوحی (۳۰۳/۱) ''درمختار'' میں ہے:

وكذا المدنی لثبوت قبلتها بالوحی. (در مختار علی هامش الشامی ۳۱۵/۱)

اِس لیے باجماع امت مسجد نبوی کی سمت بالکل یقینی ہے لیکن حسابات ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اتری؛ چنانچہ امیر مصر احمد ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ماہرین ھندسہ کو مدینہ منورہ بھیج کر پہلے مسجد نبوی کی سمت قبلہ کو آلاتِ ریاضیہ سے جانچا تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خط سمت قبلہ سے مسجد نبوی کی سمت قبلہ دس درجہ مائل بجنوب ہے جیسا کہ علامہ مقریزی نے کتاب الخطط ۲۵۶/۲ میں بالفاظ ذیل اس کا ذکر کیا ہے:

ان احمد ابن طولون لما عزم علی بناء هذاالمسجد بعث الی محراب رسول الله ﷺ من اخذ سمته فاذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج الی جهة الجنوب.

اب جو لوگ آلات رصدیہ پر مدار رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ ان کی تجویز پر تو مسجد نبوی کی سمت قبلہ بھی پوری نہیں اترتی۔ اگر چہ موجودہ زمانہ کے آلات

کے مطابق مسجد نبوی کی سمت، قبلہ کے عین مطابق ہے لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ آلات پر مدار رکھنا اور اصول شرع کو محض آلات رصدیہ کی وجہ سے چھوڑنا غلط طریقہ ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اس کی نماز بھی پڑھی اور پڑھائی تھی۔ بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے کہ سورج گرہن کا یہ واقعہ اس روز پیش آیا تھا جس روز آپ ﷺ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ اس موقع پر علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اکثر اہل سیر کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے: کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات دس چاند کو ہوئی تھی، دو قول اور بھی ذکر کیے ہیں جن میں ایک چار چاند کا اور دوسرا چودہ کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: (قوله يوم مات ابراهيم) يعنى ابن النبى ﷺ وقد ذكر جمهور اهل السير انه مات فى السنة العاشرة من الهجرة، فقيل فى ربيع الاول وقيل فى رمضان وقيل فى ذى الحجة، والاكثر على انها وقعت فى عاشر الشهر، وقيل فى رابعه وقيل فى رابع عشرة . (فتح البارى ٢/ ٤٢٣)

چنانچہ خود حافظ ابن حجرؒ نے اپنی دوسری تصنیف ''الاصابۃ'' ۱/۹۳ میں اور علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے الاستيعاب على هامش الاصابة (٤٣/١) میں بھی دس چاند والا قول نقل فرمایا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے ''مرقات شرح مشکوۃ'' میں حافظ کے حوالہ سے اسی کو ذکر کیا ہے۔

قال ابن حجر وكان ذلك يوم عاشر الشهر كماقاله بعض الحفاظ. (مرقات ٢/ ٢٧٥)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ''اوجز المسالک'' میں اس کو ''شرح احیاء'' اور ''تاریخ الخمیس'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:

قلت و ذكره فى تاريخ الخميس فى السنة السادسة، فقال و فى هذه السنة كسفت الشمس اول مرة قبل الكسوف الذى كان فيه موت ابراهيم كذا فى الوفاء، ثم ذكر فى السنة العاشرة فقال وفى هذه السنة يوم الثلثاء لعشر ليال خلون من ربيع الاول توفى ابراهيم بن رسول الله ﷺ وانكسفت الشمس يوم مات، فقال الناس انما كسفت لموت ابراهيم قيل ان الغالب ان الكسوف يكون يوم الثامن والعشرين او التاسع والعشرين وانكسفت فى العاشر فقالوا انها كسفت لموته انتهى. (اوجز المسالك ٤/٢٥)

اہل ہیئت کے نزدیک یہ بات اصول مسلمہ میں سے ہے کہ سورج گرہن قمری مہینہ کی آخری تاریخوں (۲۷/۲۸/۲۹) میں ہوتا ہے، اور یہاں حدیث میں تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز سورج گرہن ہوا، اور اکثر اہل سیر یہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات دس چاند کو ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دس چاند کو سورج گرہن ہوا، اب اگر اہل ہیئت سے اس سلسلہ میں دریافت کیا جائے تو وہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ یہ ناممکن اور محال ہے؛ لیکن علمائے کرام اور محدثین عظام اسی واقعہ کو ان کی تردید کے لیے پیش فرماتے ہیں؛ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اسی موقع پر تحریر فرماتے ہیں۔

وفيه رد على اهل الهيئة لانهم يزعمون انه لا يقع فى الاوقات المذكورة وقد فرض الشافعى وقوع العيد والكسوف معاً واعترضه بعض من اعتمد على قول اهل الهيئة وانتدب اصحاب الشافعى لدفع قول المعترض فاصابوا.(فتح البارى ٢/٤٢٣)

دیکھئے حافظ نے اس موقع پر اہل ہیئت کی تردید فرمائی ہے، (بلکہ ان کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ عید اور کسوف دونوں جمع

ہوجائیں، اور اہل ہیئت کی بات کا اعتبار کرنے والوں کی طرف سے امام پر جو اعتراض وارد کیا گیا اس کا اصحاب شوافع نے جواب دیا اور ان کے اس جواب کی خود حافظ فاصابوا فرما کر تصویب وتائید کررہے ہیں۔)

ملا علی قاریؒ بھی شرح مشکوۃ میں یہی بات فرماتے ہیں: وفیه رد لقول اهل الهيئة لا يمكن كسوفها فی غير يوم السابع او الثامن او التاسع والعشرين الا ان يريد ان ذلك باعتبار العادة وهذا خارق لها. (مرقات ۲/۲۷۵)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے "اوجز" میں اس مسئلہ پر مستقل بحث فرمائی ہے: والسادس فيما قال اهل الهيئة ان الكسوف لا يكون الا فی الثامن والعشرين او التاسع والعشرين، وقد ورد عند اهل التاريخ وقوعهما فی الاوقات المختلفة وورد ان الشمس كسفت عند شهادة الامام حسين فی العاشوراء وتقدم عن العينی راداً على اهل الهيئة انه لو كان الكسوف لوقوعه فی ظل الارض فی وقت لكان ذلك الوقت محدوداً معلوماً لان المجرى منهما محدود معلوم فلما كان تأتی فی الاوقات المختلفة والجرى واحد و الحساب واحد علم قطعاً فساد قولهم، انتهى. (اوجز المسالك ۲/۵۰۴)

اس لیے رویت ہلال کی شہادت بھی محض اس وجہ سے رد نہیں کی جاسکتی کہ رصد گاہ والے اس روز رویت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱) باہر سے آئی ہوئی خبر کو ماننے سے مقامی مہینہ ۲۸ کا ہوجاتا ہے تو اس پر عمل جائز نہیں، جیسا کہ تمہید میں واضح کیا جاچکا، اور اگر ۲۹ ویں تاریخ کو یہ خبر بطریق موجب

موصول ہوئی تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

(۲) مقامی حساب سے ۲۹/ شعبان مطابق ۲۸/اپریل کو بطریق موجب خبر رویت حاصل ہونے پر جب رویت کا فیصلہ کر دیا گیا ہو، اور اس کے بعد ۲۹/ اپریل کی شام نظر آنے والے چاند کو دو دن پہلے کا بتلایا جاوے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ اس لیے کہ بعض مرتبہ ابر کی وجہ سے چاند کئی روز نظر نہ آئے اور بعد میں ابر صاف ہونے پر یا چاند کا سائز بڑا ہونے پر ابر کے باوجود نظر آئے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسی روز کا ہے؛ اس لیے کہ شرعی طریقہ سے مہینہ ثابت ہو چکا ہے۔ ممانعت جو وارد ہوئی ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ اس کا ثبوت بطریق موجب پہلے سے نہیں ہوا ہو، اور محض چاند کے سائز کی بنیاد پر اس کو ایک دو روز کا بتلایا جائے۔

(۳) بطریق موجب ثبوت فراہم ہونے پر روزے رکھے ہیں تو وہ رمضان ہی کے شمار ہوں گے۔

(۴) جب سعودیہ کی خبرِ شرعی پر رمضان کا ثبوت مان لیا گیا تو اب اگر اس حساب سے ۲۹ ویں کی شام چاند نظر آ جاوے تو عید الفطر منالیں اور ۲۹ کی شام چاند نظر نہ آنے کی صورت میں ۳۰ روزے مکمل کر کے عید مناویں۔

(۵) تمہید میں بیان کردہ تفصیل میں اس کا جواب آ چکا ہے۔

(۶) حدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے؛ البتہ اگر سعودی رویت کی خبر بطریق موجب برطانیہ پہنچ گئی تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

الجواب صحیح والمجیب نجیح
محمود غفرلہ

حررہ: العبد احمد خانپوری
۱۲ ذی القعدہ ۱۴۰۷ھ

مکتوب گرامی حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترمی زید احترامہ!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ کا فتوی ماشاء اللہ بہت جامع اور مفید معلومات پر مشتمل ہے اور آپ کا طرز استدلال نہایت پختہ ہے، کیا اچھا ہو کہ یہ چھپ جائے دوسروں کو بھی زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بہت بہت سلام، دعا کی درخواست۔ تعطیل عید الاضحیٰ میں ہتھورا، باندہ، کانپور کا نظام تجویز ہو رہا ہے پھر اس کے بعد کلکتہ ہوتے ہوئے انشاء اللہ آپ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے، جس کی اطلاع کسی وقت انشاء اللہ کر دوں گا۔ مولانا احمد بزرگ ماشاء اللہ بہت خوش نصیب ہیں اللہ پاک حج مقبول نصیب فرمائے۔ گھر میں بچوں کو اور ان کی والدہ کو دعا سلام، بڑی بچی کو بھی اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ فقط والسلام

املاہ: العبد محمود غفرلہ، ۲۲/ ۱۱/ ۱۴۰۷ھ

مذکورہ فتوے پر مولانا یعقوب قاسمی مدظلہ (برطانیہ) کے چند اشکالات

محترمی مولانا احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عزیز شبیر ٹیلر پر مرسلہ مفصل فتوی بابت ''برطانیہ میں رویت'' پڑھا۔ اس پر حسب ذیل چند باتیں بطور افہام و تفہیم پیش خدمت ہیں:

(الف) جواب کی تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ اثباتِ شہورِ اسلامی میں اعتبار رویت

ہلال کا ہے نہ کہ فلکی حساب کا۔

راقم آثم بھی اس سے متفق ہے کہ اسلامی ماہ کے تعین کا مدار چاند کی بصری ارضی رویت پر ہے، اور علماء ہیئت وفلک بھی یہ لکھتے ہیں کہ چاند کی ارضی بصری رویت کے وقت کا حتمی فیصلہ کسی قسم کے حساب سے نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں؛ اس لیے علم ہیئت کے ماہرین امکان رویت کو فرماتے ہیں۔

اگر علم ہیئت کا حساب ۲۹/ تاریخ کو امکان رویت ہلال کو بتائے؛ مگر رویت بصری نہ ہو تو اسلامی ماہ کی یکم تاریخ کا فیصلہ امکان رویت کے حساب کی وجہ سے نہیں کیا جائے گا، بلکہ ۳۰ دن مکمل کر کے دوسرا ماہ شروع کیا جائے گا، جس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ ۲۵/ اگست کو علم ہیئت کے حساب سے چاند کی رویت کا قوی امکان تھا؛ مگر ۲۵/ اگست کو رویت بصری نہ ہونے کی وجہ سے مراکش اور جہاں بھی رویت ہلال کا اہتمام ہوتا ہے ۳۰/ ذی الحجہ مکمل کر کے یکم محرم ۱۴۰۸ھ ۲۷/ اگست بروز جمعرات متعین ہوا جب کہ سعودی عرب میں ۲۵/ اگست بروز منگل یکم محرم تھی۔

مگر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی بھی مقام کی رویت کی شہادت قران شمس و قمر محاق سے بھی مقدم ہو تو اس کو صرف اس وجہ سے قبول کر لینا کہ شہادت ہے اور اس سے اسلامی ماہ کا تعین کر لینا بھی صحیح نہیں کیونکہ قران شمس وقمر، محاق یہ کوئی مفروضہ یا صرف علم ہیئت کی اصطلاح نہیں، بلکہ متقدمین ومتاخرین مفسرین نے بالاتفاق اکثر نے "یستتر لیلتین او لیلۃ" سے اور بعض نے صراحۃً لفظ "محاق" سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ (بحر المحیط، روح المعانی، خازن، احکام القران للقرطبی، صاوی، جمل، مواہب الرحمن تفسیر)

نوٹ: مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ اور مذکورہ سارے مفسرین متفقہ طور پر آیت

کریمہ ﴿والقمر قدرناه منازل﴾ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ چاند کی ۲۸ منزلیں ہیں، اورآخیر ماہ میں وہ ایک یا دو راتیں مستور ہوتا ہے یہی قران شمس وقمر، محاق اور نیو مون ہے۔

سعودی عرب کے شاہدوں کا قران شمس وقمر، محاق کے وقت یا اس سے بھی پہلے چاند کی بصری رویت کی شہادت دینا یہ صرف علم ہیئت کے خلاف نہیں، بلکہ مذکورہ سارے مفسرین کی متفقہ تفسیر کے خلاف ہے، علامہ اندلسی آلوسیؒ سے علامہ عثمانیؒ تک سارے مفسرین مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں غلطی کرتے رہے، اور اب اس دور میں شاہدین رویت سعودی عرب نے اس غلطی کو فاش کیا، کہ نہیں چاند ماہ کی آخری راتوں میں مستور نہیں ہوتا ہمیں نظر آتا ہے۔ یا للعجب.

میری ناقص رائے میں اصل الجھن علماء ومفتی حضرات کو یہ ہو رہی ہے کہ حساب کی وجہ سے شاہدین کی شہادت کو کیسے رد کریں؟ حساب فلکی کی وجہ سے شہادت کو رد نہیں کرنا؛ بلکہ فقہاء کے نزدیک قضائے قاضی میں یہ بات مسلم ہے، کہ شاہدوں کی شہادت میں ریب وشک ہونے کی صورت میں (چاہے وہ شک گواہوں کی ذات میں ہو یا شہادت کے محل وقوع میں) اس شہادت کو رد کر دیا جائے گا، اسی لیے شہادت میں گواہوں کا عادل ہونا شرط قرار دیا گیا، اور فاسقِ بین اور محدود بالقذف کی گواہی رد کر دی جائے گی۔

اسی طرح شاہدوں کا محال عادی کے خلاف گواہی دینا یہ بھی ریب وشک ہے اس وجہ سے وہ شہادت قابل قبول ہو کر اس پر حکم کو متفرع کرنے کے بجائے اس کو رد کر دینا چاہیے، کیونکہ شریعت مطہرہ کا مدار محالات پر نہیں ہوسکتا؛ لہذا قران شمس وقمر کے وقت یا اس پہلے چاند کی رویت بصری کی شہادت حساب فلکی کی وجہ سے رد نہیں کی جاتی، بلکہ شہادت میں ریب وشک ہونے کی وجہ سے رد کی جاتی ہے۔

چناں چہ شیخ محمد بخیت حنفی مصری اپنی کتاب ”ارشاد اصل الملة الی اثبات الاھلة“ میں ص ۲۸۴ پر تحریر فرماتے ہیں:

”ان یری مع عدم الامکان وذلك مستحیل، وانما المراد ان یخبر مخبر برؤیته مع عدم امکانه والاخبار یحتمل الصدق والکذب، والکذب یحتمل العمد والغلط، ولکل منهما اسباب لا تنحصر فلیس من الرشد قبول الخبر المحتمل لذلك او الشهادة به مع عدم الامکان لان الشرع لا یأتی بالمستحیلات“

آگے لکھتے ہیں: لان دلالة الحساب القطعی او القریب من القطعی علی عدم الامکان اقوی من الریبة، والریبة موجبة لرد الشهادة فاعتقادنا عدم الامکان لذلك او اقوی.

آپ کے جواب سے یہ بات نتیجہ کے طور پر ثابت ہوتی ہے کہ چاند کی مؤخر رویت کا اعتبار نہیں، بلکہ اسبق ومقدم رویت کی خبر آنے پر مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا نہ ہوتا ہو، تو اس پر عمل کرنا چاہیے، اور مفتی اسماعیل بھڑکودروی مفتی کنتھاریہ دارالعلوم کے فتوی کے مطابق چاند کی اسبق اور مقدم رویت پر عمل کرنا واجب۔

لہذا بالفرض والتقدیر اگر برطانیہ میں مقامی رویت ہوتی ہو تب بھی مسلک مذکورہ پر عمل کرتے ہوئے دوسرے مقام بعید سے اصول شریعت کے مطابق ثابت ہونے والی مقدم رویت کا ثبوت معتبر اپنے یہاں فراہم ہوجانے پر مقامی رویت سے قبل ہی عمل کرنا جائز اور درست ہے بلکہ بقول متقدمین واجب ہے۔ (فتویٰ مفتی اسماعیل)

آپ حضرات کے دونوں مذکورہ فتووں کی روشنی میں ۱۴۰۷ھ کے رمضان وعید کا تجزیہ درج ذیل ہے: ”دہلی اور سعودی عرب میں رمضان کی ابتداء شاہدوں کی شہادت

سے ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز منگل ہوئی اور اسی کے مطابق ۳۰ روزے مکمل کر کے ۲۸/ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات منائی گئی، اسی طرح عید الاضحیٰ سعودی عرب میں ۴/ اگست ۱۹۸۷ء بروز منگل تھی، گجرات اور ہندوستان کے معظم علاقوں میں رمضان کی ابتداء ۳۰/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز جمعرات سے ہوئی اور عید الفطر ۲۹ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعہ منائی گئی، اور عید الاضحیٰ ۶/ اگست ۱۹۸۷ء بروز جمعرات منائی گئی“۔

آپ حضرات کے قول کے مطابق تو ہندوستان اور بالخصوص گجرات میں رمضان وعیدین ۱۴۰۷ھ صحیح وقت پر نہیں ہوئی، بلکہ وقت سے مؤخر ہوئی کیونکہ چاند کی اسبق رویت کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا واجب یا جائز تھا۔ سعودی عرب کی دور کی خبر نہ سہی (اگر چہ بقول آپ کے اختلاف مطالع کا قطعاً اعتبار نہیں، سے نظر انداز) دہلی کی خبر پر بھی عمل نہیں کیا گیا اور ترک واجب کے مرتکب ہوئے۔

چونکہ ساری دنیا میں سب سے اول اور مقدم سعودی عرب میں چاند کی رویت کا اعلان ہوتا ہے، تو بقول آپ کے عالم اسلام میں اپنی مقامی رویت کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ چاند کی رویت کی اسبق خبر سعودی عرب سے ملنے پر اس پر عمل کرنا واجب ہے، باقی رہا چاند کی رویت کا طریق موجب سے پہنچنا تو یہ بات اس دور میں کوئی دشوار نہیں، سعودی ریڈیو، ٹی۔ وی کی نشریات کے علاوہ معتمد لوگوں کے متعدد فون رمضان وعیدین کے موقعے پر موصول ہوتے رہتے ہیں، اور عید الاضحیٰ کی سعودی کی خبر تو تواتر کے درجہ میں پورے عالم اسلام میں عید الاضحیٰ سے کئی دن پہلے پہنچنے سے شاید کسی کو انکار ہو؛ بلکہ اب تو ہندو پاک بالخصوص گجرات میں سعودی سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو آپ حضرات پر بھی مخفی نہیں۔

وجہ اشکال کسوف شمس

تو اس بارے میں معروض ہے کہ یہ مسئلہ تو خالص علم ہیئت وفلک اور حساب کا ہے، ظاہر ہے اس میں اہل فن کی بات زیادہ وزنی ہوگی مولانا موسیٰ روحانی بازی مدرس حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اپنی معروف کتاب ''فلکیات جدیدہ'' میں نبی ﷺ کے ۲۳ سالہ عہدِ نبوت کے کسوف شمس کی تعداد اور تاریخوں پر مشتمل ایک جدول تیار کی ہے، جس میں یہ بتایا ہے کہ کسوف ہمیشہ اسلامی ماہ کی اخیری تاریخوں میں ہوا ہے۔ (۲۲۱،۲۲۲)

حضرت ابراہیم کی وفات کی تاریخ کے بارے میں اور کسوف کی تاریخ کے بارے میں (عہد نبی ﷺ) روایات بہت ہی مختلف ومضطرب ہیں، جیسا کہ حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ نے ''اوجز'' میں اس کی ابتداء ہی اس کلمہ سے کی ہے:

الخامس فی تاریخ الکسوف فی زمانہ ﷺ واختلف اھل السیر جدّا .

حضرت ابراہیم کی وفات کے بارے میں ۴ مختلف ماہ مروی ہیں، تاریخ بھی ۳،۴ مختلف، حتی کے سال بھی دو تین مختلف مروی ہیں۔

آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس زمانہ میں تاریخ و ماہ کی تعیین کا ایسا رواج نہیں تھا جیسا کے بعد میں ہوا؛ اس لیے اس میں اقوال کا مختلف ہوجانا اہل نقول کے حافظہ کی بنیاد پر قدرتی بات ہے۔ ان کان صوابا فمن اللّٰہ وان کان غیر ذلك فمنی واستغفراللّٰہ . واللّٰہ أعلم وعلمہ اتم واحکم.

احقر: یعقوب اسماعیل قاسمی غفرلہ، ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۷ء بروز بدھ

اشکالات کے جوابات

محترم ومکرم مولانا یعقوب صاحب مدت فیوضکم

وعليكم السلام ورحمة الله و بركاته

عنایت نامہ نے ممنون کیا، آپ نے جو توجہ فرمائی اس پر ممنون و مسرور ہوں، چونکہ افہام و تفہیم مقصود ہے؛ اس لیے جن امور کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے ان کے سلسلہ میں میرا خیال بھی عرض کرتا ہوں، امید کہ آپ بھی اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

(الف) آپ نے احقر کے تمہیدی مضمون کا جو خلاصہ تحریر فرمایا ہے اس میں اہم جز چھوڑ دیا ہے؛ اس لیے آپ کے پیش فرمودہ خلاصہ میں کچھ اضافہ کی اجازت چاہتا ہوں۔ (آپ نے جو خلاصہ پیش فرمایا ہے وہ یہ ہے) ''اثباتِ شہورِ اسلامی میں اعتبار رویت ہلال کا ہے نہ کہ فلکی حساب کا'' (اس پر اتنا اضافہ فرمالیں) ''اور ثبوت رویت میں اعتبار شہادت کا ہے، اور شہادت کے ردو قبول کا معیار فلکی حساب نہیں بلکہ شریعت کا مقرر کردہ اصول ہے''

جس طرح محض فلکی حساب کے امکان رویت بتلا دینے سے کام نہیں چلتا، اسی طرح اس کے عدم امکان کے دعوی کی بنیاد پر شہادت رد نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ رد شہادت کے لیے کوئی وجہ شرعی نہ ہو، فلکی حساب کا رویت ہلال پر مثبت و منفی کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ جس طرح فلکی حساب کے مثبت طور پر معتبر و مؤثر نہ ہونے کو آپ تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح منفی طور پر بھی وہ مؤثر و معتبر نہیں "لا عبرة بقول المؤقتين في الصوم" کا یہی مطلب فقہاء کرام نے لیا ہے۔ اور اپنے تمہیدی مضمون میں اسی کو میں نے ثابت کیا ہے۔

آپ کو بڑی الجھن جو پیش آرہی ہے اس کی وجہ یہ ہے: کہ آپ کتب تفسیر میں ''منازل قمر'' کی تفصیل کے ذیل میں ''قران شمس وقمر اور محاق'' کا تذکرہ دیکھ کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ جب یہ حضرات مفسرینِ عظام اس کو اپنی تفسیر میں لکھ رہے ہیں تو یہ شرعا ایسا

معتبر ہے کہ احکام شرعیہ کے باب میں مؤثر ہے۔آپ کی غلط فہمی کی بنیاد یہیں سے پڑی، میں نے اپنا سابق جواب لکھنے سے پہلے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر، تفسیر قرطبی، تفسیر جواھر طنطاوی کا مطالعہ ان تمام مقامات کا کیا تھا لیکن مجھے اس کے دیکھنے کے بعد بھی کوئی اشکال نہیں ہوا۔اس کی دو وجوہ ہیں، پہلی یہ کہ جہاں حضرات مفسرین علم ہیئت کے حوالہ سے منازل قمر کی تشریح کرتے ہیں، وہاں یہ بات واضح کردیتے ہیں کہ قرآن میں جو لفظ منازل آیا ہے اس کی مراد قطعی طور پر یہ نہیں بلکہ قرآن کے نزدیک تو منازل کا مطلب صرف وہ فاصلے ہیں، جو چاند یومیہ طے کرتا ہے۔ چونکہ ہیئت والے بھی اس سے بحث کرتے ہیں اور ان کے یہاں اس کے مخصوص نام اور مقدار ہے؛ اس لیے مناسبت مقام کے پیش نظر اس کا بھی تذکرہ کردیتے ہیں، چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سورۂ یونس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :وقدره منازل لتعلموا اعدادالسنين والحساب. (اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں) یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا بڑھتا ہے﴿والقمر قدرناه منازل حتى عاد كالعرجون القديم﴾ علمائے ہیئت نے اس کے دورہ کی تقسیم کرکے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں، جو بارہ بروج پر منقسم ہیں، قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں، مطلق سیر ومسافت کے مدارج مراد ہیں۔ (فوائد شبیریہ سورۂ یونس)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو چاند خاص خاص دنوں میں طے کرتا ہے۔ (معارف القرآن ۷/۳۹۳)

علامہ سید محمود آلوسیؒ فرماتے ہیں:المنازل جمع منزل، والمراد به: المسافة التي يقطعها القمر في يوم و ليلة .(روح المعانی ۲۳/۱۶)

آگے اصطلاح ہیئت کو بیان کرتے ہوئے ان کے اختلاف کو بھی ذکر کرتے ہیں:

وھی عند اھل الھند سبعة و عشرون؛ لأن القمر یقطع فلك البروج فی سبعة وعشرین یوما و ثلث،فحذفوا الثلث لأنه ناقص عن النصف کما ھو مصطلح اھل التنجیم، وعند العرب، وساکنی البدو ثمانیة و عشرون الخ (حوالۂ بالا)

جب یہ بات واضح ہوچکی کہ مراد قرآنی ان اصطلاحات سے بالاتر ہے،تو اب حضرات مفسرین عظام کے محض ان باتوں کو اپنی تفاسیر میں ذکر کردینے سے آپ یہ استدلال فرمارہے ہیں کہ علامہ اندلسی آلوسی سے علامہ عثمانی تک سارے مفسرین مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں غلطی کرتے رہےاوراب اس دور میں شاہدین رویت سعودی عرب نے اس غلطی کو فاش کیا الخ۔اس کی گنجائش نہیں۔

(۲) دوسری وجہ جو پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ شریعت مطہرہ نے تمام علوم میں اعتبار واعتماد کی جو درجہ بندی فرمائی ہےاس کو توڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی اس کی خلاف ورزی سے شرعی مقصود حاصل ہوسکتا ہے۔احکام شرعیہ کے اثبات و عدم اثبات کے لیے دلائل شرعیہ کی ضرورت ہے جو صرف چار ہیں یعنی قرآن وسنت اور اجماعِ امت وقیاس،ان کے بغیر کسی حکم کو ثابت نہیں کیا جاسکتا،فن ہیئت کے مسلمات کو یہ مقام حاصل نہیں کہ ان کی وجہ سے دلائل شرع سے ثابت شدہ مسائل کو چھوڑا جائے یا اس میں شک وشبہ کی گنجائش نکالی جائے۔یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے باوجود یہ کہ ان میں سے بہت سے حضرات فن ہیئت کے ماہر بھی تھے،،رویت ہلال کے ثبوت وعدم میں ہیئت کا اعتبار نہیں کیا۔شریعت مطہرہ کی قائم فرمودہ اس درجہ بندی کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کلام پیش کرتا ہوں،جس سے انشاء اللہ آپ کے اشکالات بھی دور

ہونگے؛ اگرچہ مفتی صاحبؒ نے یہ کلام فن تاریخ کی مناسبت سے ارشاد فرمایا ہے لیکن اصولی شان کا حامل ہونے کی وجہ سے فن ہیئت اور دیگر فنون پر بھی منطبق ہوتا ہے ''اسلام میں اعتبار واعتماد کا جو مقام قرآن کریم اور احادیث متواترہ کا ہے وہ عام احادیث کا نہیں، جو حدیث رسول ﷺ کا درجہ ہے وہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کا نہیں، اسی طرح تاریخی روایات کے اعتماد واعتبار کا بھی وہ درجہ نہیں ہے جو قرآن وسنت یا سند صحیح سے ثابت شدہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے؛ بلکہ جس طرح نص قرآنی کے مقابلے میں اگر کسی غیر متواتر حدیث سے اس کے خلاف کچھ مفہوم ہوتا ہو تو اس کی تاویل واجب ہے یا تاویل سمجھ میں نہ آئے تو نص قرآنی کے مقابلے میں اس حدیث کا ترک واجب ہے، اسی طرح تاریخی روایات اگر کسی معاملہ میں قرآن وسنت سے ثابت شدہ کسی چیز سے متصادم ہوں تو وہ بمقابلہ قرآن وسنت کے متروک یا واجب التاویل قرار دی جائیں گی، خواہ وہ تاریخی اعتبار سے کتنی ہی معتبر ومستند روایات ہوں، اعتبار واعتماد کی درجہ بندی کسی فن کی عظمت واہمیت کو گھٹاتی نہیں؛ البتہ شریعت اور اس کے احکام کی عظمت کو بڑھاتی ہے کہ انکے ثبوت کے لیے اعتماد واعتبار کا نہایت اعلی درجہ لازم قرار دیا گیا ہے'' (مقام صحابہ ص ۱۵)؛ مگر فن تاریخ کے اتنے فوائد وفضائل اور اس کی اتنی بڑی اہمیت کے باوجود اس فن کو یہ مقام کسی نے نہیں دیا کہ شریعت اسلام کے عقائد واحکام اس فن سے حاصل کیے جائیں، حلال وحرام کے مباحث میں تاریخی روایات کو حجت قرار دیا جائے، جن مسائل کے ثبوت کے لیے قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کے شرعی دلائل کی ضرورت ہے ان میں تاریخی روایات کو مؤثر مانا جائے یا تاریخی روایات کی بناء پر قرآن و سنت یا اجماع سے ثابت شدہ مسائل میں کسی شک وشبہ کو راہ دی جائے۔ (ایضاص ۲۳/۲۴)

یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث جن کی کتابیں حدیث میں اصول معتمد علیہ کا درجہ رکھتی

ہیں، ان میں وہ جن راویوں کو ضعیف قرار دے کر ان کی روایت چھوڑ دیتے ہیں، جب وہ تاریخ کے میدان میں آتے ہیں تو ان ضعیف راویوں کی روایات بھی شاملِ کتاب کر لیتے ہیں، واقدی اور سیف ابن عمر وغیرہ کو ائمہ حدیث نے حدیث کے معاملہ میں ضعیف بلکہ اس سے بھی زیادہ مجروح کہا ہے؛ مگر تاریخی معاملات مغازی وسیر میں وہی ائمہ حدیث ان کی روایت نقل کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔ (ایضا۲۹)

خلاصہ یہ ہے کہ عام دنیا کی تاریخ اور اس میں مدون کی ہوئی کتابیں فن حدیث و فقہ یا عقائد کی طرح شریعت اسلام کے عقائد واحکام سے بحث کرنے والا کوئی فن نہیں ہے جس کے لیے روایات کی تنقیح وتنقید کی سخت ضرورت ہو، اور کھرے کھوٹے کو ممتاز کیے بغیر مقصد حاصل نہ ہو؛ اس لیے فن تاریخ میں ہر طرح کی قوی وضعیف اور صحیح وسقیم روایتیں بغیر نقد وتبصرہ کے جمع کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا، علوم قرآن وسنت کے ماہر وہی علماء جو تنقید وتحقیق اور جرح وتعدیل کے امام مانے گئے ہیں، جب فن تاریخ پر کوئی تصنیف لکھتے ہیں تو اگرچہ زمانہ جاہلیت کی تاریخوں کی طرح بے سروپا افواہوں اور افسانوں کو اپنی کتاب میں جگہ نہیں دیتے، بلکہ اصول روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے سند کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں، اسی لیے اسلامی تاریخیں تاریخی حیثیت میں عام دنیا کی تاریخوں سے صدق واعتماد کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، لیکن تاریخ میں وہ راویوں کے حالات کی چھان بین اور اس جرح وتعدیل سے کام نہیں لیتے، جو فن حدیث وغیرہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ (ایضا۲۹/۳۰)

ابن کثیرؒ جو حدیث وتفسیر کے مشہور امام اور بڑے ناقد معروف ہیں، روایات میں تنقید وتحقیق ان کا خاص امتیازی وصف ہے؛ مگر جب یہی بزرگ تاریخ پر کتاب البدایۃ

والنہایۃ لکھتے ہیں تو تنقید کا وہ درجہ باقی نہیں رہتا، خود البدایۃ والنہایۃ ۲۰۲/۸ میں بعض تاریخی روایات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کی صحت میرے نزدیک مشتبہ ہے: مگر مجھ سے پہلے ابن جریر وغیرہ یہ روایت نقل کرتے آئے ہیں؛ اس لیے میں نے بھی نقل کر دیا، اگر وہ ذکر نہ کرتے تو میں ان کو اپنی کتاب میں نہ لاتا۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق میں وہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صحت مشتبہ ہونے کے باوجود چونکہ پہلے کسی بزرگ نے لکھا ہے؛ اس لیے لکھتا ہوں، یہ تاریخ ہی کا اپنا مقام تھا کہ اس میں ابن کثیر نے اس توسع کو جائز قرار دیا۔ (ایضا۳۱)

اور یہ کسی خاص شخص کی اتفاقی غلطی نہیں، بلکہ تمام ائمۂ فن کی سوچی سمجھی روش تاریخ میں یہی ہے کہ فن تاریخ میں ضعیف وسقیم روایات کو بلا تنقید ذکر کر دینا کوئی عیب نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان روایات سے دین کے عقائد یا احکام شرعیہ کو ثابت کرنا نہیں، عبرت و نصیحت اور تجارب اقوام وغیرہ کے فوائد حاصل کرنا ہیں، وہ یوں بھی ہو سکتے ہیں، اور اگر کوئی شخص ان تاریخی روایات سے کسی ایسے مسئلہ پر استدلال کرنا چاہتا ہے جس کا تعلق اسلامی عقائد یا احکام عملیہ سے ہے، تو اس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ روایات کی تنقید اور راویوں پر جرح وتعدیل کا وہی ضابطہ اختیار کرے جو حدیث کی روایات میں لازم وضروری ہے، اس کے بغیر اس کا استدلال جائز نہیں، اور یہ کہنا کہ کسی بڑے ثقہ اور امام حدیث کی کتاب تاریخ میں یہ روایت درج ہے اس کو اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھئے کہ ائمۂ مجتہدین اور فقہائے امت میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں، جو فن طب کے بھی ماہر ہیں، جیسے: امام شافعی وغیرہ، اور بعض حضرات کی تصانیف بھی فن طب میں موجود ہیں، یہ حضرات اگر کسی طب کی کتاب میں اشیاء کے خواص وآثار

بیان کرتے ہوئے یہ لکھیں: کہ شراب میں فلاں فلاں خواص وآثار ہوتے ہیں، خنزیر کے گوشت پوست اور بال کے فلاں فلاں خواص وآثار ہیں، پھر کوئی آدمی طب کی کتاب میں ان کے کلام کو دیکھ کر ان چیزوں کو جائز قرار دینے لگے، اور استدلال میں یہ کہے کہ فلاں امام یا عالم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، اور وہاں اس کے حرام ہونے کا ذکر نہیں کیا تو اس کا یہ استدلال درست ہوگا؟ اور یہ کوئی فرضی مثال بھی نہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ امت کے کیسے بڑے عالم ہیں، علوم شرعیہ میں شاید کوئی فن نہیں چھوٹا جس پر ان کی تصانیف نہ ہوں، ان کی بزرگی اور تقدس میں کسی کو کلام نہیں؛ مگر موضوع طب پر ان کی تصنیف "كتاب الرحمة في الطب والحكمة" دیکھ لیجئے اس میں متعدد امراض کے علاج اور منافع کی تحصیل کے لیے جو نسخے لکھے ہیں، ان میں بہت سی حرام چیزیں بھی شامل ہیں، اب اگر کوئی شخص اس کتاب کے حوالہ سے ان کو جائز ثابت کرنے لگے اور سیوطی کی طرف اس کو منسوب کرے تو کیا کوئی صحیح الحواس آدمی اس کو درست باور کرسکتا ہے؟ اسی طرح اور بہت سے علماء فقہاء جن کی تصانیف فن طب وغیرہ میں ہیں، سب میں حرام چیزوں کے خواص وآثار اور طریق استعمال ذکر کیا جاتا ہے، خون اور انسانی بول و براز اور شراب وخنزیر سبھی چیزوں کے خواص لکھے جاتے ہیں اور اس جگہ وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کا حرام یا نجس ہونا بھی اس جگہ لکھدیں، کیونکہ یہ موضوع طب سے خارج ہے اور دوسری کتب میں بیان ہو چکا ہے، ان کی کتب طب سے کوئی آدمی حرام چیزوں کو ان کا نام لے کر حلال کرنے لگے تو اس میں قصور ان کا یا علامہ سیوطیؒ کا نہیں کہ انھوں نے فن طب کی کتاب میں حرام اشیاء کے خواص کیوں لکھے؟ کیونکہ اس فن کا مقتضا اور موضوع ہی یہ ہے کہ سب چیزوں کے خواص و آثار لکھے جاویں، حلال وحرام ہونے کی بحث کا یہ موقع نہیں، اور جہاں اس کا موقع ہے وہ

ان کے حرام ہونے کو لکھ چکے ہیں، قصور اس عقلمند کا ہے جو اس حقیقت کو نظر انداز کر کے طبی کتاب سے حلال وحرام کے مسائل نکالنے لگے۔ (ایضا ۳۱ تا ۳۴)

امید کہ اب آپ کا یہ اشکال کہ تمام مفسرین نے قران شمس وقمر اور محاق کا تذکرہ کیا ہے اور ﴿قدره منازل﴾ کی تفسیر میں تمام اس کو لکھتے چلے آئے ہیں تو یہ کیسے غلط ہوگیا؟ حل ہوگیا ہوگا۔ ان حضرات مفسرین کے اس کو لکھنے کی حیثیت وجہ اول میں بتلا چکا ہوں، پھر بھی ان کے اس کو لکھنے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ان بیانات کی بنیاد پر شریعت کے اصول شہادت میں ترمیم کی جائے، اسی لیے فقہائے کرام نے بھی باوجود ان اصطلاحات ومسلمات ہیئت سے واقفیت کے ان کی وجہ سے شہادت کو قابل رد نہیں قرار دیا؛ اس لیے کہ یہ میدان احکام شرعیہ کا میدان ہے، اس کا مقتضی یہ ہے کہ وہاں دلائل شرعی سے جو بات ثابت ہوتی ہو اسی کو اختیار کیا جائے۔ میں نے اپنے سابق جواب کی تمہید میں علامہ شامیؒ کی جو عبارت نقل کی تھی اس میں صراحۃً یہ مذکور ہے کہ ۲۹ کی صبح کو افق مشرق میں طلوع شمس سے پہلے چاند نظر آیا اور پھر اسی شام کو (یعنی ۳۰ کی شب میں) افق مغرب پر غروب شمس کے بعد چاند نظر آنے کی شہادت میسر آنے پر شہادت پر ہی عمل ہوگا، (بلکہ علامہ شامیؒ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے) آپ بتلائیے کہ اس صورت میں محاق کہاں گیا؟ حالانکہ شہادت مان لینے کا مطلب یہ ہوا کہ فقہاء نے ہیئت کے محاق والے اصول پر عمل نہیں کیا، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بات ریب وشک فی الشہادۃ میں داخل نہیں؛ اس لیے کہ اگر یہ چیز موجب ریب ہوتی تو فقہائے کرام اس شہادت کو کسی صورت میں معتبر نہ مانتے۔ اس سے آپ کا وہ نقطۂ نظر جو آپ نے حضرات مفتیان کرام کی الجھن دور کرنے کے لیے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر فرمایا ہے اس کی صاف تردید ہوتی ہے۔

الحاصل آپ نے فلکی حساب کے عدم امکان رویت کے دعوی کی بنیاد پر شہادت رد کرنے کا جو موقف اختیار فرمایا ہے وہ درست نہیں، آپ کے ہاں برطانیہ میں عید الفطر کے چاند کا جو واقعہ پیش آیا اس نے بھی تو آپ کے موقف کی تغلیط کر دی، میرے سابق جواب میں یہی بات میں نے ثابت کی ہے کہ محض فلکی حساب کے یہ بتلا دینے سے کہ رویت ممکن نہیں، شہادت رد نہیں کی جا سکتی، رد شہادت کے لیے اصول شرع ہی سے کام لینا ہوگا، فقہائے کرام بھی اسی بات کو صراحۃً کہتے ہیں: المعمول به في المسائل الثلاث ما شهدت به البينة لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين. (شامی ۲/۱۰۰)

اب مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں فقہائے کرام کی اس تصریح کے خلاف فتوی دوں؟ میں تو مقلد محض ہوں، میرے لیے کسی حال میں تصریحات فقہاء کے خلاف فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے۔

ایک ضروری وضاحت: میں نے اپنے سابق جواب میں جو کچھ لکھا اور اس افہام وتفہیم میں بھی جو عرض کیا اس سے میرا مقصد سعودیہ کے اعلان کی حمایت نہیں ہے؛ بلکہ نفس مسئلہ کی وضاحت اور شرعی حیثیت کا تعین ہے، رہا سعودی اعلان درست ہے یا نہیں؟ تو جب تک ان کے طریق کار کا علم نہ ہو جائے اس سے پہلے اس سلسلہ میں کچھ کہنا یا لکھنا قبل از وقت ہے، اور آپ سے بھی یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ سعودی اعلان کی تغلیط کے لیے آپ جو طریقہ اختیار فرمائے ہوئے ہیں، وہ درست نہیں، اس کے بجائے اگر آپ یہ تفصیل معلوم کریں کہ وہاں کس طریقہ سے ثبوت ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے، شہادت کہاں سے آتی ہے، شاہدین عموماً کون ہوتے ہیں؟ اور پھر اس میں کوئی شرعی قباحت ہو تو اس کو ظاہر فرمائیں۔

(ب) آپ نے دوسرا اشکال کر کے جو تجزیہ پیش فرمایا ہے اس کی بھی وضاحت پیش خدمت ہے۔ چاند کی اسبق رویت پر عمل کو میں نے جو جائز لکھا اس کے ساتھ شرط بھی ذکر کی ہے کہ وہ بطریق موجب پہنچی ہو، حالانکہ گجرات میں دہلی کی خبر بطریق موجب نہیں پہنچی تھی؛ نیز دیوبند میں جو عید ہوئی تھی تو یہ یاد رہے کہ وہاں ہلال شعبان کی شہادت اواخر شعبان میں موصول ہونے پر شعبان کی تاریخ کو مؤخر کیا گیا تھا، جس کا گجرات میں بھی پتہ نہ چلا، پھر جب دیوبند میں وہاں کی ۲۹/ شعبان (جو گجرات میں ۲۸ تھی) کے حساب سے رمضان کی اطلاع ملی تو ان حضرات نے اس کو قبول کرتے ہوئے رمضان کا اعلان کیا جب کہ گجرات میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی؛ اس لیے آپ کے تجزیہ سے ہم پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

(ج) کسوف شمس کے سلسلہ میں خود میں نے ''فتح الباری'' کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں مختلف تاریخیں مذکور ہیں، لیکن میں نے وہاں تصریح کر دی ہے کہ ان تاریخوں میں سے حافظؒ نے جس تاریخ کے متعلق والاکثر انہا وقعت الخ فرما کر ترجیح دی ہے، اسی پر میں نے اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے؛ نیز دور نبوی میں واقع کسوف شمس کی جتنی بھی تاریخیں کتب شروح حدیث میں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی اصول ہیئت پر صحیح نہیں ٹھہرتی، اس کا کیا علاج؟۔ فقط والسلام۔

العبد: احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

ضمیمہ:

(۱): (یوم مات ابراهیم) یعنی ابن النبی ﷺ، وذكر جمهور اهل السیر انه مات فی السنة العاشرة من الهجرة، قیل فی ربیع الاول، وقیل فی رمضان، وقیل فی ذی الحجة، والاكثر علی انها وقعت فی عاشر الشهر، وقیل فی رابع،

وقيل فى رابع عشرة ...... (فان قلت) الكسوف فى الشمس انما يكون فى الثامن والعشرين او التاسع والعشرين من آخر الشهر العربى فكيف تكون وفاته فى العاشر؟ (قلت): هذا التاريخ يحكى عن الواقدى وهو ذكر ذلك بغير اسناد فقد تكلموا فيما يسنده الواقدى فكيف فيما يرسله؟ وقال البيهقى فى باب ما يحول على جواز الاجتماع للعيد وللخسوف لجواز وقوع الخسوف فى العاشر: ثم روى عن الواقدى ما ذكرناه عن تاريخ وفاة ابراهيم وقال الذهبى فى مختصر السنن لم يقع ذلك ولن يقع، والله قادر على كل شىء لكن امتناع وقوع ذلك كامتناع رؤية الهلال ليلة الثامن والعشرين من الشهر. (عمدة القارى ٦٩/٦)

اس میں علامہ عینیؒ نے دس چاند والا قول واقدی کا ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے، لیکن خود علامہ عینیؒ نے اہل ہیئت کی بات کی دوسرے موقع پر تردید کی ہے جیسا کہ اصل مضمون میں ''اوجز'' کی عبارت میں ان کا قول مذکور ہے، جو عمدۃ القاری ۷/ ۶۶، ۶۷ میں موجود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر علامہ عینیؒ کے پیش نظر حافظ ابن حجرؒ کی تردید مقصود ہے۔ دونوں کا کلام دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲): ''فتح الملہم'' میں علامہ عثمانیؒ نے محمود پاشا فلکی کی کتاب سے کسوف کا ۲۹/ شوال ۱۰ھ کو ہونا تحریر فرمایا ہے، لیکن یہ بھی حساب سے اخذ کردہ نتیجہ ہے۔ اہل سیر میں سے کسی کا کوئی قول نہیں۔

قال بعض الفضلاء المصريين فى تعليقه على المحلى ولقد حاولت كثيرا ان اجد من العلماء بالفلك من يظهر لنا بالحساب الدقيق عدد الكسوفات التى حصلت فى مدة اقامة النبى ﷺ بالمدينة وتكون رؤيتها بها ممكنة وطلبت

ذلك من بعضهم مرارا فلم اوفق الى ذلك الا انى وجدت للمرحوم محمود باشا الفلكى جزءاً صغيرا سماه (نتائج الافهام فى تقويم العرب قبل الاسلام) الّفه باللغةالفرنسوية، وترجمه الى العربية الاستاذ العلامة احمد زكى باشا وطبع فى بولاق سنہ ١٣٠٥ھ وقد حقق فيه بالحساب الدقيق يوم الكسوف الذى حصل فى السنة العاشرة، وهو اليوم الذى مات فيه ابراهيم رضی اللہ عنہ ومنه اتضح ان الشمس كسفت فى المدينة المنورة فى يوم الاثنين٢٩/شوال سنة ١٠، الموافق ليوم٢٧/يناير سنة ٦٣٢ ميلادية فى الساعة ٨ والدقيقة ٣٠صباحا وهو يرد اكثر الاقوال التى نقلت فى تحديد يوم موت ابراهيمرضی اللہ عنہ. (فتح الملهم ٢/ ٤٥٢)

اس پر دوسرا اشکال یہ ہے کہ ماہ جنوری میں سخت سردی پڑتی ہے (اس لیے کہ جنوری میں مدینہ منورہ کا درجۂ حرارت ''٦سی'' رہتا ہے یو۔ پی کے اکثر مقامات کا درجۂ حرارت یہی ہے۔ (جزیرۃ العرب ص۴۴) اور حضرت جابرؓ کی روایت میں صراحت ہے کہ یہ گہن سخت گرمی کے موسم میں واقع ہوا تھا۔

كسفت الشمس على عهد رسول اللّٰه ﷺ فى يوم شديد الحر فصلى باصحابه فاطال القيام حتى جعلوا يخرون.(ابو داؤد ١٦٧/١، مسلم ٢٩٧/١)

(۳):ولقد بالغ الشيعة فى يوم عاشوراء، فوضعوا احاديث كثيرة كذبا فاحشا من كون الشمس كسفت يومئذ حتى بدت النجوم، وما رفع يومئذ حجر الا وجد تحته دم، وان ارجاء السماء احمرت وان الشمس كانت تطلع وشعاعها كانه الدم، وصارت السماء كانها علقة، وان الكواكب ضرب بعضها بعضا، وامطرت السماء دما احمر وان الحمرة لم تكن فى السماء قبل

یـومئذ، ونحو ذلك وروى ابن لهيعة عن ابى قبيل المعافرى ان الشمس كسفت يـومـئـذ حتـى بـدت الـنجوم وقت الظهر وان رأس حسين لما دخلوا به قصر الأمارة جـعـلـت الـحيطان تسيل دما وان الارض اظلمت ثلاثة ايام ولـم يمس زعـفـران ولا ورس لـما كان معه يومئذ الا احترق من مسه ولـم يرفع حجرمن حجارة بيـت الـمقدس الا ظهر تحته دم عبيط، وان الابل التى غنموها من ابل الـحسيـن حيـن طبـخـوها صار لحمها من العلقم الى غير ذلك من الأكاذيب والأحاديث الموضوعة التى لا يصح منها شيء. (البداية والنهاية ۸/۲۰۱)

حضرت حسینؓ کی شہادت کے موقع پر کسوف کے بارے میں علامہ ابن کثیرؒ کی رائے مندرجہ بالا ہے، او جز میں دیگر مواقع کا تذکرہ اجمالی ہے ورنہ اس کی باقی تحقیق کر لی جاتی۔

مرکزی حکومت اور ذیلی کمیٹی کا اعلان چاند بذریعہ ریڈیو، قبول شہادت کے لیے محل شہادت بھی ضروری ہے

حضرات علمائے کرام اور مفتیان شرع متین سے رویت ہلال کے باب میں راہنمائی کی درخواست کی جاتی ہے کیونکہ جب سے مجھ پر رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین کی حیثیت سے روزہ اور عید وغیرہ کے چاند کے بارے میں فیصلہ کرنے کی ذمہ داری آپڑی ہے تو میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ اس ذمہ داری کو شریعت کے مطابق پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ۔

(۱) صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں حکومتی کمیٹی کے فیصلوں پر عمل نہیں ہوتا بلکہ انہوں نے آپس میں اپنی کمیٹیاں بنائی ہیں، جن کے فیصلوں پر وہ عمل کرتے ہیں ایسی کمیٹیوں کے وجود کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۲) مذکورہ کمیٹیوں کے فیصلوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف گواہوں کی عدالت پر فیصلہ کرتی ہیں، اور اس میں ان کے بقول یہ دیکھنا بھی ضروری نہیں ہے، کہ چاند درائتی قواعد کے مطابق نظر بھی آ سکتا تھا یا نہیں؟ اور اس کی ولادت ہوئی بھی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ افق پر موجود بھی ہے یا نہیں؟ اب ایسی بدیہی بات (جس پر سارے علمائے فلکیات متفق ہیں اور ان میں اس پر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا؛ نیز اس ولادتِ قمر پر سورج گرہن بھی منحصر ہوتا ہے جو کہ لاکھوں کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ بالکل اسی وقت ہوتا ہے، جس پر ولادت قمر کا وقت بتایا جاتا ہے۔) کو بھی اگر وہ حضرات قابل اعتبار نہیں سمجھتے تو دوسرے درائتی قوانین جن کا درجہ اس قانون سے بھی کمتر کا ہے، یہ حضرات کیا خیال رکھ سکتے ہیں؟ اس میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم ان کی اس مسئلہ میں تقلید کر سکتے ہیں کہ صرف گواہوں کی عدالت پر ہی فیصلہ کریں، اور اس کو نہ دیکھیں کہ چاند درائتی قوانین کے مطابق نظر آ سکتا ہے یا نہیں؟ اور وہ اس روز افق پر موجود بھی ہے یا نہیں؟

اس میں مشکل بات یہ ہے کہ اگر ولادت قمر سے پہلے چاند کے نظر آنے کا اعلان کیا جائے تو اگلے روز چاند کے واضح طور پر آنے کی امید نہیں ہوتی، جس سے یہ تفاصیل جاننے والے حضرات بہت پریشان ہوتے ہیں اور ان میں بعض شرع متین کی توہین کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں، جیسا کے اس دفعہ رمضان ۱۴۱۸ھ کو پشاور میں جب ان حضرات کی غیر حکومتی کمیٹیوں نے پیر کے دن چاند نظر آنے کا اعلان کیا، حالانکہ اسی رات کو چاند ۹ بج کر ۵۷ منٹ پر پیدا ہونے والا تھا؛ اس لیے اگلے دن باوجود موسم صاف ہونے کے، جیسا کہ فلکیات کے ماہرین بتاتے تھے، صوبہ سرحد میں کہیں بھی چاند نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ ہر جگہ اس کے دیکھنے کی پوری کوشش کی گئی تھی اور جیسا کہ توقع تھی کہ چاند کی اطلاع کراچی اور

بلوچستان سے آسکتی ہے، چنانچہ وہیں سے شہادتیں وصول ہوئیں، اور ان ہی کی شہادتوں پر میں نے چاند نظر آنے کا اعلان کیا تھا۔ ان علمائے کرام کا مطالبہ ہے کہ ہم بھی ان کی شہادتوں کو لے کر ان پر فیصلہ کریں جس کے لیے اس دفعہ انہوں نے پوری کوشش کی؛ لیکن ولادت قمر سے پہلے چاند کے نظر نہ آنے کا سو فیصد یقین ہونے اور پورے ملک میں چاند کے کہیں اور سے نظر نہ آنے کے باوجود، اگر ہم ان کا یہ مطالبہ مان لیں تو کیا شریعت اس فیصلہ کو تسلیم کرے گی؟ اس ضمن میں یہ بھی ایک مشکل ہے کہ چاند نظر آنے یا نظر نہ آنے کا فیصلہ قاضی کے شرح صدر پر ہوتا ہے، ایسی بدیہی رکاوٹوں کے ساتھ قاضی کا شرح صدر کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

(۳): ان کے برعکس دوسری طرف کچھ علمائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ: ''بخاری شریف'' کی بعض احادیث کے بعض رواۃ پر وہم کا حکم علامہ عینیؒ نے اس لیے لگایا ہے کہ ان کی روایت قواعد ریاضیہ سے متصادم تھی۔ (مقالات کوثری صفحہ ۴۰۶، ۴۰۷) تو ایک ایسا آدمی جو چاند کے نظر آنے کی شہادت دیتا ہے چاہے وہ عادل ہی کیوں نہ ہو اس پر اس درائتی اصول کے مطابق جرح کیوں نہیں ہوسکتی کیونکہ چاند کے نظر آنے میں صحابہ کو بھی سہو ہوا تھا جن کی عدالت مسلمہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چاند کا فیصلہ تو (صوموا لرویتہ) کی حدیث شریف پر ہی کیا جائے، لیکن ایسی صورت میں کہ چاند کی پیدائش ہی نہ ہوئی ہو اور غروب شمس کے وقت وہ افق پر موجود ہی نہ ہو تو پھر آنے والی شہادتوں پر خوب جرح کر کے تحقیق کی جائے کہ کہیں ان حضرات کو دیکھنے کا سہو تو نہیں ہوا، اس کے بعد فیصلہ قاضی اپنے شرح صدر پر کرے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ کیا صوبہ سرحد کی غیر حکومتی کمیٹی کے علمائے کرام کی بات کو اس طرح تسلیم کیا جائے، اور درائتی مسلمہ قواعد کو ترک کر کے صرف عادل شواہد پر ہی فیصلہ کیا جائے یا دوسرے علمائے کرام کی بات مانی جائے کہ مسلمہ درائتی قواعد کے مطابق

جس دن غروب آفتاب سے پہلے چاند کی ولادت نہ ہوئی ہو، یا چانداس دن سورج غروب ہونے سے پہلے غروب ہو چکا ہو، تو اس دن چاند نظر آنے کی جملہ شہادتوں کو قبول نہ کیا جائے۔ اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں، اور اپنی تحقیق اور حتمی رائے قرآن و حدیث کی روشنی میں عطا فرمائیں، یہ چونکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے؛ اس لیے درخواست ہے کہ اس پر ترجیحی طور پر توجہ فرما کر جلد جواب سے سرفراز فرمائیں، میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

اس سلسلہ میں اگر کسی قسم کی وضاحت مطلوب ہو تو استفتاء واپس کرنے کے بجائے اگر مجھ سے اس کے بارے میں فون پر رابطہ کیا جائے تو عین نوازش ہوگی کیوں کہ اس سے وقت کی بچت ہوگی۔

المستفتی: محمد عبداللہ خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): پاکستان کی مرکزی حکومت کو ولایتِ عامہ حاصل ہے؛ لہٰذا اگر مرکزی حکومت نے کسی معتبر ہلال کمیٹی کے علماء سے فیصلہ کروا کر نشر کیا تو یہ فیصلہ تمام پاکستان کے لیے موجب عمل ہوگا، بشرطیکہ ریڈیو خاص ضابطہ کے تحت ہو۔

''جواہر الفقہ'' میں ''رویت ہلال کے شرعی احکام'' نامی رسالہ میں چار اکابر علماء کی جو متفقہ تجویز شائع ہوئی ہے، اس میں مرکزی حکومت کی تشکیل کردہ مرکزی کمیٹی کے اعلان کو ''سب مسلمانوں کے لیے واجب القبول بتلایا گیا ہے''۔ (جواہر الفقہ ۱/۴۰۱)

اس لیے ان علاقہ جات کا حکومتی کمیٹی کے فیصلہ پر عمل نہ کرنا درست نہیں ہے۔

اگر مرکزی حکومت نے ہر ہر علاقہ میں اس علاقہ کے لیے ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی اجازت دی، تو اس اجازت کے ماتحت اس کے شرائط کے مطابق کمیٹی تشکیل دی گئی ہے،

تب تو درست ہے ورنہ نہیں۔

(۲): قبول شہادت کے لیے محض عدالت کافی نہیں؛ بلکہ محل شہادت ہونا بھی ضروری ہے، رویت ہلال کی شہادت کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹/ تاریخ اور ۲۸ تاریخ کو تو شہادت لی بھی نہیں جائے گی، نہ شاہد کاذب قرار دیا جائے گا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ ہم نے اس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مجبوب ہے یعنی اس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں بلکہ مقطوع ہے تو ان شاہدوں کی وجہ سے اس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں کو حد قذف جاری ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۱۴۰)

آپ کے پاس جب کوئی شہادت آئے تو اولاً آپ یہ دیکھئے کہ شاہدین جس دن کی رویت کی شہادت دے رہے ہیں وہ ۲۸ تاریخ ہے یا ۲۹ تاریخ، اگر وہ ۲۸ تاریخ کی رویت کی شہادت دے رہے ہیں تو آپ محل شہادت نہ ہونے کی بنیاد پر ان شہادتوں کی سماعت ہی نہ فرمائیں، عموماً درایتی قواعد کے اعتبار سے ولادت قمر سے پہلے چاند دیکھنے والی شہادتیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

آپ نے رمضان ۱۴۱۸ھ کے تعلق سے غیر حکومتی کمیٹیوں کے جس اعلان کا سوال میں ذکر کیا ہے، وہاں بھی یہی صورت تھی کہ پیر کے دن ہندو پاک میں ۲۸ تاریخ تھی میری معلومات کے مطابق ہندو پاک میں کہیں بھی ۲۹ تاریخ نہیں تھی؛ البتہ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ محل شہادت موجود ہے، یعنی ۲۹ تاریخ ہے، لیکن درایتی قواعد کے مطابق ولادت قمر نہیں ہوئی ہے یا ولادت تو ہو چکی ہے؛ لیکن رویت کا امکان نہیں ہے اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ۲۹ تاریخ کی شام ایسا تو ہوتا نہیں ہے کہ ولادت نہ ہوئی ہو؛ اس لیے کہ اصولی طور پر اگر ولادت نہیں ہوئی ہے تو ۳۰ تاریخ کی شام

کو امکان رویت نہ ہوگا اس کے بعد والا دن نئے ماہ کا قرار نہیں دیا جا سکے گا حالانکہ تیس یوم پورے ہونے کی وجہ سے نیا ماہ شروع ہو چکا ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ولادت قمر ہو چکنے کے باوجود رویت کا امکان حسب قواعد ہیئت نہیں ہے تو کتب فقہ خصوصاً علامہ شامیؒ کی وہ بحث جوانہوں نے اپنے رسالہ "تنبیه الغافل والوسنان فی احکام هلال رمضان" کی فصل ثالث میں کی ہے (دیکھئے رسائل ابن عابدین ۱/ ۲۴۸، ۲۴۹) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول شہادت کی شروط معتبرہ عند الشرع کے ہوتے ہوئے اس کو قبول کیا جائے گا، محض عدم امکان عند اہل ہیئت کی وجہ سے اس کو رد نہیں کریں گے؛ چنانچہ اس مسئلہ میں شوافع کا مسلک بیان فرماتے ہوئے علامہ سبکیؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ "حسابی اعتبار سے عدم امکان رویت کی صورت میں حساب پر عمل کرتے ہوئے شہادت رد کر دیں گے"۔ لان الحساب قطعی والشهادة ظنية، اس کے بعد علامہ رملیؒ کے حوالہ سے علامہ سبکیؒ کے قول کی تردید نقل فرمائی ہے، اسی تردید میں "اس کی یہ بھی کہ ہوسکتا ہے کہ عادل ہونے کے باوجود شاہد کو رویت میں سہو ہوا ہو" بایں الفاظ تردید فرمائی ہے:

والاحتمالات التی ذكرها السبكی بقوله لان الشاهد قد يشتبه عليه.

الخ، لا اثر لها شرعا لامكان وجودها فی غيرها من الشهادات.

اس بحث کے آخر میں خود علامہ شامیؒ نے جو تحریر فرمایا ہے وہ وہی ہے جو میں اوپر بتلا چکا ہوں۔

فحيث علم انه لا اعتماد على ما يقوله علماء النجوم والحساب فی اثبات الشهر لعدم اعتباره فی الشرع المعلق فيه وجوب الصوم او الفطر على الرؤية لا على القواعد الفلكية ظهر وتبين خطأ من عارض رؤية الشهر فی عامنا

هـذا الثابتة بالبينة التى اعتبرها الشارع صلى الله تعالىٰ عليه و سلم و بنى الاحكام عليها بمجرد الاخبار عن جماعة، انهم رأوا الهلال نهاراً واعتمد على ذلك حتى صام يوم عيده بلا مسوغ شرعى بل بمحض الاحتمال العقلى المخالف لنصوص الشرع التى اعتبرها الأئمة المجتهدون واتباعهم المعتمدون. (رسائل ابن عابدين ۱/۲۴۹)

(۳): ''مقالات کوثری'' میرے پاس نہیں؛ اس لیے اس سلسلہ میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۷/ ذوالقعدہ ۱۴۱۸ھ

رویتِ ہلال میں سعودیہ کا فیصلہ مسلکِ حنفی کی نظر میں

از حسن ٹنکاروی بریڈفورڈ ۸ یو، کے ۲/ستمبر ۱۹۹۱ء

محترم المقام حضرت مولانا مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین مندرجۂ ذیل ہلال کے بارے میں؟

(۱): سعودی عربیہ میں ہمیشہ سب سے پہلے چاند کی رویت ہوتی ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا۔

(۲): پوری دنیا سے ہمیشہ ایک دن پہلے رویتِ ہلال ہوتی ہے، ہندو پاک سے اکثر دو دن اور ہمیشہ ایک دن قبل رویت کا اعلان ہوتا ہے۔

(۳): سعودیہ سے مغربی ملک مراکش میں باقاعدہ چاند دیکھنے کا انتظام ہے، اور اس کے لیے وزارۃ الاوقاف بھی ہے، وہاں سے بھی سعودیہ ہمیشہ ایک روز قبل رویت کا

اعلان کرتا ہے اور امسال جمادی الاولیٰ میں دو روز مؤخر تھا۔

(۴): سعودیہ کی رویت کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہاں چاند دیکھ کر فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ قران شمس وقمر (نیومون) ہوتے ہی رویت مان لی جاتی ہے۔

(۵): وہاں رویت کا فیصلہ ہمیشہ شہادت پر ہوتا ہے کبھی عمومی رویت نہیں ہوتی۔

(۶): نیومون (قران شمس وقمر) کے فوراً بعد یا چار چھ گھنٹے اور کبھی تو نیومون سے پہلے سے ہی رویت ہو جاتی ہے۔ (اوقات نیومون کی فہرست سے اس کا مکمل ثبوت ہوتا ہے)۔

(۷): کئی شہادتیں موجود ہیں کہ صبح مشرق میں چاند نظر آیا اور اسی شام کو سعودیہ نے رویت کا اعلان کیا۔

(۸): سورج گہن میں لگا ہوا ہے اور اسی وقت سعودیہ نے رویت کا اعلان کر دیا، حالانکہ یہ ناممکن ہے (ثبوت کے لیے سورج گہن اور تاریخ سعودیہ کی فوٹو کاپی پیش خدمت ہے)۔

(۹): سعودیہ کی رویت کے مطابق کبھی چودھویں، پندرھویں تاریخ کو بدر نہیں ہوتا بلکہ پندرھویں اور سولھویں کو بدر ہوتا ہے۔ (ہر مشاہدہ کرنے والے کو اس کا بخوبی علم ہے)

(۱۰): کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں رویتِ ہلال کمیٹی ہے اور دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں تو کیا:

(۱) یہ رویت صحیح ہے؟ اور اس سے ہم برطانیہ والے رویت کی اطلاع لے سکتے ہیں؟

(۲) اطلاع لینے کا شرعی معتبر طریقہ کیا ہے؟ بینوا و توجروا.

رمضان وشعبان بہت قریب ہے؛ اس لیے جلد جواب مرحمت فرمائیں، ہم لوگوں کی تراویح اور روزے اور عیدین کا اہم مسئلہ ہے۔

از: مولوی حسن محمد ٹنکاروی

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب چاند کی رویت عام نہ ہو سکے صرف دو چار آدمیوں نے دیکھا ہو تو یہ صورتِ حال اگر ایسی فضا میں ہو کہ مطلع صاف ہو، چاند دیکھنے سے کوئی بادل یا دھواں غبار وغیرہ نہ ہو، تو ایسی صورت میں صرف دو تین آدمیوں کی رویت اور شہادت شرعاً قابلِ اعتماد نہ ہوگی جب تک مسلمانوں کی بڑی جماعت اپنے دیکھنے کی شہادت نہ دے چاند کی رویت تسلیم نہ کی جائے گی، جو دیکھنے کی شہادت دے رہے ہیں اس کو ان کا مغالطہ یا جھوٹ قرار دیا جائے، ہاں اگر مطلع صاف نہیں تھا، غبار آلود تھا، دھواں، بادل وغیرہ افق پر ایسا تھا جو چاند دیکھنے میں مانع ہوسکتا ہے ایسی حالت میں رمضان کے لیے ایک ثقہ کی اور عیدین وغیرہ کے لیے دو ثقہ مسلمانوں کی شہادت کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۳۹۹، ۴۴۰)

یہ وہ طریق کار ہے جو رویتِ ہلال کے فیصلہ کے لیے احناف کے نزدیک ضروری ہے، حکومت سعودیہ میں رویتِ ہلال کا فیصلہ جس انداز سے ہو رہا ہے وہ اہلِ علم کے درمیان موضوعِ نزاع ہے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلھم نے اس سلسلہ میں جو رائے قائم فرمائی ہے وہ ایک موزون اور صائب رائے ہے وہ فرماتے ہیں: ”حکومت سعودیہ میں رویتِ ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے بھی خلاف ہوتا ہے؛ اس لیے وہ پاکستان کے لیے حجت نہیں“۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۱۶)

جب وہ فیصلہ مسلکِ حنفی کے خلاف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے لیے حجت نہیں تو برطانیہ میں مقیم احناف کے لیے کیسے حجت ہوگا؟

(۲) برطانیہ کے حالات کے پیش نظر اہلِ برطانیہ کے لیے جو طریق کار مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب مدظلھم نے تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے: ”اپنے نزدیک

کے ممالک جہاں پر طلوع وغیرہ میں زیادہ تفاوت نہ ہو اور انتیسویں کا چاند نظر آتا ہو، ایسے ملک سے رابطہ اور تعلق رکھنا چاہیے اور یہ زیادہ مناسب ہے، اور اس کی صورت یہ ہو کہ ہلالِ رمضان کے بارے میں وہاں کے تین چار دین دار اور معتمد آدمیوں کے فون کی خبر پر جب تم ان کی آواز اچھی طرح پہچان سکو اور تمھیں چاند نظر آنے کا یقین پیدا ہو جائے تو رمضان کا فیصلہ کر دو؛ لیکن ہلالِ عید کے لیے شہادت شرط ہے اس کے لیے ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے دو دین دار معتمد آدمی خود چاند دیکھ کر بذریعۂ طیارہ (ہوائی جہاز) آ کر شہادت دیں، یا یہاں سے دو دین دار معتمد آدمی جا کر خود چاند دیکھنے والوں کی گواہی لیں یا وہاں کے مفتی، قاضی، خطیب یا ہلال کمیٹی کے صدر معتمد علیہ کا سندی فرمان لے آئیں جس کو یہاں کے معتمد علماء قبول کر لیں تو اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۷۷، ۷۸)

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو فتاویٰ رحیمیہ ۵/ ۱۸۲ تا ۱۸۶، جواہر الفقہ ۱/ ۴۰۰ تا ۴۰۲ کا مطالعہ فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری عفی عنہ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　۱۹/ جمادی الاخری ۱۴۱۲ھ

ٹنکاریہ (بھروچ) میں چاند دکھائی دینے پر راندیر چاند کمیٹی کا فیصلہ

امابعد: ضلع بھروچ کے گاؤں موٹا ٹنکاریہ میں (۱) جناب ماسٹر ابراہیم اسماعیل بھوتا صاحب۔ (۲) جناب احمد اسماعیل مؤذن صاحب۔ (۳) جناب عبداللہ موسیٰ احمد صاحب نے ۲۹ ویں ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ بدھ کی شام کو مغرب کی نماز کے بعد اپنے چاند دیکھنے کی شہادت دارالعلوم کنتھاریہ کے مفتی صاحب وغیرہ کے سامنے دی، یہ اطلاع ہمیں بذریعہ اشتہار موصول ہوئی تو راندیر سے جناب موسیٰ ماسٹر صاحب، حافظ سید مرغوب، حاجی

نذیر ابراہیم قریشی مذکورہ گواہوں کو لینے کے لیے گئے یہ حضرات پہلے دارالعلوم کنتھاریہ پہنچے اور مذکورہ تینوں گواہوں کے معتبر ہونے اور شہادت دینے کی تحقیق وتصدیق حاصل کر کے موٹا ٹنکاریہ گئے اور وہاں سے دو گواہوں (۱) احمد اسماعیل مؤذن صاحب (۲) عبداللہ موسی احمد صاحب کو لے کر راندیر پہنچے (تیسرے گواہ جناب ماسٹر ابراہیم بھوتا صاحب ان کے ہمراہ نہ آسکے وہ دوسرے دن راندیر تشریف لائے) ان دونوں حضرات نے مجلس شہادت کے حاضرین کے روبرو خدا کو حاضر وناظر رکھ کر قسمیہ شہادت دی کہ ہم نے ۲۹/ ویں ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ بدھ کی شام کو مغرب کی نماز کے بعد یکم ذی الحجہ کا چاند دیکھا ہے اور اس پر ہم کو پورا وثوق واطمینان ہے، جناب ماسٹر ابراہیم اسماعیل بھوتا صاحب دوسرے دن راندیر تشریف لائے اور انھوں نے بھی ہمارے سامنے قسمیہ شہادت دی، دارالعلوم کنتھاریہ کے علماء کا مذکورہ گواہوں پر اعتماد اور شہادت کی تصدیق نیز ہمارے سامنے قسمیہ شہادت دینے کی بناء پر ہمیں اطمینان حاصل ہوا جس کی بنیاد پر ہم نے بروز جمعرات ۷/ اگست ۱۹۸۶ء کو یکم ذی الحجہ ہونے کا اور ۱۶/ اگست ۱۹۸۶ء بروز سنیچر کو عید الاضحیٰ (بقر عید) ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

وصلّی اللّٰہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

حاضرین مجلس شہادت کی دستخط:

(۱) سید عبدالرحیم لاجپوری غفرلہ　　(۲) محمد رضا اجمیری

(۳) عبدالغنی کاوی　　(۴) اسماعیل واڑی والا

(۵) سید ابراہیم حاجی میر وفائی　　(۶) ایم۔اے۔صالح بھائی

(۷) عارف حسن

دارالافتاء جامعہ ڈابھیل کی تائید

تاریخ ٦/ ٨/ ١٩٨٦ء بدھ کو مغرب کی نماز کے بعد ماہ ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کی معتبر گواہی کے موصول ہونے کی بنیاد پر راندیر چاند کمیٹی نے عیدالاضحیٰ (بقرعید) تاریخ ١٦/ ٨/ ١٩٨٦ء سنیچر کو ہونے کا فیصلہ کیا ہے؛ اس لیے سنیچر کو عید کی جائے۔ راندیر چاند کمیٹی اطلاع دے رہی ہے۔

گجرات سماچار ١١/ اگست ١٩٨٦ء

یہ نقل مطابق اصل ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

العبد: احمد عفی عنہ خانپوری

محمد سعید عفی عنہ، مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک ضلع بلساڑ گجرات

عباس داؤد بسم اللہ

مذکورہ فیصلہ پر مولانا منت اللہ رحمانی کے چند شبہات

مکرم ومحترم جناب مولانا اکرام علی صاحب زید مجدھم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط عیدالاضحیٰ کے چاند کے سلسلہ میں ایک فیصلہ اور اعلان موصول ہوا، جواب حسب ذیل ہے:

اس فیصلہ میں ساری تفصیلات درج ہیں، لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ٢٩/ ذی قعدہ کو موٹا ٹنکاریہ میں مطلع صاف تھا یا ابر آلود؟ مفتی صاحباں اور مدرس حضرات نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؛ اس لیے ہم پر مطلع کا معاملہ قطعاً غیر واضح ہے، جس کی اس موقعہ پر اہم ضرورت ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خط اور یہ اشتہار شہادۃ علی

کتاب القاضی ہے لیکن یہ خط اور اشتہار کے لانے والے نے لاکر آپ کو دیا ہے مجھے نہیں، ظاہر ہے کہ جتنے واسطے بڑھیں گے اسی قدر اشتباہ زیادہ ہوگا۔ لانے والے سے میں واقف ہوں لیکن مجھے اس سے واقفیت نہیں ہے کہ وہ شہادت کے اہل ہیں یا نہیں؟

مولانا اکرام علی صاحب زید مجدہم، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ہیں، اور ابھی دو تین دن پہلے وہاں سے مکان آئے ہیں؛ مگر ان کی دستخط اس تحریر پر نہیں ہے، قاری احمد اللہ صاحب بھی غالباً عالم ہیں؛ مگر ان کی دستخط بھی اس تحریر پر نہیں ہے۔

ان سارے حالات کے جمع ہو جانے کے بعد اس تحریر کو گجرات کے سوا دوسرے علاقہ کے لیے عید الاضحیٰ کی رویت سے متعلق ایک فیصلہ تسلیم کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لیے میں اپنے سابقہ فیصلہ ہی پر قائم ہوں کہ رویت ۲۹/ ذی قعدہ کی ثابت نہیں ہے؛ اس لیے عید اضحیٰ کی نماز ۱۷/ اگست بروز اتوار کو ہوگی۔ آپ اس پر غور فرمالیں کہ اگر رویت ۳۰/ ۲۹ میں دائر ہوگئی ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ نماز ۱۷/ اگست کو ادا کی جائے۔ والسلام

منت اللہ، مقیم: خانقاہ رحمانی مونگیر

۸/ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ یوم جمعہ استاذ خانقاہ رحمانی مونگیر

مجھے اس خط کے مضمون سے اتفاق ہے۔ محمد ظفیر الدین (مفتی دارالعلوم دیوبند)

معروضاتِ فقیر بر گرامی نامۂ امیر

گجرات میں واقع اہل علم کی مشہور بستی راندیر (سورت) میں حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری صاحب دامت برکاتہم (صاحب فتاوی رحیمیہ) اور حضرت مولانا محمد رضا اجمیری صاحب دامت برکاتہم (گجرات کی مشہور بزرگ شخصیت اور شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ راندیر) اور مولانا مفتی عبدالغنی صاحب مدظلہم (مفتی دارالعلوم اشرفیہ

راندیر) اور مولانا مفتی اسماعیل واڈی والا صاحب مدظلہم (مفتی جامعہ حسینیہ راندیر) اور دیگر حضرات کے سامنے ذوالحجہ کے رویت ہلال کی شرعی شہادت پیش ہونے پر ان حضرات نے ثبوت رویت کا فیصلہ صادر فرما کر بذریعۂ پوسٹر مع دستخط حضراتِ فیصلہ کنندگان ومہر حضرت مفتی لاجپوری صاحب دامت برکاتہم اعلان کیا، اور اسی اعلان کی بنیاد پر پورے علاقہ میں عید الاضحیٰ یوم شنبہ کو منائی گئی۔ جامعہ ڈابھیل کے دارالافتاء نے اسی فیصلہ واعلان کی بنیاد پر عید الاضحیٰ یوم شنبہ کو ہونے کا اعلان کیا، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب مدظلہم تو اس اعلان سے قبل ہی وطن کے لیے روانہ ہو چکے تھے؛ البتہ مولانا قاری احمد اللہ صاحب (مجود وصدر شعبۂ قراءت وتجوید جامعہ ڈابھیل) اس وقت تک وطن کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے انہوں نے چاہا کہ میں اس اعلان کی ایک کاپی اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ وہاں امارت شرعیہ بہار کے سامنے پیش کی جائے، لیکن چونکہ اس اعلان کی زبان اگرچہ اردو تھی؛ مگر رسم الخط گجراتی تھا اور یہ حضرات گجراتی رسم الخط سے واقف نہیں؛ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کو اردو رسم الخط میں منتقل کیا جائے، چنانچہ اس اعلان کو اردو رسم الخط میں تحریر کر کے بطور تصدیق جامعہ ڈابھیل کے دارالافتاء کی مہر اور مفتیان کی دستخط اور مہتمم صاحب کی دستخط ثبت کیے گئے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب مدظلہم کی دستخط اس لیے نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہاں موجود ہی نہیں تھے، اور وہ ہوتے تب بھی ان کی دستخط اس پر نہیں لی جا سکتی؛ اس لیے کہ تصدیق کے لیے ضرورت تھی کہ تصدیق کنندگان اردو اور گجراتی دونوں رسم الخط سے واقف ہوں جو مولانا موصوف میں نہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا قاری احمد اللہ صاحب زید مجدہم موجود تھے پھر بھی ان کی

دستخط بحیثیت تصدیق کنندہ نہیں لی گئی، اس تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم کی تحریر پر غور فرمائیں، اولاً تو اس تحریر کی حیثیت طے کرنا ضروری تھا کہ یہ اعلان فیصلہ ہے کہ کتاب القاضی؟ فقہ سے معمولی مناسبت رکھنے والا شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کی حیثیت اعلان محض کی ہے، کتاب القاضی کی نہیں۔ چنانچہ حضرت امیر شریعت مدظلہم کی تحریر سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی یہی سمجھا ہے؛ اس لیے کہ انہوں نے اپنے گرامی نامہ کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کی ہے: ''آپ کا خط اور عیدالاضحیٰ کے چاند کے سلسلہ میں ایک فیصلہ اور اعلان موصول ہوا'' جب کہ کتاب القاضی ہونے والی بات محض ایک احتمال کے درجہ میں لکھی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط اور یہ اشتہار شہادت علی کتاب القاضی ہے، اور اس تحریر کو کتاب القاضی پر محمول بھی کیسے کیا جا سکتا ہے، جب کہ کتاب القاضی والی بات اس میں نہیں ہے، مثلاً: کتاب القاضی میں مکتوب الیہ کی تعیین اور اس سے خطاب ضروری ہے؛ چنانچہ جس میں ابتداء ہی عمومی انداز میں ہو وہ کتاب القاضی معتبر ہی نہیں، ہاں مخاطب کسی متعین شخصیت کو بنا کر بعد میں عموم کر دیا ہو تو جائز ہے۔ اس کا کاتب ہی کی طرف سے سرمہر ہونا ضروری ہے، وغیر ذلک؛ اس لیے اس بناء پر اس کا رد کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

اب یہ طے ہو جاتا ہے کہ یہ اعلان ہے، اور اعلان میں اس کی تصریح ضروری نہیں کہ مطلع صاف تھا یا ابر آلود؛ بلکہ اعلان تو بذریعہ مدافع وقنادل بھی معتبر ہے، جس میں کسی بھی قسم کی کوئی تصریح نہیں ہوتی؛ اس لیے اعلان تسلیم کر لینے کے بعد یہ اشکال بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ موسم باراں کا ہونا جس میں عموماً مطلع ابر آلود رہتا ہے اور فیصلہ کنندگان کا قبول شہادت کے شرائط کا ماہر ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس اشکال کی گنجائش

نہیں، غالباً اسی لیے حضرت مدظلہم نے کتاب القاضی والا احتمال پیدا کر دیا؛ حالانکہ کتاب القاضی میں قاضی کاتب سے وصول کرنے والے حضرات ہی مکتوب الیہ کو وہ خط خود پہنچائیں یہ ضروری ہے اگر درمیان میں انھوں نے کسی کو دے دیا تو وہ کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں وہ خط قابل قبول نہیں پھر یہ جملہ ”ظاہر ہے جتنے واسطے بڑھیں گے اسی قدر اشتباہ زیادہ ہوگا“ بے معنی ہے۔

پھر حضرت امیر مدظلہم کے کلام میں تدافع ہے، ایک طرف تو فرما رہے ہیں: لانے والے سے میں واقف ہوں لیکن مجھے اس سے واقفیت نہیں کہ وہ شہادت کے اہل ہیں یا نہیں؟ اور بعد میں یوں بھی رقم طراز ہیں: ”قاری احمد اللہ صاحب بھی غالباً عالم ہیں؛ مگر ان کے دستخط بھی اس تحریر پر نہیں ہیں“۔

نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ جس مقام پر فیصلہ کیا گیا ہو کیا وہاں موجود ہر عالم کا اس میں شریک ہونا ضروری ہے یا فیصلہ کرنے والی جماعت علماء چاہے وہ قلیل ہو اس کا معتبر ہونا کافی ہے؟ ہر عالم کے موجود و شریک ہونے کا مطالبہ تو نظیر ہے اس مطالبہ کی کہ مثلاً اسی مقدمہ میں مدعی علیہ یوں کہے کہ فلاں عالم صاحب یا بزرگ صاحب اس معاملہ میں شہادت دیں گے تب ہی میں قبول کروں گا ورنہ نہیں، کیا اس کے اس مطالبہ کو درست کہا جا سکتا ہے؟۔

اور آخر میں حضرت امیر مدظلہم کے اس ارشاد ”اس تحریر کو گجرات کے سوا دوسرے علاقہ کے لیے عیدالاضحیٰ کی رویت سے متعلق ایک فیصلہ تسلیم کرنا صحیح نہیں ہے“ کا مطلب اگر یہ ہے کہ بطریق جواز واعتبار صحیح نہیں ہے، تو جواب نمبر تین میں مذکور تفصیل وتنبیہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بات جمعیت علماء کے متفقہ فیصلہ اور علماء پاکستان کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے، اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ بطریق وجوب عمل ونفاذ، تو جیسے کہ جواب سے

معلوم ہوا ہوگا یہ مسئلہ فیصل شدہ نہیں؛ اس لیے کہ اس کی بنیاد حدود داختیار کی تحدید پر ہے، اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ تحدید قانونی تو ہے نہیں، صرف اعتماد اور مرجعیت کی بنیاد پر ہے، تو اعتماد کے لیے حضرت مفتی سید عبد الرحیم صاحب مدظلہم کی شخصیت کافی ہے؛ اس لیے کے آپ کے فتاویٰ پر ہندو پاک کے اکابر کا اعتماد ہے، اور ملک میں پیش آنے والے اہم اور پیچیدہ مسائل میں آپ کو مرجعیت بھی حاصل ہے، ہاں عمومی مسائل لوگ مقامی علماء سے ہی دریافت کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اشکال جو حضرت امیر مدظلہم کی تحریر میں نہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی کو پیش آوے؛ اس لیے اس کی جواب دہی ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اصل اعلان گجراتی رسم الخط میں تھا اس کو اردو رسم الخط میں منتقل کیا گیا، کیا یہ بات موجب اشتباہ ہوسکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک نوع کی ترجمانی ہے، کامل ترجمانی تو یہ ہوتی ہے کہ ایک زبان (لغت) سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے، جب کہ یہاں زبان تو اصل اعلان کی اردو ہی تھی صرف رسم الخط گجراتی تھا اس کو اردو رسم الخط کا جامہ پہنایا گیا، اور ترجمانی اصل کے قائم مقام ہے؛ اس لیے حدود وقصاص جہاں شہادت علی الشہادت اور کتاب القاضی کو بھی ”الحدود تندرأ بالشبهات“ کے اصول کے پیش نظر کافی نہیں سمجھا جاتا وہاں بھی ترجمانی سے کوئی شبہ واشتباہ پیدا نہیں ہوتا، تفصیل کے لیے دیکھیے: الاشباہ والنظائر ص ۱۲۸ مطبوعہ بیروت قبیل القاعدة السابعة من النوع الثانی .

هـذا مـا سـنح لی ان كان صوابا فمن الرحمن، وان كان خطأ فمنى ومن الشيطان وما ابرى نفسى ان النفس لامارة بالسوء .

اس تحریر سے حضرت امیر شریعت مدظلہم کی تنقیص حاشا وکلا، ہرگز مقصود نہیں

صرف علمی محاسبہ مقصود ہے۔ و اللہ علیم بذات الصدور ۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

مفتیٔ گجرات حضرت مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ کی تائید

محترم المقام حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون! آپ کا رقعہ موصول ہوا۔آج ہی آپ کا پورا مضمون اور جواب حضرت اقدس مفتی صاحب مدظلہم کو سنایا، گو حضرت مفتی صاحب کی طبیعت مضمحل ہے، مگر بہت دلچسپی سے سنا اور آخر میں اس پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔اور فرمایا کہ بہت خوب لکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے کہ مفتی صاحب کو ملک گیر مرجعیت حاصل ہے، اس کے ثبوت کے لیے آپ نے جو لکھا ہے وہ کافی ہی ہے۔مزید حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ایک تازہ مکتوب (جو مستقل طبع کرالیا ہے) ارسال ہے انشاءاللہ اس سے حضرت مفتی صاحب کی ملک گیر شخصیت ہونے کے ثبوت پر مزید تقویت حاصل ہوگی، آپ مناسب سمجھیں تو اپنے جواب کے ساتھ یہ مطبوعہ پرچہ بھی بھیج دیں۔حضرت مفتی صاحب سلام عرض فرمارہے ہیں، طالب دعا بھی ہیں، ناکارہ بھی دست بستہ سلام عرض کرکے طالب دعا ہے۔فقط والسلام۔　　　ناکارہ: اکرام الحق غفرلہ، ۵/صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

مطبوعہ پرچہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے مشورہ سے ارسال خدمت ہے۔

تحدیث نعمت

''فتاوی رحیمیہ'' کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے تأثرات وکلمات طیبات

جناب مولانا محمد مرتضی صاحب ناظم کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ گجرات کے دورہ

سے واپسی کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ''میں (مولانا محمد مرتضی صاحب) نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو آپ کا سلام و پیام پہنچایا مولانا علی میاں نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں سلام لکھ دو اور لکھ دو کہ:

''میں مفتی صاحب کے لیے ان کی صحت و عافیت اور درازئ عمر کے لیے با قاعدہ مداومت کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ الحمدللہ اس وقت آپ محقق، فقیہ اور ماہر فن ہیں اور آپ کی تحقیق سے پورے ملک کو مستفید ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، آپ کی تحقیق عمیق ہر خاص و عام کے لیے اطمینان بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ زمانۂ دراز تک آپ کے فیوض و برکات کو قائم رکھیں''۔ آمین　　ناچیز خادم: مرتضی ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

بذریعۂ خط چاند کی خبر کی شرعی حیثیت

محترم المقام حضرت مفتی صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ضروری تحریر یہ ہے کہ گجرات کی رویت ہلال والی تحریر جس پر مفتیان کرام کے دستخط ثبت ہیں، جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے مہتمم جناب مولانا سعید احمد صاحب بزرگ نے مولانا قاری احمد اللہ صاحب استاذ تجوید جامعہ تعلیم الدین کی معرفت مولانا اکرام علی صاحب کے پاس چمپانگر بھاگلپور بھیجی، یہ تحریر حضرت امیر شریعت مدظلہ کی خدمت میں دو عالم دین کی معرفت بھیجی گئی تاکہ وہ بحیثیت امیر کے اس کا اعلان فرماویں، حضرت امیر شریعت مدظلہ کا جواب بھی ارسال خدمت ہے ان کے جواب کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جواب مطلوب ہیں، امید کہ مدلل جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

سوالات:

(۱): یہ تحریر محض ایک اعلان اور اشتہار ہے یا اس کی حیثیت فتویٰ کی ہے؟

(۲): بقول حضرت امیر شریعت بہار واڑیسہ اگر یہ تحریر شہادت علی کتاب القاضی ہے تو بذریعہ ڈاک موصول ہونے پر عید الفطر وعید الاضحیٰ کا اعلان کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ تحریر کسی کی معرفت موصول ہو تو لانے والے شخص میں کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے، کیا عدد وعدالت بھی شرط ہے؟

(۳): یہ تحریر ریڈیو، ٹیلی فون، تار کی خبر کے مساوی ہے یا زائد یا کم؟

(۴): جب مفتیان کرام نے عید الاضحیٰ کا اعلان محض تین آدمیوں کی حلفیہ شہادت پر کیا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مطلع ابر آلود ہوگا ورنہ جم غفیر کا ہونا ضروری ہے، کیا ایسی صورت میں تحریر میں مطلع کی تصریح نہ ہونے کی بنیاد پر اس کو مسترد کر دینا صحیح ہوگا؟

(۵) جو ادارہ ریڈیو، ٹیلی فون کی خبر پر رمضان وعیدین کا اعلان کرتا ہو اگر وہاں کا ذمہ دار اس تحریر کو مسترد کر دے تو اس کا یہ فعل شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہوگا یا غلط؟

المستفتی: محمد ظہیر الدین قاسمی چمپانگر، بھاگلپور ۲۶/ اگست ۱۹۸۶ء

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اس تحریر کی حیثیت محض اعلان کی ہے، اعلان جس طرح منادی کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی طرح دور حاضر میں پوسٹر وغیرہ بھی اعلان ہی کا ایک طریقہ ہے۔ یہ شہادت یا خبر نہیں ہے؛ اس لیے اس میں ان تمام شرائط وقیود جن کی شہادت یا خبر میں رعایت کی جاتی ہے، رعایت ضروری نہیں ہے؛ البتہ اس میں اتنا ضروری ہے کہ جس کمیٹی یا شخصیت کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا ہے اسی کا یہ اعلان ہے اس کا غلبۂ ظن ہو۔

خبر منادی السلطان مقبول عدلا کان او فاسقا، کذا فی جواهر الاخلاطی.

(فتاوی عالمگیری، کتاب الکراهية ۵/۳۰۹)

قلت: والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او رؤية القنادل من المصر؛ لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به، واحتمال ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة فى ليلة الشك الا لثبوت رمضان. (شامی ۲/۹۱)

چنانچہ اس تحریر میں دارالافتاء کی مہر اورارا کین کمیٹی کے دستخط اسی لیے ثبت ہیں کہ مطلوبہ غلبۂ ظن حاصل ہو اور تزویر وجعل سازی کا احتمال باقی نہ رہے، بلکہ غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ توپ کے گولوں اور قنادل کی روشنی سے حاصل ہونے والے غلبۂ ظن (جس کی تصریح علامہ شامی کی عبارت میں موجود ہے) کے مقابلے میں اس قسم کی تحریر سے حاصل ہونے والا غلبۂ ظن زیادہ مضبوط ہے؛ اس لیے کہ اول الذکر کی دلالت عقلی ہے جب کہ ثانی الذکر کی دلالت وضعی ہے، اور افادۂ علم کی جو شان وضعی میں ہے وہ عقلی میں نہیں۔

(۲): یہ شہادت علی کتاب القاضی نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا۔ ہاں شہادت علی کتاب القاضی میں عدد وعدالت شرط ہے؛ اس لیے اگر وہ بذریعہ ڈاک موصول ہو تو عید کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ کتب فقہ میں ”باب كتاب القاضی الى القاضی“ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ (دیکھئے درمختار مع الشامی ۴/۳۵۰ تا ۳۵۵)

(۳): اس کے جواب سے پہلے بطور تمہید دو باتیں جاننا ضروری ہے:

(الف): شہادت اور خبر دو چیزیں الگ الگ ہیں، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، بعض کلام بحیثیت خبر کے معتبر اور قابل اعتماد ہوتے ہیں؛ مگر بحیثیت شہادت نا قابل قبول ہوتے ہیں، شریعت اسلام میں تو ان کا فرق بہت واضح اور صاف ہے ہی، آج کل

تمام دنیا کی عدالتوں میں بھی ان دونوں چیزوں کا فرق قانونی حیثیت سے محفوظ ہے، ٹیلی گراف، ٹیلیفون، ریڈیو، اخبارات اور خطوط کے ذریعے جو خبریں دنیا میں نشر ہوتی ہیں ان کا نشر کرنے والا، لکھنے والا اگر کوئی قابل اعتماد شخص ہے تو بحیثیت خبر کے وہ سارے جہاں میں قبول کی جاتی ہے، اس پر اعتماد کر کے لاکھوں کروڑوں کے کاروبار ہوتے ہیں، دنیا بھر کے معاملات ان خبروں پر چلتے ہیں، عدالتیں بھی بحیثیت خبر کے ان کو تسلیم کرتی ہیں؛ لیکن کسی مقدمہ اور معاملہ کی شہادت کی حیثیت سے ان خبروں کو کوئی دنیا کی عدالت قبول نہیں کرتی اور ایسی خبروں کی بنیاد پر کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں دیتی؛ بلکہ یہ ضروری قرار دیتی ہے کہ گواہ مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر گواہی دے، تاکہ اس پر جرح کی جا سکے اور چہرہ بشرہ کی کیفیت سے اس کو پرکھا جا سکے یہی حکم شریعت اسلام کا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خبر کوئی حجت ملزمہ نہیں جو دوسرے کو ماننے پر اور اپنا حق چھوڑنے پر مجبور کر دے جس کو خبر دینے والے کی دیانت اور سچائی پر بھروسہ ہو وہ مانے گا جس کو نہ ہو وہ ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بخلاف شہادت کے کہ وہ حجت ملزمہ ہے، جب شرعی شہادت سے کسی معاملہ کا ثبوت قاضی یا جج نے تسلیم کر لیا تو قاضی یا جج اس پر مجبور ہے کہ اس کے موافق فیصلہ دے اور فریق مخالف اس پر مجبور ہے کہ اس کو تسلیم کرے یہ اجبار و الزام صرف خبر سے نہیں ہوتا اسی لیے صرف خبر کی تصدیق پر کوئی پابندی بجز ثقہ اور قابل اعتماد ہونے کے نہ شرعاً ہے نہ موجودہ عدالتوں کے قانون میں، اور شہادت کے لیے عام عدالتی قوانین میں بہت سی پابندیاں دنیا میں رائج ہیں، اور اسلامی شریعت نے بھی اس کے لیے نصاب شہادت کا مکمل ہونا اور شاہد کے حالات کا جائزہ لے کر شرائط شہادت کا جانچنا ضروری قرار دیا ہے۔ (رویت ہلال، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ: ۳۴، ۳۵)

رمضان کے علاوہ دوسرے ہر چاند کی شہادت کے لیے نصاب شہادت اور اس

کی تمام شرائط کوضروری قرار دیا گیا اور سب فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے۔(ایضا ۳۶)

شہادت ہلال کے لیے آٹھویں شرط مجلسِ قضاء ہے یعنی شاہد کے لیے ضروری ہے کہ قاضی کی مجلس میں خود حاضر ہوکر شہادت دے پسِ پردہ یا دور سے بذریعۂ خط یا ٹیلیفون یا وائرلیس ریڈیو وغیرہ جدید آلات کے ذریعہ کوئی شہادت دے تو وہ شہادت نہیں؛ بلکہ محض ایک خبر کا درجہ رکھے گی، جن معاملات ومسائل میں خبر کافی ہے ان میں اس پر عمل جائز ہوگا، اور جن معاملات میں ثبوت کے لیے شہادت ضروری ہے ان میں یہ خبر کافی نہ سمجھی جائے گی اگرچہ آواز پہچانی جائے اور بولنے والا ثقہ اور قابلِ شہادت ہو۔(ایضا ۴۰)

(ب): اسی طرح فیصلہ اور فیصلہ کا اعلان اور فیصلہ کی خبر؛ تینوں الگ الگ چیزیں ہیں:

فیصلہ کا مطلب تو یہ ہے کہ قاضی یا ہلال کمیٹی کے سامنے رویت کی شہادتیں گذریں، اور ان کی روشنی میں وہ فیصلہ کریں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ضابطۂ شہادت کی پابندی کی جائے جس کی شریعت میں تین صورتیں ہیں: (۱) شہادت علی الرؤیۃ۔ (۲) شہادت علی شہادت الرؤیۃ۔ (۳) شہادت علی القضاء۔ (اس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، اجمالا دیکھنا چاہیں تو جواہر الفقہ ۱/۴۰۰، ۴۰۱ میں دیکھئے)

اعلان کا مطلب یہ ہے کہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے جو فیصلہ کیا ہے اس کو لوگوں کے درمیان شائع وعام کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے اس کے لیے ضابطۂ شہادت کی کوئی پابندی نہیں ہے؛ بلکہ ہر وہ طریقہ جس کے ذریعہ لوگوں کو (اس بات کا) غلبۂ ظن حاصل ہوجائے (کہ یہ اعلان متعلقہ قاضی یا ہلال کمیٹی کی طرف سے کیا جارہا ہے) اس کا اختیار کرنا کافی ہے چنانچہ اس کے لیے توپ کے گولے یا پوسٹر وغیرہ (بشرطیکہ احتمال تزویر

نہ ہو) بھی کافی ہے جیسا کہ نمبر ا میں گذر چکا۔ اس مقصد کے لیے ریڈیو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اور اس میں غلبۂ ظن پیدا کرنے اور احتمال تزویر سے بچانے کی صورت وہ ہوگی جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھی ہے: ''ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے صرف وہ فیصلہ نشر کرے جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے وہ الفاظ بعینہ نشر کیے جائیں''۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۱۸۹)

دیکھئے اس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جو قیود لگائی ہیں وہ اسی غلبۂ ظن پیدا کرنے اور احتمال تزویر سے بچانے کے لیے ہیں۔ علامہ شامیؒ کی جواب نمبر ا میں منقولہ عبارت کا یہ جملہ "واحتمال ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك الا لثبوت رمضان" اسی مقصد کی طرف مشیر ہے۔ اور اسی لیے اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ ۱۴/ ۱۵ ذوالقعدہ ۱۳۷۰ھ (بمقام مرادآباد میں باتفاق علماء واکابر یہ فیصلہ کیا گیا) ''مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ اگر ریڈیو کے ذریعہ آنے والی خبر کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جارہی ہے وہاں کے علماء نے چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا حکم کردیا ہے، خبر دینے والا بھی متعین ہو کہ کوئی مسلم معتمد خبر دیتا ہو تو اس اعلان پر اعتماد کرکے دوسرے مقامات میں بھی چاند ہوجانے کے حکم پر عمل کیا جانا جائز ہے، اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات اس کے موافق حکم کریں تو اس پر عمل کیا جائے۔ یہ حکم تمام ہندوستان اور پاکستان کے لیے ہے''۔ (کفایت المفتی جلد نہم ص ۵۰۷)۔

تیسری چیز خبر ہے، اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رویت کی خبر اور دوسری فیصلہ

کی خبر، رویت کی خبر بذریعہ ریڈیو یا ٹیلی فون کے ملی ہے تو عید میں اس کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے کہ اس کے لیے شہادت شرط ہے اور وہ موجود نہیں ہے؛ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں ''ہلال رمضان کے علاوہ عید، بقرعید یا کسی دوسرے مہینہ کے لیے ثبوت ہلال با قاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور شہادت کے لیے شاہد کا حاضر ہونا لازمی ہے، غائبانہ خبروں کے ذریعہ شہادت ادا نہیں ہوسکتی خواہ وہ قدیم طرز کے آلات خبر رسانی خط وغیرہ ہو، یا جدید طرز کے ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ'' (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۱۸۸)

دوسری فیصلہ کی خبر ہے وہ ان آلات کے ذریعہ ملی اور خبر دینے والا ثقہ آدمی ہے، اور قرائن قویہ سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے، تو وہ معتبر ہے۔ اور اس پر عمل جائز ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی کمیٹی اسی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے بجائے اس فیصلہ کا اعلان کرسکتی ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ''دوسرا کلام ٹیلی فون کے واسطہ میں ہے اور یہی مقصود بسوال ہے سو اس کا جواب ظاہر ہے کہ جن احکام میں حجاب مانع قبول ہے، اس میں غیر معتبر ہے، اور جن میں حجاب مانع نہیں اس میں اگر قرائن قویہ سے متکلم کی تعیین معلوم ہو جائے تو معتبر ہے۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۲۰۹)

اسی سلسلہ میں جواہر الفقہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ، اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب مدظلہم، کا متفقہ فیصلہ موجود ہے کہ ''ذیلی کمیٹی اگر باقاعدہ شہادتیں لے کر کوئی فیصلہ کرتی ہے تو فیصلہ شہادت کی بنیاد پر ہو چکا، اب صرف اعلان کا کام باقی ہے اس کے لیے شہادت ضروری نہیں؛ بلکہ ذیلی کمیٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی مرکزی

کمیٹی کو ٹیلی فون پر محتاط طور پر جس میں کسی مداخلت کا خطرہ نہ رہے ذیلی کمیٹی کے اس فیصلہ کی اطلاع دیدے، اور مرکزی کمیٹی اس صورت میں اس کو اپنا فیصلہ کہہ کر نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا فیصلہ بتلا کر اس طرح نشر کرے کہ مرکزی کمیٹی کے سامنے اگرچہ کوئی شہادت نہیں آئی، بلکہ فلاں ذیلی کمیٹی نے جس میں فلاں فلاں علماء شریک ہیں شہادت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے، ہم اس فیصلہ پر اعتماد کر کے اعلان کر رہے ہیں، اس صورت میں مرکزی کمیٹی کا یہ اعلان ٹیلی فون سے آئی ہوئی اطلاع پر درست ہے'' (جواہر الفقہ ۱/۴۰۲،۴۰۳)

ریڈیو کا حکم بھی یہی ہے جیسا کہ فیصلہ مرادآباد کے اس جملہ ''اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات اس کے موافق حکم کریں تو اس پر عمل کیا جائے'' سے ظاہر ہے؛ اس لیے کہ ذمہ دار جماعات کا یہ حکم ان کا اپنا فیصلہ نہیں، (کہ اس کے لیے شہادت ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں) بلکہ جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کی تعمیل اور اعلان محض ہے۔

علامہ شامیؒ حاشیہ البحر الرائق میں فرماتے ہیں: لم یذکروا عندنا العمل بالامارات الظاهرة الدالة على ثبوت الشهر كضرب المدافع فی زماننا. والظاهر وجوب العمل بها على من سمعها ممن كان غائبا عن المصر كاهل القرى ونحوها كما يجب العمل بها على اهل المصر الذين لم يروا الحاكم قبل شهادة الشهود . (منحة الخالق ۲/۲۹۱)

اسی تفصیل سے تحریری اطلاع بھی اگر محتف بالقرائن ہے تو اس کا حکم یہی ہونا ظاہر ہوتا ہے اس جگہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ''کاهل القرى ونحوها'' کی قید سے قاضی یا حاکم کا یہ حکم جن حدود میں نافذ ہوتا ہے وہ علاقہ مراد ہے؛ اس لیے فیصلہ کرنے

والے کا یہ فیصلہ کن حدود میں نافذ اور واجب العمل ہے، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے اس کا مدار حاکم وقاضی کے حدودِ اختیار پر ہے، چنانچہ اگر وہ والی سلطنت ہے تو تمام حدود سلطنت میں، اور اگر کسی محدود علاقہ کا حاکم وقاضی ہے تو اسی علاقہ میں؛ لیکن یہ بات وہاں ممکن ہے جہاں اسلامی حکومت ہو، اگر کسی علاقہ یا ملک میں غیر مسلم حکومت ہو تو وہاں علماء یا منتخب ہلال کمیٹی حاکم وقاضی کے قائم مقام ہے۔

رہے اس کے حدودِ اختیار تو اس سلسلہ میں کوئی دوٹوک بات کتب فقہ میں یا ہمارے اکابر کے کلام میں نظر سے نہیں گزری اور اس کی وجہ بھی دراصل یہ ہے کہ یہاں قانونی اختیار تو حاصل نہیں ہے جس کے حدود متعین کیے جائیں، ہاں! علماء کی کسی جماعت یا فرد کو عوام مؤمنین کا اعتماد حاصل ہوتا ہے وہی اس قانونی اختیار کا قائم مقام ہوتا ہے لیکن اس کی حد بندی دشوار ہے، ہاں جس نوع کا اعتماد ہو اسی نوع کی تحدید کی جاسکتی ہے، مثلاً کسی عالم یا مفتی یا علماء کی جماعت یا ہلال کمیٹی کو ایک مخصوص علاقہ کا اعتماد اور اس میں مرجعیت حاصل ہے تو اس کا فیصلہ اسی علاقہ تک واجب العمل اور نافذ ہوگا۔ اور اگر ان میں سے کسی کو ملک گیر اعتماد و مرجعیت حاصل ہے تو اس کا فیصلہ ملک گیر پیمانہ پر واجب العمل و نافذ ہونا چاہیے۔

تنبیہ: یہ یاد رہے کہ یہ کلام وجوب عمل و نفاذ میں ہے، جواز عمل و اعتبار میں نہیں؛ اس لیے کہ جواز عمل و اعتبار کا پورے ملک میں ہونا جمیعتِ علماء کے متفقہ فیصلہ اور ''جواہر الفقہ'' کی عبارت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے۔

مذکور الصدر تمہید کے بعد آپ کے سوال کا جواب واضح ہوگیا۔

(الف) شہادت کے لیے ریڈیو، ٹیلی فون اور اس قسم کی تحریر تینوں میں سے کوئی

بھی کافی نہیں۔

(ب) اعلان کے لیے ریڈیو اور اس قسم کی تحریر دونوں کام دے سکتے ہیں بشرطیکہ تمہید میں مذکور امور کا لحاظ کیا جائے؛ البتہ ٹیلی فون اپنی وضع اور استعمال کے لحاظ سے یہ کام نہیں دے سکتا۔

(ج) خبر و اطلاع کا مقصد تینوں سے حاصل ہو سکتا ہے، جب کہ اس میں مذکور فی التمہید شرائط کا خیال رکھا جائے۔

(۴): اعلان اور خبر میں اس تصریح کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر بھی واجب العمل ہے، کتاب القاضی میں اگر اس کی تصریح نہ ہو پھر بھی مکتوب الیہ کو اگر فیصلہ کی صحت پر اعتماد ہے تو اس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔

(۵) علماء کو چاہیے کہ اس ادارہ نے تحریر ہذا کو جن وجوہات کی بنیاد پر رد کیا ہے اگر وہ صحیح ہے، تو مان لیں، اور اگر وہ وجوہات درست نہیں تو ذمہ داران ادارہ سے گفتگو کر کے آئندہ ایسا نہ ہو اس کا لحاظ رکھنے کی تاکید کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمہ أتم واحکم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۶/محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

رویت ہلال میں انگلینڈ والے مراکش کی خبر کا اعتبار کریں یا سعودیہ عربیہ کی خبر کا؟

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

محترم المقام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: انگلینڈ میں موسم کی خرابی کی وجہ سے عام طور پر آسمان ابر آلود رہتا ہے،

خصوصاً بوقت شام آسمان اور زیادہ ابر آلود ہو جاتا ہے، اس وجہ سے رمضان المبارک شروع کرنے کے لیے اور عیدین ادا کرنے کے لیے ہمیشہ دوسرے ملکوں سے چاند کی خبر معلوم کرنے کی محتاجی رہتی ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ انگلینڈ ہی میں چاند دیکھ کر رمضان المبارک شروع کیا گیا ہو یا عیدین ادا کی گئی ہو، اسی وجہ سے یہاں کے علمائے کرام نے برسوں پہلے انڈیا اور پاکستان کے مفتیان کرام سے رجوع فرما کر فتاوی دریافت فرمائے ہیں، مفتیان کرام کے جوابات کا ما حصل یہ ہے کہ قریب ترین اسلامی ملک پر عمل کرنا احوط ہے اور دوسرے تمام ملکوں پر عمل کرنا جائز ہے، ان تمام جوابات کی روشنی میں مراکش انگلینڈ سے قریب ہونے کی وجہ سے اور احتیاط پر عمل کرنے کے جذبہ سے صحیح العقائد تمام مسلمانوں نے بالاتفاق مراکش پر عمل شروع کیا اور تقریباً سولہ سترہ سال اس پر عمل پیرا رہے؛ مگر بدقسمتی سے مراکش سے چاند کی خبر جلد دستیاب نہیں ہوتی ہے، بعض مرتبہ شب میں دس گیارہ بجے، اور بعض مرتبہ دو تین بجے، اور بعض مرتبہ دوسرے روز صبح میں خبر ملتی ہے، اس وجہ سے عوام میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، اس طرح کی پریشانیوں کی وجہ سے چاند کے مسئلہ میں صحیح العقائد مسلمانوں کے دو فریق بن چکے ہیں، ایک فریق علماء اور عوام یہ مانتے ہیں کہ کسی بھی غیر متعین ملک پر عمل کرنا جائز ہے، جب کہ دوسرے فریق کے علماء اور عوام یہ مانتے ہیں کہ کسی بھی ایک ملک کو معین کر کے اس پر عمل کرنا جائز ہے؛ لہٰذا مراکش ہی پر عمل کرنا چاہیے۔

جو فریق دنیا بھر کے کسی بھی غیر معین ملک پر رمضان المبارک شروع کر دیتا ہے، اور کسی بھی غیر معین ملک کی خبر پر عید الفطر مناتا ہے، ان کے ہمیشہ ۲۹ روزے ہوا کرتے ہیں، کوئی ملک معین نہ کرنے کی وجہ سے اور اسی طرح شعبان اور عید الاضحیٰ بھی دنیا بھر میں سے کسی بھی غیر معین ملک پر مناتے ہیں، اور اس فریق کے علمائے کرام کا یہ کہنا ہے کہ اس

طرح پر عمل کرنے کے لیے ہمارے پاس مفتیان کرام کے فتاوے ہیں؛ مگر ہماری ناقص رائے سے ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح عمل کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ گویا ان حضرات نے شریعت سے آزاد ہوکر رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو اپنے ہی کنٹرول میں کرلیا ہے، جب کہ دوسرے فریق کے مسلمان رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو اپنے قبضہ میں لینے کے بجائے شریعت مطہرہ کا تابع بن کر چاند کے بارے میں انگلینڈ کو دوسرے کوئی معین ملک کا تابع بنانا ضروری سمجھ کر آج تک مراکش پر عمل کرتے رہے ہیں، اور مراکش سے دیر یا خبر موصول ہونے کی وجہ سے واقع ہونے والی تمام پریشانیاں برداشت کرتے ہوئے بھی رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو ادا کرتے رہے ہیں؛ مگر کسی بھی غیر معین ملک پر عمل کرنے والے فریق کی طرف سے عموماً مغرب سے متصل چاند کی خبر شائع ہوجانے کی وجہ سے مراکش پر عمل کرنے والے مسلمانوں میں سے بھی کتنے حضرات مراکش کی خبر کا انتظار چھوڑ کر اس فریق کے ساتھ ہو لیتے ہیں، اس وجہ سے ایک ہی شہر میں بسنے والے اور ایک ہی مسلک پر چلنے والے بلکہ ایک ہی مسجد کے مصلیوں میں اور ایک ہی گھر میں رہنے والے باپ، بیٹوں، اور بھائیوں میں اختلاف ہوجاتا ہے، ان تمام وجوہات کی بناء پر مراکش پر عمل کرنے والے مسلمان موردِ لعن وطعن بنتے ہیں، افتراق بین المسلمین کا مذموم الزام بھی ان پر تھوپا جاتا ہے، ان تمام مشکلات کو مدنظر رکھ کر مراکش پر عمل کرنے والے مسلمان مراکش پر عمل ترک کرکے دوسرے معین ملک پر عمل کرنے کی غرض سے آیا سعودی عربیہ ہی پر رمضان المبارک اور عیدین میں عمل کریں تو اس میں کوئی حرج ہے؟ سعودی عربیہ کی خبر پر رمضان المبارک اور عیدین منانا جائز ہے؟ سعودی عربیہ اسلام کا مرکز ہے، اور بفضلہٖ تعالیٰ حرمین شریفین کی وجہ

سے عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس کا احترام ہے، اور چاند کا فیصلہ بھی حکومت کی طرف سے معین کردہ قاضی القضاۃ کی طرف سے علمائے کرام پر مشتمل ہلال کمیٹی چاند کی باقاعدہ شہادتیں ملنے ہی کے بعد کرتی ہے، رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات میں محکمۂ موسمیات کی گنتی کا قطعاً اعتبار نہیں کرتی ہے۔

آپ محترم کے مطالبہ کی غرض سے وہاں کی ہلال کمیٹی کی طرف سے چاند کے فیصلہ کرنے کے طور وطریق کیا ہیں، اور وہاں کے علمائے کرام کو محکمۂ موسمیات سے کس قدر انقباض ہے، اس کا مواد آپ محترم پر ارسال کرتے ہیں، سعودی عربیہ کا ٹائم انگلینڈ کے ٹائم سے دو تین گھنٹے آگے ہونے کی وجہ سے چاند کی رویت کی خبر بہت جلد بڑی سہولت سے یہاں فراہم ہوجاتی ہے اور سعودی عربیہ جیسے ایک معین ملک پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ۲۹ روزے ہونے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا، جیسا کہ مراکش پر عمل کرنے کی وجہ سے نہیں رہتا تھا، اور سعودی عربیہ پر عمل کرنے کی وجہ سے امید ہے کے وہ فریق جو دنیا بھر کے کسی بھی غیر معین ملک پر عمل کر کے رمضان المبارک اور عیدین مناتا رہتا ہے وہ بھی سعودی عربیہ کی خبر پر عمل کرنا شروع کردے اس طرح صحیح العقائد مسلمانوں کا دوبارہ انشاء اللہ اتفاق واتحاد بھی ہوجاوے، جس کے لیے آج لوگ بڑے متمنی ہیں، مذکورہ بالا بیان کردہ تمام پہلوؤں کو مدنظر فرما کر سعودی عربیہ کی خبر پر رمضان المبارک اور عیدین منانے کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

اس کے متعلق آپ محترم ہم ناکاروں کی رہنمائی فرما کر ممنون ومشکور ہوں، یہی ہماری آپ محترم سے مؤدبانہ عرض ہے، قوی امید ہے کہ جناب والا ہماری روئیداد کا بغور مطالعہ فرما کر تشفی بخش جواب مرحمت فرماویں گے۔ فقط۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

دراصل اس مسئلہ کی بنیاد اختلاف مطالع کے اعتبار وعدم اعتبار پر ہے، امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ سے ظاہری روایت یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے اسی کو عام فقہائے حنفیہ نے راجح قرار دیا ہے؛ یہاں تک کہ مشرق ومغرب کے فاصلے میں اختلاف مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر ایک جگہ کی رویت کو دوسری جگہ کے لیے حجت قرار دیا ہے۔

''درمختار'' میں ہے: واختلاف المطالع ورؤیته نهاراً قبل الزوال و بعده غیر معتبر علی ظاهر المذهب، وعلیه اکثر المشائخ وعلیه الفتوی، بحر عن الخلاصة فیلزم اهل المشرق برؤیته اهل المغرب اذا ثبت عندهم برؤیته اولئك بطریق موجب کما مرّ. (در مختار علی هامش الشامی ۲/۹۶)

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ ۱/۴۱ میں اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ نے فتاوی دارالعلوم (مطبوعہ کراچی) ۱/۳۷۶ میں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے امداد الفتاوی ۲/۱۱۲ میں اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے کفایت المفتی ۴/ ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲ میں اسی کو اختیار فرمایا؛ البتہ فقہائے حنفیہ کی ایک جماعت نے بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے، جن میں سے علامہ فخر الدین زیلعیؒ صاحب تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۳۲۱ اور علامہ کاسانیؒ صاحب بدائع الصنائع ۲/۸۳ میں حضرت العلامہ انور شاہ کشمیریؒ العرف الشذی ۱/۲۰۳ میں اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم ۳/۱۱۳ میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے رسالہ رویت ہلال صفحہ ۴۸، ۴۹ میں اسی کو اختیار کیا ہے؛ البتہ اس صورت میں بلاد بعیدہ اور بلاد قریبہ میں قرب و بعد کا معیار کیا اور کتنا ہوگا؟ یہ ایک حل طلب مسئلہ ہے تو اس سلسلہ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: جن بلاد میں اتنا فاصلہ

ہو کہ ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ اعتبار کرنے کے نتیجہ میں مہینہ کے دن ۲۸ رہ جائیں یا ۳۱ ہو جائیں وہاں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا اور جہاں اتنا فاصلہ نہ ہو وہاں نظر انداز کیا جائے گا۔ (رسالہ رویت ہلال ص ۴۹)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب مدظلہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: کہ یہی بات قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے اور عملاً تمام علمائے عصر نے اسی کو اختیار بھی کیا ہے، مزید برآں یہ کہ اس قول کو اختیار کرنے سے دونوں پہلوؤں (عام فقہائے احناف کے مشہور مسلک کی فی الجملہ ترجیح اور ایک مشاہد ومحسوس حقیقت کا کسی قدر اعتراف) کی یک گونہ رعایت بھی ہو جاتی ہے۔ (رویت ہلال کا مسئلہ ص ۹۹)

اس لیے آپ کے یہاں جب مطلع ہمیشہ غیر صاف رہتا ہے تو جہاں سے خبر بطریق موجب آوے اور اس کو ماننے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا لازم نہیں آتا تو اس پر عمل کریں، اور مختلف جگہوں سے خبر آنے کی صورت میں اگرچہ کسی بھی ایک غیر معین کو اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس میں لوگوں میں شدید خلفشار رہتا ہے کہ ایک ہی بستی اور ایک ہی مسجد میں بلکہ ایک ہی گھر میں کوئی صائم ہے اور کوئی غیر صائم ہے، کوئی عید منا رہا ہے اور کوئی رمضان پر عامل ہے، جس کے نتیجہ میں نااہل لوگوں کی طرف سے مسائل فقہ پر زبان طعن دراز کی جاتی ہے، اور ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے تو ایسے خلفشار اور فتنۂ عوام سے بچنے کے اور عوام کو بچانے کے لیے کسی ایک مقام کی خبر کو عمل کے لیے سب مل کر متعین کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

تنبیہ ضروری: چونکہ آپ کا مقصد وہاں مقیم مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں واقع اختلاف کی خلیج کو ختم کرنا ہے، تو مناسب یہ ہے کہ تمام گروہوں کے سربرآوردہ

حضرات مل کر ایک استفتاء تیار فرمائیں، اور اس کے بعد مفتیان کرام کی خدمت میں پیش کریں تاکہ عمل کے لیے اتفاق کی کوئی صورت وجود میں آسکے ورنہ انفرادی طور پر ایک استفتاء بھیج کر جواب حاصل کرنے سے یہ مقصد حاصل نہ ہوگا، خصوصاً جب کہ سعودیہ کے متعلق بعض حضرات کا اصرار ہے کہ وہ لوگ حساب پر چلتے ہیں رویت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بھی موجب خلفشار ہوسکتا ہے آپ نے جن دو مضامین کی فوٹو کاپی ارسال فرمائی ہے وہ یہاں کے لیے رکھ لی ہیں؛ اس لیے کہ آپ کے پاس تو اصل موجود ہی ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقل مطابق اصل ہے: کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۳/ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

مکتوب گرامی حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ

مکرمی زید لطفکم .

سلام مسنون! سعودیہ کے متعلق حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم نے خوب وکالت کی ہے، تاہم ہندوستان اور پاکستان وغیرہ میں بعض حضرات کا اصرار ہے کہ سعودیہ حساب پر چلتے ہیں رویت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بہرحال سبب خلفشار ہوگا۔ ھذا ماظھر لی الان . فقط والسلام۔

احقر سید عبدالرحیم لاجپوری غفرلہ

دیوبند سے مولانا سعید صاحب کا خط ہے بھائی عبدالاحد سلمہ کو کاتب کے سلسلہ میں جواب لکھدیا ہے، اغلب یہ ہے کہ اثبات میں دیا ہوگا۔ کتابت شدہ کاپیاں اور مسودہ فراہم کرنے کی سعی کیجیے۔　　سید عبدالرحیم

اذان سن کرسحری ختم کرنا

سوال: ہمارے یہاں سحری عام طور پرصبح صادق سے پہلے نہیں بلکہ اذان سن کر ختم کی جاتی ہے، اذان تک کھانا پینا، پان تمبا کو کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ادھر اذان شروع ہوئی اور ادھر لوگوں نے جلدی جلدی پان تمبا کو تھوک دیا، کیا اس طرح روزہ ادا ہو جائے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شرعاً روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے؛ اس لیے صبح صادق کے شروع ہونے سے کچھ پہلے کھانا پینا بند کر کے روزہ شروع کر دیا جائے تا کہ شرعاً روزہ درست ہو، فجر کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے، اور اذان وقت کے داخل ہونے کے بعد یعنی صبح صادق ہو چکنے کے بعد دی جاتی ہے، اب اگر کھانے، پینے کا سلسلہ اذان سن کر ختم کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ صبح صادق کے بعد کھانے، پینے کی شکل میں ظاہر ہوگا، اور یہ چیز روزہ کی صحت کے منافی ہے؛ لہٰذا آپ کے یہاں جو رواج ہے اس کو اولین فرصت میں ختم کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

روزہ افطار کرنے کا وقت

نوٹ: کاروار، کرناٹک کے کوئی جے، اے، خان صاحب نے کتابچہ ''افطار'' نامی تحریر کیا تھا، کسی شخص نے وہ رسالہ دارالافتاء ڈابھیل کے نام بھیج کر اس میں لکھے ہوئے افطار کے وقت کی شرعی حیثیت معلوم کی تھی ''افطار نامی رسالہ کا ابتدائی حصہ یہ ہے: (ع۔ر)

(رمضان میں مغرب کے وقت روزہ کھولنے سے متعلق کچھ ضروری عرض)

(۱) جون ۱۹۸۶ء رمضان کے مہینے میں افطار کرنے کے سلسلہ میں اختلاف کی

وجہ سے میں نے ۱۵/ستمبر ۱۹۸۶ء کو ایک پرچہ پیش کیا تھا، جس میں افطار کرنے کا موزوں طریقہ بتایا گیا تھا، کہ مغرب کی اذان مکمل ہونے اور اذان کی دعا ختم ہونے کے بعد اور مغرب کی نماز سے پیشتر افطار کیا جائے، میرے پرچے میں درج کی گئی کتابوں کے حوالہ کے مطابق جو احادیث سے ظاہر ہوتا ہے میں نے اظہار خیال کیا تھا،؛ مگر بدقسمتی سے چند روزہ داروں نے اس کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر قبول نہیں کیا؛ چونکہ ایک مولانا صاحب نے ان کو دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔

(۲) جو کچھ بھی ہو میں دوبارہ اپنا خیال زیادہ تفصیل اور اچھے طریقہ کے ساتھ کسی کی مخالفت اور مقابلہ کے بغیر شریعت کا تقاضا بیان کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے صدق دل سے اپنے اعتقاد کی بنا پر بیان کروں گا؛ اگر چہ میں کوئی عالم نہیں ہوں، اور نہیں کسی کالج یا دارالعلوم کا تعلیم یافتہ ہوں، پھر بھی اپنے اعتقاد کے مطابق صدق دل سے ظاہر کرنے سے گریز نہیں کرسکتا، جو کچھ میں بیان کروں گا وہ میرے علم اور میری زندگی کے اعتقاد کے مطابق ہوگا جو اسلامی کتابوں کے مطابق ہے، ساتھ ساتھ میں معافی بھی چا ہوں گا کہ اگر میرے بیان میں کوئی غلطی یا کسر ہو تو مہربانی فرما کر مجھے اطلاع دیں؛ تاکہ میں اپنی رائے بدل لوں کیونکہ میری تعلیم صرف ہائی اس کول میٹرک تک ہے۔

(۳) اب میں اپنے اصل مقصد پر آتے ہوئے افطار کا موزوں طریقہ بیان کرتا ہوں، اس وقت میری عمر ۷۳ سال ہے۔ زمانۂ دراز سے یعنی بہت سالوں سے رمضان یا دیگر مہینے میں ہم نیچے بیان کیے گئے طریقہ کے مطابق افطار کرتے رہے ہیں، اور یہی طریقہ ہمارے آباء واجداد نے بھی اختیار کیا تھا۔

(۱) غروب آفتاب کا یقین کر کے مؤذن اذان دیتے، اذان کے دوران تمام

روزہ دار خاموشی اختیار کرتے اور اذان کے آداب بجالاتے اور اذان ختم ہوتے ہی دعا پڑھتے اور یہ سب غروب آفتاب سے پانچ منٹ میں مکمل ہو جاتا۔

(۲) دعا ختم ہوتے ہی افطار کیا جاتا جو کہ صرف پانچ منٹ میں مکمل ہوتا، اس طرح ہم تمام اتفاق کے ساتھ روزہ افطار کرتے جو قرآن کے مطابق اور اسلامی کتب میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہوتا تھا۔

(۳) اس طرح اذان اور افطار، سورج غروب ہونے سے دس منٹ کے اندر ختم ہوتا، اور مغرب کی نماز شروع ہو کر پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتی، لہذا مغرب کی نماز سورج غروب ہونے سے تقریباً ۲۵/ منٹ میں ختم ہو جاتی، مجھ ناچیز خیال کے مطابق اس طریقہ میں کوئی غلطی یا کسر نہیں معلوم ہوتی اور یہ طریقہ گزشتہ کئی سالوں سے جاری تھا اور اس طریقہ پر ۱۹۸۵ء تک کسی کا اعتراض یا کوئی مخالفت نہ تھی، حالانکہ بہت سے مختلف مقامات کے تعلیم یافتہ لوگ اور مولانا حضرات موجود تھے، ان کی فہرست جو مجھے میسر ہوئی ہے وہ فہرست (الف) میں درج ہے، اس طرح ہم اپنے اعتقاد پر قائم تھے، جو زمانۂ دراز سے قائم تھا اور سب کچھ تسلی اور محبت سے ہماری قوم میں چلا آرہا تھا۔

(۴) لیکن ۱۹۸۶ء میں ایک مولانا صاحب جو ہماری مدینہ جامع مسجد ''کاروار'' میں امامت کررہے تھے، انہوں نے اچانک نیا افطار کا طریقہ بتایا، اور انہوں نصیحت کی کہ اذان کے پہلے لفظ ''اللہ اکبر'' کے شروع ہوتے ہی افطار کریں، اور اذان کے آداب کی اہمیت کے بغیر ہی دعا مانگیں، حالانکہ اسلام کی معتبر کتب میں اذان کے آداب بجالانے کے لیے بتایا گیا ہے، اس اچانک اور بے ضرورت تبدیل کے آنے سے ۱۹۸۶ء سے ہمارے یہاں روزہ داروں میں تفرقہ پڑ گیا ہے، اور اسی پر مجھے خوف ہے کہ آئندہ یہ تفرقہ

آگ کی طرح بھڑکے گا اور ہماری قوم میں نا اتفاقی ہو جائے گی اللہ نہ کرے۔

(۵) میں ایک عمر رسیدہ شخص ہونے کی بناء پر اور اس تفرقہ کے اندیشہ سے بیزار ہوتے ہوئے تفرقہ مٹانے کے ارادہ سے ایک نصیحت کے طور پر اپنے علم اور اعتقاد کے مطابق ۱۵/ستمبر ۱۹۸۶ء کو میں نے ایک پرچہ تیار کیا (جس کی نقل اسی کے ساتھ ہے) اور جس کو ۱۵/ستمبر ۱۹۸۶ء کو نقل کر کے ہمارے تعلقہ کی مساجد میں پیش کیا گیا تھا اور وہ پرچہ صحیح جان کر قبول کر لیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہماری مدینہ جامع مسجد ''کاروار'' کے اکثر روزہ داروں نے مولانا کی نصیحت پر اندھی تقلید کرتے ہوئے نیا طریقہ اختیار کر لیا، اب نئے طریقہ کے لیے ہمارے علاقہ میں اور مولانا کے پاس یا کسی شخص کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، یہ ہمای سمجھ میں نہیں آتا کہ نیا طریقہ کس طرح داخل ہوا اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لیے اسلام کی معتبر کتابوں میں ٹھوس ثبوت نہیں ہے، مجھے کہنا پڑتا ہے، ہمارا بہت زمانہ سے چلتا ہوا طریقہ بالکل صحیح ہے؛ کیونکہ وہ طریقہ تمام ارکان کے ساتھ یعنی سنت مؤکدہ، مستحب اور فرض بھی ادا کرتا ہے، جو رمضان یا دوسرے مہینے میں افطار کرنے کے لیے اسلام کے معتبر ارکان میں ہے۔ (کتابچہ ''افطار'' کا مضمون پورا ہوا)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس وقت جناب جی، ایم، خان صاحب کا ایک کتابچہ پیش نظر ہے، جس میں مؤلف نے افطار کے موزوں وقت کی تعیین کے سلسلہ میں اپنے مقدور بھر سعی فرمائی ہے، احقر سے اس کتابچہ پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کرنے کے ساتھ اصل مسئلہ کی وضاحت کی تاکید بھی کی گئی؛ چنانچہ احقر نے پورا مضمون بغور پڑھا اور مکرر پڑھا۔ کتابچہ پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ کو کتاب و سنت اور کتب فقہیہ کی عبارتوں

کی روشنی میں منقح کر دیا جائے، اس کے بعد آخر میں انشاء اللہ تعالی کتابچہ کے متعلق بھی اپنی رائے پیش کروں گا۔

قرآن مجید میں باری تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ثم اتموا الصیام الی اللیل﴾ (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۷) ترجمہ: پھر (صبح صادق سے) رات آنے تک روزہ کو پورا کرلیا کرو۔

(۱) آیت مذکورہ کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی شہرۂ آفاق ''تفسیر مظہری'' میں تحریر فرماتے ہیں: ثم اتموا الصیام الی اللیل بیان لآخر وقته عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: اذا اقبل اللیل من ھھنا وادبر النھار من ھھنا وغربت الشمس، فقد افطر الصائم. رواه البخاری. (تفسیر مظہری ۱/۱۹۱)

یعنی ﴿ثم اتموا الصیام الی اللیل﴾ میں روزہ کے آخری وقت کو بیان فرمانا مقصود ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب رات ادھر (مشرق) سے آجائے اور دن ادھر (مغرب) سے رخصت ہو اور سورج چھپ جائے تو روزہ دار کے لیے افطار کا وقت ہو گیا، یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے۔

(۲) علامہ ابوبکر جصاص رازی حنفیؒ اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں اسی آیت کریمہ کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

ولا خلاف فی انه اذا غابت الشمس فقد انقضی وقت الصوم، وجاز للصائم الأكل والشرب والجماع وسائر ما حظره علیه الصوم. (احکام القرآن ۱/۲۴۲)

یعنی اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جب غروب شمس ہو جائے تو روزہ کا وقت ختم ہو گیا، اور روزہ دار کے لیے وہ تمام چیزیں جو روزہ کی وجہ سے ممنوع تھیں، یعنی

کھانا، پینا، اور جماع وغیرہ حلال ہوگئیں۔

(۳) حضرت علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:

فالذی ورد فی الاستحباب تعجیل الفطر......محمول علی ان لایؤخر الفطر بعد التیقن بالغروب. (احکام القرآن ۱/۲۴۷)

یعنی (آیت میں جب رات آنے پر روزہ پورا کرنے کا حکم دیا گیا تو) اب وہ روایتیں جن میں افطار میں جلدی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کا مطلب یہ ہوا کہ غروب آفتاب کا یقین ہو جانے کے بعد افطار میں تاخیر نہ کرے۔

(۴) علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبیؒ اپنی مشہور تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:

قوله تعالى "الى الليل" اذاتبين الليل سن الفطر. (الجامع لأحكام القرآن المعروف بتفسير قرطبی ۲/۳۲۸) یعنی ارشاد ربانی ﴿الی اللیل﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب رات آجائے (یعنی غروب آفتاب کا یقین ہو جائے) تو افطار مسنون ہے۔

قرآن مجید کی اس تفسیر وتشریح کے بعد احادیث وآثار پر نظر ڈالی جائے، اس سلسلہ میں احادیث وآثار کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، ہم ان میں سے چند کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) امام بخاریؒ نے وقت افطار کی تعیین کے سلسلہ میں مستقل باب "متى يحل فطر الصائم" کے عنوان سے قائم فرما کر دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے:

قال رسول الله ﷺ: اذا اقبل الليل من ههنا وادبر النهار من ههنا

وغربت الشمس فقد افطر الصائم. ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب رات ادھر (مشرق) سے آجائے اور دن ادھر (مغرب) سے رخصت ہوجائے اور آفتاب غروب ہوجائے تو روزہ دار کے لیے افطار کا وقت ہوگیا۔

علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری حدیث مذکور کے الفاظ ''فقد افطر الصائم'' کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ای دخل فی وقت الفطر، وقال ابن خزیمة: لفظه خبر، ومعناه الامر، ای فلیفطر الصائم. (عمدۃ القاری ۱۱/ ۶۵)

(یعنی افطر الصائم کا مطلب یہ ہے کہ: وہ (روزہ دار) افطار کے وقت میں داخل ہوگیا، اور ابن خزیمہؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں صیغہ خبر کا استعمال کیا گیا؛ لیکن معنی امر کا ہے (یعنی روزہ دار کو افطار کر لینا چاہیے)۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی حدیث مذکور کی شرح میں امام ابن خزیمہؒ کے اس قول کو نقل فرما کر اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ (دیکھیے فتح الباری ۴/ ۱۵۹،۱۶۰)

(۲) امام بخاریؒ نے اسی باب میں دوسری روایت حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی نقل فرمائی ہے:

قال: کنا مع النبی ﷺ فی سفر وهو صائم، فلما غابت الشمس قال لبعض القوم یافلان قم فاجدح لنا، فقال یارسول الله لوامسیتَ، قال: انزل فاجدح لنا، قال یارسول الله فلوامسیت، قال: انزل فاجدح لنا، قال: ان علیك نهارا، قال: انزل فاجدح لنا، فنزل فجدح لهم، فشرب النبی ﷺ ثم قال: اذا رأیتم اللیل قداقبل من ههنا فقد افطر الصائم.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (ماہِ رمضان میں) ایک سفر میں تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ دار تھے؛ چنانچہ جب آفتاب غائب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم میں سے ایک آدمی (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کو فرمایا کہ اے فلانے ہمارے لیے ستّو گھولو، انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! اگر کچھ اور شام ہوجانے دیتے تو اچھا ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتر کر ہمارے لیے ستو تیار کرو انہوں نے (پھر) عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اگر کچھ مزید انتظار فرمالیتے تو (مناسب تھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اترو اور ہمارے لیے ستو گھولو، انہوں نے عرض کیا کہ ابھی دن (روشنی) باقی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتر کر ہمارے لیے ستو گھولو؛ چنانچہ انہوں نے اتر کر ستو گھولا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کو) نوش فرما کر ارشاد فرمایا: جب تم دیکھو کہ رات ادھر (مشرق) سے آگئی ہے تو روزہ دار کو افطار کرلینا چاہیے۔

اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

فیہ انہ لایجب امساک جزء من اللیل مطلقاً؛ بل متی تحقق غروب الشمس حل الفطر. (عمدۃ القاری ۱۱/۴۴) یعنی اس حدیث میں یہ بتلایا گیا کہ جب آفتاب غروب ہونے کا تحقق ہوجائے تو افطار کرلینا چاہیے، اب رات کے مزید کسی حصہ کے گزرنے تک بالکل انتظار نہ کرے)۔

بعینہ یہی بات حافظ ابن حجر عسقلانیؒ بھی فرماتے ہیں۔ (فتح الباری ۴/۱۶۰)

آگے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ:

وفیہ ایماء الی الزجر عن متابعۃ اھل الکتاب، فانھم یؤخرون الفطر عن الغروب. (فتح الباری ۴/۱۶۰) (یعنی اس حدیث میں اہل کتاب کی پیروی سے روکنے کی

طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ لوگ افطار کو غروب آفتاب سے مؤخر کرتے ہیں۔)

حافظ ابن حجرؒ کے اس کلام سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ غروب آفتاب کا تحقق ہوجانے کے بعد افطار میں تاخیر (چاہے ستاروں کے چٹکنے تک نہ ہو پھر بھی) اہل کتاب کی پیروی کا ایک حصہ ہے، اس لیے کہ حدیث مذکور کے واقعہ میں حضرت بلالؓ نے معمولی تاخیر کی درخواست کی تھی؛ لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس کو بھی منظور نہیں فرمایا۔

ان دو روایتوں سے جو فوائد واحکام معلوم ہوئے، اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں: وفی حدیثی الباب من الفوائد بیان وقت الصوم وان الغروب متی تحقق کفی. (فتح الباری ۴/۱۶۰) (یعنی جب غروب آفتاب کا تحقق ہوگیا تو اب افطار کے لیے مزید انتظار کی ضرورت نہیں، بلکہ وہی کافی ہے)

(۳) تمام حضرات محدثین اپنی کتابوں میں تعجیل افطار کا مستقل باب قائم کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں احادیث اتنی کثیر تعداد میں وارد ہوئی ہیں کہ حافظ ابن عبد اللہؒ کے حوالہ سے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور حافظ بدر الدین عینیؒ نے نقل فرمایا کہ:

احادیث تعجیل الإفطار وتاخیر السحور صحاح متواترة. (فتح الباری ۴/۱۶۱، عمدۃ القاری ۱۱/۶۶) (یعنی افطار میں جلدی کرنے اور سحر میں تاخیر کرنے کے سلسلہ میں احادیث جو وارد ہوئی ہیں وہ تمام) صحیح ہیں اور درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

امام بخاریؒ نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں "باب تعجیل الإفطار" کے عنوان سے مستقل باب قائم فرما کر اس میں دو حدیثیں ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک تو وہی جس کو ہم نمبر دو پر نقل کر آئے، یعنی حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت؛ چنانچہ حافظ بدر الدین عینیؒ اس جگہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس شخص (یعنی بلال رضی اللہ عنہ) سے

آپ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ اتر کر ہمارے لیے ستّو گھولو، اس سے یہ ثابت ہوا کہ جہاں غروب آفتاب کا تحقق ہوگیا فوراً آپ ﷺ نے افطار فرمایا۔ (عمدۃ القاری۱۱/ ۶۷)

اس جگہ یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے مؤذن بھی تھے، اور حضر کی طرح سفر میں بھی یہ خدمت آپ کے سپرد تھی، انہیں حضور اکرم ﷺ غروب شمس کا تحقق ہوجانے پر اذان دینے کا حکم فرمادینے کے بجائے افطار کی تیار کا حکم دے رہے ہیں۔

امام بخاریؒ نے اس باب میں دوسری حدیث حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی بیان فرمائی ہے۔ان رسول الله ﷺ قال: لایزال الناس بخیر ماعجلواالفطر. (یعنی لوگ (امت محمدیہ) برابر بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک کہ وہ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے) تعجیل ایک مفہوم کِلی ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کا یقین ہوتے ہی افطار کرلیا جائے، جیسا کہ حضرات محدثین وفقہاء نے تصریح فرمائی ہے، قاضی مہلبؒ کے حوالہ سے علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ دونوں نے تمام علماء کا متفقہ قول یہی نقل فرمایا ہے:واتفق العلماء علی ان محل ذلك اذاتحقق غروب الشمس. (عمدۃ القاری۱۱/ ۶۷، فتح الباری۴/۱۶۱)اوراس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ ستاروں کے چٹکنے سے پہلے پہلے افطار کرلے، اگراتنی تاخیر کی جس کے نتیجہ میں ستارے چٹک گئے تو یہ بالاتفاق مکروہ ہے۔

(۴)''ترمذی شریف''میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:قال رسول الله ﷺ: قال الله عزوجل: احب عبادی الیّ اعجلهم فطراً. (یعنی نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہے

جوان میں جلدی افطار کرنے والا ہو)۔

ملا علی قاریؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ای اکثرهم تعجیلا فی الإفطار لما قدمناه، وقال الطیبی: ولعل السبب فی هذه المحبة المتابعة للسنة، والمباعدة عن بدعة، والمخالفة لأهل الکتاب. (مرقات شرح مشکوۃ ۴/۱۵۵)

(یعنی وہ بندہ (زیادہ محبوب ہے) جو افطار میں سب سے زیادہ جلدی کرنے والا ہو، اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شاید اس محبت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سنت کی اتباع، اور بدعت سے دوری، اور اہل کتاب کی مخالفت ہے)۔

ظاہر ہے مقام محبوبیت اسی کو حاصل ہوگا جو تعجیل افطار کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو۔

(۵) ''مسلم شریف'' میں حضرت ابو عطیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ قال: دخلت انا ومسروق علی عائشة رضی الله عنها، فقلنا: یا ام المؤمنین رجلان من اصحاب محمد ﷺ احدهما یعجل الإفطار، ویعجل الصلوة، والآخر یؤخر الإفطار، ویؤخر الصلوة، قالت: ایهما الذی یعجل الإفطار ویعجل الصلوة؟ قال قلنا: عبد الله یعنی ابن مسعود، قالت: کذلک کان یصنع رسول الله ﷺ. زاد ابو کریب والآخر ابو موسی. (یعنی میں اور حضرت مسروق (دونوں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے عرض کیا کہ اے ام المؤمنین! نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے دو آدمی ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک افطار میں بھی جلدی کرتے ہیں اور نماز میں بھی۔ اور دوسرے افطار میں بھی تاخیر کرتے ہیں اور نماز میں بھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ ان میں سے کون افطار اور نماز میں تعجیل کرتے ہیں؟ تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، تو حضرت عائشہ رضی اللہ

عنہا نے ارشاد فرمایا: کہ نبی کریم ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) دوسرے صحابی حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ تھے)۔

ظاہر ہے دوسرے صحابی جو تاخیر سے کام لیتے تھے وہ اتنی تاخیر تو نہیں تھی جو حدِ کراہت میں داخل ہو جاتی ہو؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ جلدی کرنے والے صحابی تعجیل افطار میں مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ اور دوسرے صحابی اتنا مبالغہ نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ شارح مسلم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: المراد فی التعجیل المبالغة فیه، وبالتاخیر عدمها. والله أعلم. (فتح الملهم ۳/۱۲۲) اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے طریق کار کو عین سنت کے مطابق بتلایا۔

(۶) ''مسند احمد'' وغیرہ میں حضرت قطبہ بن قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: رأیت النبی ﷺ یفطر اذا غربت. (مجمع الزائد ۳/۱۵٤) یعنی میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ غروب ہوتے ہی (بلا تاخیر) افطار فرماتے تھے۔

(۷) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کان رسول الله ﷺ اذا کان صائما، امر رجلا یقوم علی نشز (ای مرتفع) من الارض، فاذاقال: قد وجبت الشمس افطر، رواه الطبرانی فی الکبیر. (مجمع الزائد ۳/۱۵۵) یعنی نبی کریم ﷺ جب روزہ سے ہوتے تھے تو ایک آدمی کو بلند مقام پر کھڑا فرما دیتے تھے اور جہاں وہ یہ کہتا کہ: آفتاب غروب ہو گیا اسی وقت آپ ﷺ افطار فرماتے تھے۔

(۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رأیت رسول ﷺ وهوصائم یترصد غروب الشمس بتمرة، فلماتوارت القاها فی فیه. (کنزالعمال ۸/۱٤ ٦) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ روزہ سے ہیں اور کھجور لیے ہوئے غروب

آفتاب کا انتظار فرمارہے ہیں، اور جہاں آفتاب آنکھوں سے اوجھل ہوا، آپ ﷺ نے وہ کھجور منہ میں ڈال دی۔

(۹) عن ابی رجاء رضی اللہ عنہ قال: کنت اشهد ابن عباس رضی الله عنهما عند الفطر فی رمضان فكان يوضع طعامه ثم يامر مراقبا يراقب الشمس، فاذا قال: وجبت، قال: كلوا. (۲۲۷/٤) ابورجاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رمضان المبارک میں افطار کے وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوتا تھا، آپ کے سامنے کھانا رکھا جاتا تھا، پھر آپ رضی اللہ عنہ ایک شخص کو حکم دیتے تھے کہ وہ آفتاب کو دیکھتا رہے، پس جب وہ شخص کہتا کہ آفتاب غروب ہوگیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے کہ کھاؤ۔

(۱۰) عن ابی حمزة الصبعی رضی اللہ عنہ انه كان يفطر مع ابن عباس رضی الله عنهما فی رمضان، فكان اذاامسى بعث ربيبه له يصعد ظهر الدار، فلما غربت الشمس اذن فيأكل وناكل، فاذا فرغ، اقيمت الصلوة، فيقوم يصلی ويصلی معه. (مصنف ابن ابی شیبه ۱۲/۳) ابوحمزہ صبعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ افطار کرتے تھے، چنانچہ جب شام ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے ربیب کو بھیجتے کہ وہ گھر کی چھت پر چڑھ جاتا، پھر جب سورج غروب ہوتا تو وہ اذان دیتا، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ہم کھانا شروع کرتے، پھر جب وہ اذان سے فارغ ہوتا تو نماز کے لیے اقامت کہی جاتی؛ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اٹھ کر نماز پڑھتے اور ہم بھی آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھتے۔

(۱۱) عن مجاهد رضی اللہ عنہ قال كنت لآتی ابن عمر رضی الله عنهما بالقدح عند فطره، فاستره من الناس ومابه الاالحياء يقول من سرعة مايفطر. (مصنف

عبد الرزاق ٤/٢٢٦، مصنف ابن ابی شیبه ٣/١٣) **حضرت مجاہد** رضی اللہ عنہ **فرماتے ہیں کہ افطار کے وقت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا (کھانے کا) برتن لاتا، اور افطار میں جلدی کرنے کی وجہ سے مارے شرم کے وہ برتن لوگوں سے چھپا کر لاتا۔**

(۱۲) عن عبدالواحد بن ایمنؒ عن ابیه عن ابی سعید رضی اللہ عنہ قال: دخلت علیه، فافطر علی عرق، وانی اری الشمس لم تغرب. (مصنف ابن ابی شیبه٣/١٢، ١٣)

عبدالواحد بن ایمنؒ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ **کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے گوشت کی ہڈی والی بوٹی سے افطار کیا، اور (افطار میں انہوں نے اتنی جلدی کی تھی کہ) میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی تک آفتاب غروب نہیں ہوا۔**

(۱۳) عن مسلم بن یزیدؒ عن ابیه قال: کان علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یقول لأبی التیاح، غربت الشمس؟ فیقول: لاتعجل، فیقول: غربت الشمس؟ فإذا قال: نعم، أفطر، ثم نزل فصلی. (مصنف ابن أبی شیبه٣/١٣) **مسلم بن یزیدؒ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ (ایک سفر میں) حضرت علی ابن ابی طالب** رضی اللہ عنہ **ابوالتیاح سے کہنے لگے کہ (کیا) سورج غروب ہوگیا؟ تو انہوں نے کہا کہ ابھی جلدی نہ کریں، پھر پوچھنے لگے کہ کیا سورج غروب ہوگیا؟ تو جب انہوں نے کہا کہ ہاں (غروب ہوگیا) تو حضرت علی** رضی اللہ عنہ **نے افطار فرمایا پھر اتر کر نماز پڑھی۔**

(۱۴) عن علقمة رضی اللہ عنہ قال: أُتی عبدالله بجفنة فقال للقوم: ادنوا فکلوا، فاعتزل رجلٌ منهم، فقال له عبدالله مالك؟ قال إنی صائم، فقال عبدالله: هٰذا والذی لا إلٰه غیره حین حلّ الطعام. (مصنف ابن ابی شیبه٣/١٢) **حضرت علقمہ** رضی اللہ عنہ **فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس (کھانے کا برتن) لایا گیا،**

آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ قریب ہو جاؤ! اور کھاؤ، تو ان میں سے ایک شخص الگ ہٹ گیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں روزہ سے ہوں تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، یہ وہ وقت ہے کہ (روزہ دار کے لیے) کھانا حلال ہو گیا، (اس اثر کا مطلب یہ ہے کہ افطار میں اتنی جلدی کی گئی تھی کہ وہ آدمی یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی تک وقت نہیں ہوا)

(۱۵): عن موسی بن أنس رضی اللہ عنہ أنّ أنساً کان یصعدالجاریة فوق البیت، فیقول: اذااستوی الأفق فاٰذنینی. (مصنف ابن ابي شيبة ۱۳/۳) **حضرت موسیٰ ابن انس** رضی اللہ عنہ **فرماتے ہیں کہ حضرت انس** رضی اللہ عنہ **ایک باندی کو گھر کی چھت پر بھیج دیتے تھے اور فرماتے کہ جب افق برابر ہو جائے (یعنی سورج غروب ہو جائے) تو مجھے اطلاع دینا۔**

(۱۶): عن ابن حنظلة عن ابیه رضی اللہ عنہ قال: شهدت عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ فی رمضان وقرب الیه شراب، فشرب بعض القوم وهم یرون الشمس قد غربت، ثم ارتقی المؤذن، فقال: یاأمیرالمؤمنین! والله إن الشمس طالعة لم تغرب، فقال عمر: من کان افطر فلیصم یوماً مکانه، ومن لم یکن أفطر فلیتم حتی تغرب المشس. واعاده من طریق آخر، وزادفیه فقال له: انما بعثنا داعیا ولم نبعثك راعیاً. الخ (نصب الرایة ۴۲۹/۲، مصنف ابن أبی شیبة۲۳/۳، ۲۴، مصنف عبدالرزاق ۱۷۸/۴)

علی ابن حنظلہ اپنے والد رضی اللہ عنہ **سے نقل فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر** رضی اللہ عنہ **کی خدمت میں رمضان المبارک میں حاضر ہوا، آپ کے سامنے افطاری پیش کی گئی، بعض لوگوں نے اس میں سے نوش فرمالیا یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا، اس کے بعد مؤذن اذان دینے کے لیے چڑھا اس نے (اوپر سے) کہا کہ اے امیر المؤمنین! خدا کی قسم**

آفتاب تو ابھی موجود ہے غروب نہیں ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے روزہ افطار کرلیا وہ اس کی جگہ ایک روزہ (بطور قضا) رکھ لے، اور جس نے ابھی تک افطار نہیں کیا وہ غروب آفتاب تک ٹھہر جائے اور روزہ پورا کرے۔ (اسی واقعہ میں دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مؤذن کو (جس نے اوپر سے چلّا کر خبر دی تھی) فرمایا کہ: ہم نے تو تجھے نماز کی دعوت دینے کے لیے بھیجا تھا، سورج دیکھنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ (گویا مؤذن کی بے ادبی پر تنبیہ فرمائی) فتح القدیر۔

(۱۷) عن عمرو بن میمون الاودی قال کان اصحاب محمد ﷺ اسرع الناس افطاراً وابطأه سحوراً. (مصنف عبد الرزاق ۲۲۶/۴، عمدة القاری ۶۶/۱۱، فتح القدیر ۱۶۱/۴)

عمرو بن میمون اودی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ لوگوں میں سب سے زیادہ جلدی افطار کرنے والے، اور دیر سے سحر کھانے والے تھے۔

احادیث وآثار کے بعد کتب فقہیہ سے بھی نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) ''نور الایضاح'' میں ہے۔ ویستحب له ثلاثة اشیاء: السحور، وتاخیره، وتعجیل الفطر من غیر یوم غیم. (نور الایضاح ص۱۵۸)

روزہ کے لیے تین چیزیں مستحب ہیں: (۱) سحری کھانا۔ (۲) اس میں تاخیر کرنا۔ (۳) اور افطار میں جلدی کرنا جب کہ بادل نہ ہوں (بادل ہونے کی صورت میں روزہ کی حفاظت کے پیش نظر احتیاط برتنی چاہیے) (مراقی الفلاح)

''طحطاوی علی مراقی الفلاح'' میں ہے۔ یستحب الإفطار قبل الصلاة.

(طحطاوی علی مراقی الفلاح ص۳۷۳) نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا مستحب ہے۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں: وکان ﷺ یفطر قبل ان یصلی. (زاد

المعاد ۱/۳۳۳) نبی کریم ﷺ نماز مغرب پڑھنے سے پہلے افطار فرما لیتے تھے۔

امام محمدؒ نے ''مؤطا امام محمد'' میں صراحت فرمائی ہے کہ نماز مغرب سے پہلے بھی افطار کر سکتا ہے، اور نماز مغرب کے بعد بھی کر سکتا ہے؛ لیکن جو آدمی نماز مغرب کے بعد افطار کرنا چاہے، وہ سنت ونفل سے پہلے کرلے، یعنی فرض مغرب کے سلام پھیرتے ہی افطار کرلے تاکہ افطار میں تاخیر مکروہ کا مرتکب نہ ہو۔(رسائل الارکان ص ۲۱۵)

''تبیین الحقائق'' شرح کنز الدقائق میں ہے۔والمستحب فيه التاخير، وفى الفطر التعجيل. (تبيين الحقائق ۱/۳٤۳) یعنی سحری میں تاخیر اور افطار میں تعجیل مستحب ہے۔

(۳)''بدائع الصنائع'' میں ہے:ويسن تعجيل الإفطار اذا غربت الشمس، هكذا روى عن ابى حنيفةؒ انه قال: وتعجيل الإفطار اذاغربت الشمس احب الينا. (بدائع الصنائع ۲/۱۰۵) اور افطار میں جلدی کرنا مسنون ہے جب کہ سورج غروب ہوجائے، امام ابوحنیفہؒ سے اسی طرح منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آفتاب غروب ہوتے ہی افطار میں جلدی کرنا ہمارے نزدیک پسندیدہ ہے۔

(۴)''بحر الرائق'' میں ''فتاوی بزازیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ :ويستحب تعجيل الإفطار.(۲/۳۱۵) افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے؛ البتہ غروب آفتاب کا یقین یا ظن غالب ہونا ضروری ہے۔ولا يفطر مالم يغلب على ظنه غروب الشمس. (۲/۳۱۵)

(۵)''فتاوی عالمگیری'' میں ہے:وتعجيل الإفطار افضل، فيستحب ان يفطر قبل الصلوة. (فتاوى عالمگيرى ۱/۲۰۰) افطار میں جلدی کرنا افضل ہے، چنانچہ نماز (مغرب) سے پہلے افطار کرلینا مستحب ہے۔

(٦)درمختار میں ہے۔ويستحب السحور وتاخيره وتعجيل الفطر. (على

ھامش الشامی ۲/۱۲۴) اور روزہ دار کے لیے سحری کھانا اور اس میں تاخیر کرنا اور افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے۔

منقولۂ بالا نصوص، قرآن وحدیث وآثار صحابہ رضی اللہ عنہم وعباراتِ فقہیہ سے مشترک طور پر اتنی بات معلوم ہوئی کہ غروب آفتاب کا تحقق ہوتے ہی روزہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اور روزہ دار کے لے افطار کا استحباب ثابت ہو جاتا ہے، اب اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اذان دی جائے اور اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے؛ بلکہ بعض احادیث (مثلاً نمبر ۲، ۶، ۷، ۸) اور آثار (مثلاً نمبر ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶) سے تو اذان سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا افطار کرنا معلوم ہوتا ہے، اور اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما (نمبر ۱۰) سے درمیان اذان افطار کرنا ثابت ہوتا ہے، اس لیے افطار کا موزوں وقت شریعت مطہرہ کے نزدیک یہی ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ غروب آفتاب کا علم کس طرح ہو؟ تو اس کا جواب یہ کہ میدانی علاقوں اور دیہات وغیرہ میں تو ہر شخص بہ آسانی غروب آفتاب کو معلوم کرسکتا ہے، اور بڑے شہروں وغیرہ میں جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں لوگوں کو غروب آفتاب کی اطلاع نقارہ، توپ کا گولہ، سائرن، لائٹ وغیرہ کے ذریعہ دی جاسکتی ہے، اور بذریعۂ اذان بھی دی جاسکتی ہے۔ پہلی صورت کو بدعت قرار دینا درحقیقت بدعت کی تعریف سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اسی قسم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

جواب: نقارہ بجانا غروب شمس کی عام اطلاع کے لیے ہوتا ہے، اور جب کہ نقارہ غیر مشتبہ طور پر سنا جائے اور ظن غالب ہو کہ یہ نقارہ وہی ہے جو اطلاع افطار کے لیے بجایا جاتا ہے،

تو اس کی آواز سن کر افطار کر لینا مذہبِ حنفی اور شافعی دونوں میں جائز ہے۔

علامہ قیلوبیؒ نے ''شرح منہاج الطالبین'' کے حاشیہ میں لکھا ہے: ومنه سماع الطبول، وضرب الدفوف، ونحو ذلك ممايعتادفعله اول الشهر وآخره، اه، قلت: وكذااول الصوم وآخره. (کفایت المفتی ۲۳۴/۴،۲۳۵)

حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: طبلِ سحور کو فقہاء نے جائز لکھا ہے، اور افطار اور سحور کی مصلحت متشابہ ہے، اس لیے بھی کچھ حرج نہیں؛ مگر فرش مسجد سے علیحدہ ہو اور ناقوس وغیرہ سے اس کو اس لیے مشابہت نہیں کہ وہ لوگ اس طریقِ اعلان کی خصوصیت کو عبادت بھی سمجھتے ہیں، اور یہاں کوئی ایسا نہیں سمجھتا اور خیر القرون میں اس کی نظیر دفِ نکاح ہے کہ اس سے بھی مقصود اعلان ہے، ایک طاعت کی تحقیق کا، اور اس سے بھی مقصود اعلان ہے ایک طاعت کے وقت کے تحقق کا؛ بلکہ عند التأمل دف اپنی غرض میں اس قدر محتاج الیہ نہیں جس قدر عوام کے اعتبار سے یہ اپنی غرض میں محتاج الیہ ہے۔ (امداد الفتاوی ۱۰۴/۲)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''سحری یا افطاری کا اگر وقت معلوم نہ ہو اور روزوں کے فساد کا اندیشہ ہو تو نقارہ بجانا، یا گھنٹہ بجانا، باورد کا گولہ بنانا درست ہے؛ لیکن مسجد یا اس کی چھت پر نہیں چاہیے بلکہ مسجد سے ہٹ کر کسی دوسرے مکان یا بلند مقام پر چاہیے کیونکہ یہ چیز احترام مسجد کے خلاف ہے''۔ (فتاوی محمودیہ ۲۹۲/۷)

حضرت مولانا سید مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''الجواب: جس طرح نکاح اور اعلان جنگ کے لیے دف وغیرہ بجانا حدیثوں سے ثابت ہے، اسی طرح چاند نظر آنے اور سحری وافطاری کے وقت ضرورۃً بطورِ اعلان دف بجانا بھی جائز ہے، بشرطیکہ باجا بجانے کے طرز پر نہ ہو''۔ (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۴۰)

علامہ شامیؒ نے بھی ردالمحتار ۵/ ۲۴۷ میں اس کو لکھا ہے، اس لیے احادیث وآثار دیکھنے سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اذان سے پہلے افطار کرلیا جائے، اور عوام مسلمین کو غروب آفتاب کی اطلاع دینے کے لیے نقارہ وغیرہ کا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

نمبر سات پر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی جو روایت گزری اس میں صراحت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی آدمی کو بلند مقام پر کھڑا فرما دیتے تھے اور جہاں وہ غروب آفتاب کی اطلاع دیتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم افطار فرماتے تھے، اسی طرح نمبر نو میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا معمول اور نمبر ۱۵ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ (خادم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول بھی اس بات کی بین دلیل ہے کہ جو شخص خود غروب آفتاب پر واقف ہوا ہو وہ دوسروں کو اطلاع دے؛ تاکہ دوسرے اس اطلاع کی بنیاد پر افطار کریں اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ احادیث وآثار سے ثابت ہے۔

دوسری صورت اذان کی ہے، تو یہ یاد رہے کہ اصالۃً اذان نماز کے لیے دی جاتی ہے، افطار کے لیے نہیں، شریعت مطہرہ نے وقت نماز کی اطلاع کے لیے اذان کو وضع فرمایا ہے؛ لیکن چونکہ نماز مغرب کا وقت بھی غروب آفتاب کے تحقق سے شروع ہوتا ہے، اور افطار کے لیے بھی بعینہ یہی وقت ہے، اس لیے غروب آفتاب کا تحقق ہوتے ہی اگر اذان دے دی جائے تاکہ اس طرح لوگوں کو افطار کا وقت بھی معلوم ہو جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اس صورت میں اذان سننے والوں کو اختیار ہے کہ وہ اذان کے مکمل ہونے تک افطار

نہ کرتے ہوئے اذان کا جواب دیتے رہیں اور اذان ختم ہونے کے بعد افطار کریں، اور یہ بھی اختیار ہے کہ اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کر لے۔ پیشِ نظر کتابچہ میں اس صورت کو غلط قرار دیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ہم نے جو آثار نقل کیے ہیں ان میں نمبر دس پر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جو اثر ہے اس میں اس کی صراحت ہے کہ وہ اپنے ربیب کو مکان کی چھت پر بھیجتے تھے، اور غروب آفتاب ہونے پر جہاں وہ اذان شروع کرتا وہیں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آپ کے رفقاء افطار شروع فرماتے تھے۔

رہی یہ بات کہ اس صورت میں درمیان اذان کھانا پینا لازم آتا ہے تو حدیث و فقہ میں اس کے جواز کی صراحت موجود ہے۔

''ابوداؤد شریف'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ قال رسول الله ﷺ: اذاسمع احدکم النداء، والاناء علی یده فلایضعه حتی یقضی حاجته منه. (ابودؤدشریف ۱/۳۲۱)

''مراقی الفلاح'' شرح نورالایضاح میں اذان کے جواب کی تفصیل میں لکھا ہے: ولایجیب فی الصلوة ولوجنازة، وخطبة سماعها وتعلم العلم وتعلیمه، اولاکل الخ. (مراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی ص ۱۱۰)

''درمختار'' میں بھی اس کی صراحت موجود ہے (درعلی هامش الشامی ۱/۲۹۲)

اور روزہ دار کے حق میں تو بڑی وسعت ہے کہ نماز کی اقامت کہی جا چکی اور جماعت شروع ہو چکی ہے؛ لیکن روزہ دار کی ضرورت پوری نہیں ہوئی تو شریعت مطہرہ اجازت بلکہ حکم دیتی ہے کہ پہلے کھانا کھالے اس کے بعد نماز پڑھے۔ تمام حضرات محدثین نے مستقل باب قائم فرما کر اس مسئلہ کو اپنی اپنی کتابوں میں ذکر فرمایا ہے۔

امام بخاریؒ نے ”باب اذاحضر الطعام واقیمت الصلوۃ“ کے ذیل میں تین مرفوع حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ان میں ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب شام کا کھانا پیش ہو تو مغرب کی نماز پڑھنے سے پہلے کھانا کھالو۔(بخاری شریف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی روایت کو ذکر فرمایا ہے،اس کے بعد خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل نقل فرمایا ہے جب ان کے سامنے کھانا رکھا جاتا اور ادھر نماز کی اقامت شروع ہوتی (بلکہ نماز شروع ہوجاتی) تو جب تک وہ فارغ نہ ہوجاتے نماز میں شریک نہ ہوتے؛ حالانکہ وہ امام کی قراءت سن رہے ہوتے تھے۔(بخاری شریف)

علامہ بدرالدین عینیؒ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:اختلفوا فی هذا الامر، فالجمهور على انه للندب، وقيل للوجوب وبه قالت الظاهرية. قالوا: لايجوز لاحد حضر طعامه بين يديه وسمع الاقامة ان يبد أبالصلوة قبل العشاء، فان فعل فصلاته باطلة، والجمهور على الصحة. (عمدة القاری ۱۹۷/۵)

(یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امر سے وجوب مراد ہے یا استحباب اس سلسلہ میں) علمائے امت میں اختلاف ہے،جمہور علماء(جن میں ائمۂ اربعہ بھی ہیں،اس بات کے قائل ہیں کے یہ امر استحباب کے لیے ہے،اور ایک قول وجوب کا بھی ہے؛ چنانچہ اہل ظاہر نے اس کو اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس کے سامنے کھانا موجود ہو اور وہ اقامت کی آواز سنے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کھانے سے پہلے نماز شروع کرے،اگر اس نے ایسا کیا تو اس کی نماز باطل ہے؛لیکن جمہور علماء نماز کے صحیح ہونے کے قائل ہیں)۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ عمل جو اوپر بیان کیا گیا اس وقت ہوتا تھا،جب کہ وہ روزہ سے ہوتے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۲/ ۱۲۷،اور حافظ عینیؒ نے عمدۃ القاری ۵/

۱۹۸ میں اس کی تصریح فرمائی ہے، یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ ''مسند احمد'' میں بھی موجود ہے ''ترتیب مسند مسمی الفتح الربانی'' کی شرح ''بلوغ الامانی'' میں شیخ احمد عبدالرحمن البناالشھیر بالساعاتی اس موقعہ پر فرماتے ہیں: وکان ابن عمر رضی اللہ عنھما من اشد الناس تمسکابقولہ ﷺ وفعلہ. (۷/۱۰)

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جو نبی کریم ﷺ کے قول وفعل پر بڑی شدت (مبالغہ) سے عمل کرنے والے ہیں۔ حضرات فقہائے کرام نے بھی ''باب الامامۃ'' میں ان مسائل کی تفصیل ذکر فرمائی ہے۔

رہا مسئلہ اذان کے جواب کا تو فقہائے احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے اور محققین حضرات نے زبان سے جواب دینے کو مستحب قرار دیا ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: والذی ینبغی تحریرہ فی ھذا المحل ان الإجابۃ باللسان مستحبۃ، وان الإجابۃ بالقدم واجبۃ ان لزم من ترکھا تفویت الجماعۃ الخ (شامی ۱/۲۹٤)

(یعنی اس جگہ اس بات کی صفائی ضروری ہے کہ زبان سے جواب دینا مستحب ہے، اور قدم سے جواب دینا (یعنی نماز کے لیے جانا) واجب ہے اگر اس کے چھوڑنے سے جماعت کی تفویت لازم آتی ہو)۔

اور جن حضرات مشائخ حنفیہ نے زبانی جواب کو واجب کہا ہے، انہوں نے بھی اس آدمی کو جو کھانے میں مشغول ہے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ ہم آگے ''مراقی الفلاح'' اور ''درمختار'' کے حوالہ سے بیان کرچکے ہیں؛ نیز اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کرنے والا اگر جواب دینا چاہے تو دے سکتا ہے، دونوں میں کوئی منافات تو نہیں

ہے؛ اس لیے صاحب کتابچہ کا ''اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کرنے والے طریقہ'' کو غلط قرار دینا درست نہیں۔

نیز انہوں نے اپنے مالوف طریقِ افطار کا مستحب ہونا ثابت کرنے کے لیے مستقل کتابچہ ترتیب دیا؛ لیکن حدیث وفقہ کی کسی صریح عبارت سے اس طریقہ کو ثابت نہیں کر پائے۔ صرف جوابِ اذان کے سلسلہ میں جو فقہی جزئیات ہیں انہیں پیش کر دیا؛ لیکن اس سے ان کے مالوف طریقہ کا استحباب کہاں ثابت ہوا؟ اور اگر بالفرض وہ کسی صریح عبارت سے اس کا استحباب ثابت کر بھی دیتے، تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دوسرا طریقہ غلط ہے؛ بلکہ مؤلفِ کتابچہ کا اپنے مالوف طریقہ پر اس قدر اصرار تو غلو فی الدین کی صورت ہے، جو مستحب کو ترک کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

''مشکوۃ شریف'' میں ''بخاری ومسلم'' کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لا یجعل احدکم للشیطان شیئا من صلوته، یری ان حقا علیه ان لاینصرف الاعن یمینه، لقد رأیت رسول الله ﷺ کثیرا ینصرف عن یساره. (یعنی تم سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ رکھے اس طرح کہ وہ نماز کے بعد دائیں طرف سے گھومنے کو ضروری سمجھے، تحقیق کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو بہت مرتبہ بائیں طرف سے گھومتے بھی دیکھا ہے)۔

اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے ملا علی قاریؒ نے علامہ طیبیؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ: وفیه ان من اصر علی أمر مندوب، وجعله عزماً ولم یعمل بالرخصة، فقد اصاب منه الشیطان من الإضلال. (مرقات شرح مشکوۃ ۲/۳۵۳)

(یعنی اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی مندوب (ومستحب) بات پر اصرار کرے

اوراس کوضروری سمجھنے لگے اور (شریعت کی عطافرمودہ) گنجائش پر عمل نہ کرے، تو شیطان نے اس کوگمراہ کردیا ہے)

فقہائے کرام نے اصول بیان کیا ہے کہ: "تارك المستحب لا یلام" پس مستحب کے تارکین کوملامت کرنا یا قابل ملامت سمجھنا مستحب کواس رتبہ سے بڑھا دینا ہے؛ لہٰذا اس وجہ سے بھی وہ فعل مباح یا مستحب مکروہ ہو جائے گا۔(الجنة لأهل السنة ص ۱۴۲)

اِس لیے مؤلف کتابچہ نے جو روش اپنے رسالہ میں اختیار فرمائی ہے وہ اس صورت میں بھی درست نہیں، جب کہ ان کے مالوف طریقۂ افطار کا مستحب ہونا ثابت ہو جائے، چہ جائے کہ وہ بھی ثابت نہیں ہے۔

آخر میں دینی خیر خواہی (الدین النصیحة) کے پیش نظر مؤلف رسالہ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ خود اپنے اقرار کے مطابق وہ عالم دین نہیں ہیں، اور نہ ہی فتاویٰ نویسی کا فن انہوں نے معتبر علمائے کرام سے حاصل کیا ہے تو ان کو چاہیے کہ اس قسم کی صورتیں پیش آنے پر خود فتوی دینے کے بجائے معتبر وثقہ اہل علم کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے جو شرائط حضرات فقہائے کرام نے ضروری قرار دیے ہیں ان کے مفقود ہونے کی صورت میں اس پر اقدام بڑا خطرناک ہے، اور فرمان نبوی (علی صاحبها الف الف صلوة وتحية) کے بموجب "ضلّوا فاضلّوا" کا مصداق ہے۔

علامہ شامیؒ اپنی مشہور کتاب "شرح عقود رسم المفتی" (جو خاص اسی موضوع پر ہے) میں تحریر فرماتے ہیں: قال فی آخر منیة المفتی: لوان الرجل حفظ جمیع کتب اصحابنا لابد ان یتلمذ للفتوی حتی یهتدی الیه. (شرح عقود رسم المفتی ص ۹۷) (یعنی کتاب منیة المفتی کے آخر میں ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے اصحاب حنفیہ

کی تمام کتابوں کو حفظ کرلے تب بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے کسی (ماہر استاذ) کی شاگردی اختیار کرے تاکہ اس کا طریقہ معلوم ہو)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمہ اتم واحکم والحمد للہ تعالیٰ اولاو آخراً والصلوۃ علی نبیہ دائما ابداً۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۰/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

خادم دارالإفتاء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح

عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

كتاب الحج

حج ٹورس چلانے والوں کا کاروبار بڑھانے کے لیے بزرگ شخصیات کو مفت یا کم معاوضہ میں حج وعمرہ کرانا

سوال: (۱) بہت سارے لوگ حج وعمرہ ٹورس چلاتے ہیں، اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لیے اور زیادہ حاجی وصول کرنے کے لیے دو طریقے اپناتے ہیں۔ کسی ایسے آدمی کو جو کسی علاقہ یا شہر میں باعزت ہو ایسے شخص کو یا تو مفت میں حج میں لے جاتے ہیں یا بہت کم میں لے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ حضرت آپ کے ہونے سے لوگوں کو فائدہ ہوگا؛ لیکن دلی مقصد یہ نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ان کے ساتھ جاتا ہے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے اور حج کے بعد دوسرے سال کے لیے لوگوں سے یوں کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے میرے ساتھ حج کیا تھا، اور وہ بھی اس کے احسان کی وجہ سے لوگوں سے کہتے ہیں کہ اچھی ٹور ہے تاکہ دوبارہ پھر ان کو حج میں لے جائے؛ حالانکہ دیگر لوگ جنھوں نے بلا واسطہ کسی کے اس کے ساتھ حج کیا ہوتا ہے وہ اس ٹور والے کو بہت برا بھلا کہتے ہیں پھر بھی لوگ بزرگ کی بات پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(حضرت مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے کہ میں آپ کے سامنے اتنا سب لکھوں؛ اس لیے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں) مجھ کو یہ صرف اس وجہ سے لکھنے کی نوبت آئی ہے کہ بہت سارے ہمارے اپنے مجھ سے کہتے ہیں تو اپنی ٹور چلانے کے لیے ایسا کیوں نہیں کرتا جیسا کہ اور ٹور والے کرتے ہیں، (یعنی اوپر والی بات) میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ میں ان بزرگوں کو اپنی دنیا کمانے کا ذریعہ بناؤں، میرا مقدر میرے ساتھ ہے اور الحمدللہ خوب چلتا ہے، بس آپ سے صرف یہ جواب مطلوب ہے کہ میرے لیے بھی یہ ترتیب جائز ہے اور ان لوگوں (بزرگوں) کو بھی ایسا کرنے کی اجازت ہے؟

میرے استاد محترم ہونے کی وجہ سے میری صحیح رہبری فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تا دیر باقی رکھے۔آمین۔

سوال: (۲) حضرت استاذی! دوسرا سوال یہ عرض کرنا ہے کہ بہت سے ٹور والے حج میں حاجیوں کو بہت زیادہ پریشان کرتے ہیں، حاجی ان سے ناراض ہوتے ہیں، حج سے آنے کے بعد اس ٹور والے کو یہ فکر ہوتی ہے کہ آئندہ مجھ کو حاجی کیسے ملیں گے، امسال کے تمام حاجیوں نے اپنے اپنے علاقوں میں میری خوب لڑائی ہوگی تو ناراض ہونے والے حاجیوں میں ایسے آدمی کو تلاش کرتے ہیں جس کا لوگوں میں رسوخ ہو، اس کے پاس جاتے ہیں اور معافی تلافی کرتے ہیں، اور چکنی چپڑی باتیں کر کے پھر اس کو کہتے ہیں کہ حاجی صاحب آپ اگر مجھ کو حاجی دلوا دو گے تو میں آپ کو ایک حاجی پر مثلاً پانچ ہزار دوں گا، اگر آپ نے دس بیس حاجی کروا دیے تو آپ کا گزشتہ سال کا حج کا خرچہ نکل جائے گا، اس لالچ میں آ کر وہی آدمی اس کی تعریف کرنے لگتا ہے (اپنے مفاد کے خاطر) اور اس میں رقم بھی زیادہ طے کرتا ہے تا کہ اس کو دینے کے پیسے بھی نکل جائیں۔

سوال: (۳) دوسری شکل: بعض ٹور والے ہر جگہ پر اپنے ایجنٹ بناتے ہیں اور ان ایجنٹوں سے کمیشن طے کرتے ہیں اور چونکہ اس کو کمیشن دینا ہوتا ہے؛ اس لیے زیادہ دام رکھتے ہیں، پھر اس نے جو کام کیا اس کے عوض یا تو اس کو حج میں لے جاتے ہیں یا نقد اس کو دے دیتے ہیں، مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ہر حاجی ایک دوسرے سے پوچھتا ہے تم سے کتنے پیسے لیے تو جو لوگ بغیر ایجنٹ کے ڈائریکٹ ہم سے بک کرواتے ہیں ان سے ہم کچھ پیسے کم لیتے ہیں تو ایجنٹ کے معرفت آنے والے ٹور والے سے کہتے ہیں کہ تم نے ہم سے پیسے کیوں زیادہ لیے اور ان سے کم لیے؟ تو ٹور والے کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ تم لوگ ایجنٹ

کی معرفت آئے تھے تو مجھ کو ایجنٹ کو کمیشن دینا پڑا تو وہ حاجی ایجنٹ کو بہت برا بھلا کہتے ہیں؛ کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے یہ ایجنٹ بزرگ آدمی ہے یا باعزت باوقار آدمی ہے، اس لیے یہ ہمدردی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، کاش ہم کو معلوم ہوتا تو ہم بھی ڈائریکٹ جاتے، ہم نے ہمارا نقصان کر دیا، حج سے واپس آنے کے بعد اگر وہ ایجنٹ کوئی بزرگ یا کوئی داعی آدمی تھا تو عوام الناس میں اس کے مقام کی وجہ سے لوگ خاموش رہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے کسی کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ عرض ہے کہ کوئی آدمی ایجنٹ بن کر کام کرے تو اس کو یہ ظاہر کرنا چاہیے، ہر اس کے پاس آنے والے حاجی کو کہ: میرا کمیشن ہے تا کہ لوگ ناراض نہ ہوں، مکانوں کی دلالی میں عامۃ الناس جانتے ہیں ان کی دلالی ہوگی تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا۔

حج ٹور کے ایجنٹ کے متعلق اکثر لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے یہ اچھی ٹور میں حج کرنے کی ہمدردی کے لیے ہمارا تعاون کرتا ہے، اور پچھلی باتوں میں جو ٹور والوں کی مکّاریاں بیان کی ہیں یہ طریقہ جائز ہے؟ مجھ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے نہ آپ کے جوابات کا افشاء کر کے اپنا مفاد ڈھونڈوں، بس میرے اپنے علم کے لیے آپ استاذ محترم ہونے کی وجہ سے رہبری فرمائیں، اگر میری بھی کوئی شکایت آپ کے پاس پہنچی ہو تو میری اصلاح فرمائیں میں آپ کا شاگرد ہوں، باپ کے لیے بیٹے کی شکایت کو چھپانا بیٹے کے لیے نقصان ہے، اور استاذ کا مقام شاگرد کے لیے باپ سے بھی زیادہ ہے، گستاخی معاف فرمائیں۔ فقط والسلام۔ محمد الیاس بن فضل کریم احمد آبادی

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) آپ نے اپنے سوال میں جن نکات کو اٹھایا ہے، اس کا خلاصہ دو باتیں ہیں:

نمبر ایک یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے لیے ٹور لے جانے والے حضرات کسی ایسی شخصیت کو جو اپنے صلاح اور دین داری کی وجہ سے اپنے علاقہ میں مشہور ہے، بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر اپنے ساتھ حج یا عمرہ کے لیے یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ آپ کے ہونے سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا؛ لیکن ان کو لے جانے والوں کا دلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسی بزرگ اور عالم شخصیت کے ہمارے ساتھ ہونے سے بہت سے حج میں جانے والے حضرات ہماری ٹور میں سفر حج کرنے کو ترجیح دیں گے؛ تاکہ ان بزرگ کی برکات اور فیوض سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے، اور اس طرح ہماری ٹور میں حج کے لیے سفر کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر ہمیں مالی طور پر فائدہ حاصل ہوگا؛ نیز آنے والے سالوں میں بھی لوگوں کو ہماری ٹور میں سفر کرنے کے لیے آمادہ کرنے کے واسطے ہمیں یہ کہنے کا موقعہ ملے گا کہ فلاں بزرگ شخصیت نے گزشتہ سال ہمارے ساتھ حج کیا تھا۔

نمبر دو یہ ہے کہ خود وہ بزرگ شخصیت جن کو اس ٹور کے چلانے والے نے اپنے ساتھ حج کرایا، وہ باجود یہ جانتے ہوئے کہ اس ٹور کا نظم وانتظام ٹھیک نہیں ہے، اور اس میں سفر کرنے والوں کو وہ سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں جن کا وعدہ ٹور کے ذمہ داروں کی طرف سے معاملہ کرنے کے وقت کیا جاتا ہے، اس کے باوجود وہ بزرگ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف اور اس کے نظم کی تحسین محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس نے ان کو بلا معاوضہ حج کا سفر کرنے کی سہولت فراہم کی تھی۔ اب ہر ایک نمبر کا حکم لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو بنیادی ہدایتیں امت کو عطا فرمائیں، اور قرآن پاک میں بھی جن کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر عمل خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے انجام دیا جائے۔ ﴿وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین له الدین﴾ (انما

الاعمال بالنیات) یہاں تک کہ کسی کے ساتھ محبت یا بغض بھی اللہ ہی کے واسطہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو کمال ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''من اعطیٰ للہ و منع للہ و احب للہ و ابغض للہ فقد استکمل ایمانہ'' (ترمذی شریف) کہ جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لیے دے، اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لیے منع کرے، اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لیے کرے، اور اگر کسی سے بغض و عناد رکھے تو اللہ کے لیے رکھے تو اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی زید مجدہم فرماتے ہیں کہ: تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لیے محبت کرے۔ ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصۃً اللہ کے لیے ہوتی ہے جیسے کسی اللہ والے سے محبت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے محبت؛ اس لیے نہیں ہوتی ہے کہ اس سے پیسے کمائیں؛ بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کا فائدہ ہوگا اور اللہ تعالی راضی ہوں گے، یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدہ کی چیز ہے۔

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستہ سے گمراہ کر دیتا ہے، مثلاً اولیاء سے تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی، العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے کہ یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے تھی وہ اللہ کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ وہ محبت دنیا داری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا بعض لوگ کسی اللہ والے کے ساتھ؛ اس لیے رابطہ

جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحب منصب اور صاحب اقتدار بھی آتے ہیں، اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں، جب ہم ان بزرگوں کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہوں گے اور پھر اس تعلق کے ذریعہ ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے، العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کے لیے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لیے ہوگئی۔ (اصلاحی خطبات ۹/۳۲،۳۱)

اللہ تعالی کے نیک بندوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی راحت رسانی بھی اسی محبت کی بنیاد پر ہونی چاہیے، اگر یہ ٹور والے ان بزرگ شخصیتوں کو خالص اللہ کی محبت کی نسبت پر حج کے لیے لے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ عمل اللہ تعالی کی خوشنودی اور اس کی رضا کا ذریعہ تو بنتا ہی، ساتھ ہی ان کے کاروبار میں بھی برکت اور اضافہ ہوتا؛ لیکن نفس اور شیطان نے ان کی ایسی راہ ماری کہ اس عمل میں دنیاوی غرض شامل کر کے اس کے اجر وثواب سے بھی محروم کر دیا اور کاروبار کی ترقی کا بھی خدا حافظ۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ بزرگ شخصیت جن کو ٹور والے اس مقصد کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی ٹور والے کی اس بد نیتی کا علم یا احساس ہے، اس کے باوجود وہ اپنی ذات کو اس مقصد میں استعمال کرنے کی اجازت دے رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی بزرگی یا دین داری یا علم کو بکاؤ مال سمجھ کر اس کی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ جو بہت ہی خطرناک چیز ہے۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہ ''نور الایضاح'' کے مقدمہ میں طلبہ اور علماء کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حذار ثم حذار أن تريد بالعلوم الدينية الدنيا و جاهها و مالها، فان البهلوان الذي يلعب فوق الجبال خير من العلماء

الـذين يميلون الى المال لأنه يأكل الدنيا بالدنياوهؤلاء يأكلون الدنيا بالدين.
وقال بعض العلماء استجرارالجيفة بالمعازف أهون من استجرارها بالمصاحف
وقال تعالى جده: ﴿ولا تشتروا بآيتي ثمناً قليلاً و اياى فاتقون﴾ (مقدمۂ نور الایضاح:٦)

یعنی خبر دار پھر خبر دار! علوم دینیہ کے ذریعہ سے دنیا اور اس کا جاہ و مال طلب کرنے سے بچو؛ اس لیے کہ وہ پہلوان جو پہاڑوں کے اوپر تماشہ کرتا ہے، وہ ان علماء سے بہتر ہے جو مال کی طرف مائل ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ وہ دنیا کے ذریعہ سے دنیا کماتا ہے اور یہ لوگ دین کے ذریعہ دنیا حاصل کرتے ہیں۔ بعض علماء کا ارشاد ہے کہ مردار (دنیا) معازف (گانے بجانے کے آلات) کے ذریعہ حاصل کرنا مصاحف (قرآن وحدیث) کے ذریعہ حاصل کرنے کے مقابلہ میں سہل ہے، اورارشادِ خداوندی ہے: میری آیتوں کے بدلہ میں ثمن قلیل نہ حاصل کرو۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی زید مجدہم حضرت حکیم الأمت تھانوی نوراللہ مرقدہ کے حوالے سے ان کے کسی استاذ یا شیخ کا واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ وہ کسی دوکان پر کوئی چیز خریدنے گئے، اورانھوں نے اس چیز کی قیمت پوچھی، دوکان دار نے قیمت بتادی جس وقت قیمت ادا کرنے لگے تو اس وقت ایک اور صاحب وہاں پہنچ گئے جوان کے جاننے والے تھے، وہ دوکان داران کونہیں جانتا تھا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، چنانچہ ان صاحب نے دوکان دار سے کہا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، لہٰذاان کے ساتھ رعایت کریں، حضرت مولانا نے فرمایا کہ: میں اپنے مولوی ہونے کی قیمت نہیں لینا چاہتا، اس چیز کی جواصل قیمت ہے وہی مجھ سے لے لو؛ اس لیے کہ پہلے جو قیمت تم نے بتائی تھی اس قیمت پر تم خوش دلی سے یہ چیز دینے کے لیے تیار تھے، اب اگر دوسرے آدمی

کے کہنے سے تم نے رعایت کردی اور دل اندر سے مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں وہ خوش دلی سے دینا نہیں ہوگا، اور پھر میرے لیے اس چیز میں برکت نہیں ہوگی، اور اس کا لینا بھی میرے لیے حلال نہیں ہوگا؛ لہٰذا جتنی قیمت تم نے لگائی ہے اتنی قیمت لے لو۔

اس واقعہ سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ "مولویت" بیچنے کی چیز نہیں کہ بازار میں اس کو بیچا جائے کہ لوگ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت کم کردیں۔ (اصلاحی خطبات ۱۱/ ۱۲۸)

پھر ان بزرگ یا عالم صاحب کا اس ٹور کے متعلق یہ جانتے ہوئے کہ اس کا انتظام ٹھیک نہیں ہے؛ نیز گاہکوں سے معاملہ کرتے وقت جن سہولتوں کا وعدہ کرتے ہیں وہ فراہم نہیں کرتے، اس کے باوجود وہ اس کی تحسین وتعریف کریں تو یہ ایک طرح کی جھوٹی شہادت ہے، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، صحابۂ کرام سے فرمایا کہ: کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ضرور بتایئے، آپ نے فرمایا کہ: بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر آپ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان الکبائر، حدیث نمبر ۱۴۳)

آپ اس سے اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دہرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے چنانچہ فرمایا کہ:

﴿فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور﴾ (سورۂ حج ۳۰) یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

جھوٹی گواہی دینا، جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے؛ اس لیے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ؛ اس لیے کہ جب آپ نے جھوٹی گواہی دی اور جھوٹی گواہی کی وجہ سے دوسرا شخص یہ سمجھا کہ یہ آدمی بڑا اچھا آدمی ہے اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرلے گا اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجہ میں اس کو کوئی نقصان پہونچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی۔ (اصلاحی خطبات ۳/ ۱۴۶، ۱۴۷) ز

یہ تو آپ کے سوال میں اٹھائے گئے نکات کا حکم تھا؛ لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ٹور والا اس بزرگ اور عالم شخصیت کو اپنے کاروبار کو بڑھاوا دینے کے لیے بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر لے جا رہا ہے؟ اسی طرح وہ بزرگ اس ٹور والے کی (بقول آپ کے) بدنیتی کو جانتے ہوئے اپنی بزرگی سے اس طرح فائدہ اٹھانے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں؟ اگر خود ٹور والے نے آپ کے سامنے اپنے اس اندرونی ارادہ کا اظہار کیا ہے یا ان بزرگ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، تب تو اس کا حکم وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے بلکہ آپ اپنے گمان اور قیاس سے یہ بات فرما رہے ہیں تو حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ایاکم و الظن، فان الظن اکذب الحدیث اور باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یا یھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم﴾ ہمیں تو شریعت مطہرہ نے ظاہر کے مطابق معاملہ کرنے کا

حکم دیا ہے اور دلوں کے اندر کا حال خدا کے حوالہ کرتے ہوئے ظنوا بالمؤمنین خیراً کی تاکید کی گئی ہے، اور دلوں کے اندرونی کیفیات کی ٹوہ میں لگنے کے بجائے ﴿ولا تجسسوا﴾ فرما کر دلوں کے اندر کے حال کو ﴿یوم تبلی السرائر﴾ پر محول کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(۲) اوپر کے جواب میں اس کا حکم بھی آچکا ہے۔

(۳) ایجنٹ بن کر کام کرنے والے کو بطور کمیشن جو رقم دی جاتی ہے، وہ دلالی ہے، اور فقہاء نے دلالی کا جواز ہی عرف کی بنیاد پر دیا ہے؛ اس لیے جس طرح مکانوں کی دلالی میں مکان خریدنے یا بیچنے والے کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میرے اس کام میں جو آدمی میری مدد کر رہا ہے، وہ اپنی اس محنت پر دلالی کی شکل میں معاوضہ وصول کر رہا ہے۔ اور دلالی بھی اسی صورت میں جائز ہے ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں حاجی اگر یہ سمجھ رہا ہے کہ ٹور والے کے ساتھ میرا معاملہ طے کرانے والی یہ شخصیت محض میری خیر خواہی میں نہیں بلکہ اپنی اس محنت پر ملنے والے معاوضہ اور دلالی کی خاطر کام کر رہی ہے، تب تو اس آدمی کے لیے یہ کمیشن لینا جائز اور درست ہوگا، ورنہ اس سے بڑا دھوکا اور کیا ہوسکتا ہے کہ حاجی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ عالم صاحب یا داعی صاحب میری خیر خواہی کے جذبہ سے یہ ساری مشقت اٹھا رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر وہ ان کے متعلق اپنے دل کو احساس ممنونیت سے بھرا ہوا پاتا ہے، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے، چنانچہ جب حاجی کے سامنے حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ اس کے متعلق لعن وطعن کرتا ہے اور اول فول بکنے لگتا ہے، دین کی نسبت پر عزت کے مقام پر فائز شخصیت کے لیے اس سے بڑا المیہ کیا ہوسکتا ہے؟ العیاذ باللہ۔ ٹور والے کو بھی چاہیے کہ وہ حاجی کے سامنے پہلے ہی یہ اظہار کر دے کہ آپ کا معاملہ مجھ سے طے کرانے والی شخصیت کو میں ان کی محنت کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں،

ورنہ تو ٹور والا بھی اس تزویر اور دھوکہ بازی میں برابر کا شریک ہو کر آخرت میں مسئول ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

حج ٹور کے ایجنٹ کی اجرت کا حکم

سوال: یہ مسئلہ ان ایجنٹ حضرات پر ہے جو حج ٹور والوں کو حاجی صاحبان کمیشن پر دیتے ہیں، اور ان ایجنٹ حضرات کی نیت یہ ہوتی ہے کہ کمیشن بھی مل جائے گا اور حج بھی ہو جائے گا، اور یہ حضرات حج کے ارکان بھی حاجیوں کو مکمل کراتے ہیں، اور حاجی صاحبان کو لانا اور لے جانا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اور ایسا ہر سال ہوتا ہے؛ لہٰذا کیا ایسا کرنے سے یعنی کمیشن کی وجہ سے ان لوگوں کا حج اور عمرہ کامل ہوتا ہے؟ اور ثواب کے اعتبار سے اجر بھی پورا کا پورا مل جاتا ہے یا پھر اس حج اور عمرہ میں کچھ کمی رہ جاتی ہے، اس عمل پر فتویٰ کیا ہے؟ جب کہ ان ایجنٹ صاحبان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ ہمارا حج بھی ہو جائے گا اور کمیشن بھی مل جائے گا۔ نیز ان ایجنٹ صاحبان کا خرچ یعنی آنا جانا اور طعام و مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ یہ سب خرچ مالکِ ٹور پر ہوتا ہے۔ آپ اس مسئلہ کا مکمل و مدلل جواب عنایت فرمائیں۔ فقط۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں دریافت کردہ صورت دلالی کی ہے، جس کی فقہائے احناف نے تعامل اور لوگوں کی حاجات کے پیشِ نظر اجازت دی ہے بشرطیکہ اجرت پہلے سے طے کر دی گئی ہو؛ اس لیے اگر کوئی آدمی ٹور والوں کو گاہک لا کر دیتا ہے، اور ٹور والے اس کو بطور کمیشن پہلے سے مقرر شدہ اجرت دیں تو درست ہے؛ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ

ٹور والا کمیشن کی مقدار بڑھا کر وصول نہ کرے بلکہ اپنی طرف سے کمیشن کی رقم اداء کرے۔

(مأخوذ از جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۷/محرم الحرام ۱۴۳۰ھ مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی معین مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ایک حج ٹور والے کا تصریح (یعنی حجاج کو لے جانے کا اس کو ملا ہوا کوٹا) دوسرے ٹور والے کو بیچنا، اس سلسلہ کے چند مسائل

سوال: (۱) ۲۰۰۳ء سے جو ٹور گورنمنٹ آف انڈیا کے فورین افیرس حج سیل میں رجسٹرڈ (Registerd) ہو وہی ٹور حج کے لیے حاجی لے جا سکتا ہے۔ اور جو ٹور حج سیل سے رجسٹرڈ (Registerd) ہے انہیں حج سیل کی اور سے لائسنس (Licence) اور کوٹا (Quota) یعنی تصریح ایلوٹ کیا جاتا ہے۔ اور جس ٹور کو جتنا کوٹا (Quota) ملتا ہے، اس کے مطابق حاجی لے جا سکتا ہے، (مثلاً جس ٹور آپریٹر کے پاس لائسنس ۱۰۰ کے کوٹا کا ہے، وہ ٹور آپریٹر ۱۰۰ حاجی لے جا سکتا ہے)

(۲) اب ان ٹور آپریٹروں میں کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو گورنمنٹ آف انڈیا (Government of India) کے فورین افیرس حج سیل میں رجسٹرڈ نہیں ہے یعنی ان کے پاس نہ حج کا ٹور لے جانے کا لائسنس ہے، نہ تو حج کا کوٹا (تصریح) ہے۔ ایسے ٹور آپریٹر رجسٹرڈ (Registerd) ٹور آپریٹر سے کوٹا (تصریح) خرید کر اپنی ٹور لے جاتے ہیں۔ یہ کاروبار گورنمنٹ آف انڈیا کے قانون کے خلاف ہے تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۳) ان ٹور آپریٹر میں کچھ آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور لے جاتے ہیں، اب انہیں جو کوٹا (تصریح) گورنمنٹ آف انڈیا کے حج سیل سے ملا ہے اتنے کوٹا (تصریح) کا بکنگ (Booking) پورا ہو جانے پر جو ٹور آپریٹر اپنا کوٹا (تصریح) بیچتے ہیں ان سے کوٹا (تصریح) خرید کر جو ٹور کا دام ہوتا ہے+ کوٹا (تصریح) کے روپیئے (مثلاً ٹور کا دام ۱۰۰۰۰۰+۲۰۰۰۰ کوٹا کے روپیئے) پر اپنا بکنگ کرتا ہے تو کیا یہ کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۴) ان ٹور آپریٹر میں کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور لے جاتے ہیں، اس ٹور آپریٹر کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو کوٹا (تصریح) ہے اس سے زیادہ بکنگ (Booking) آئے گا اس لیے وہ ٹور آپریٹر کوٹا (تصریح) بیچنے والے ٹور آپریٹر سے پہلے ہی سے کونٹیکٹ (Contact) کر کے انہیں ایڈوانس (Advance) میں کوٹا (تصریح) کے پورے روپیئے دے کر ان سے کوٹا (تصریح) خرید لیتے ہیں اور پھر اپنے اوریجنل (Original) کوٹے کا بکنگ ہو جانے پر (ٹور کا دام+ کوٹے کے روپیئے) لے کر اپنا بکنگ کرتے ہیں تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۵) کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور نہیں لے جا کر اپنا کوٹا (تصریح) جو ٹور آپریٹر حج کا ٹور لے جاتا ہے اسے دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ پارٹنرشیپ (Partnership) کرتے ہیں یعنی کوٹا (تصریح) جو ٹور آپریٹر ٹور نہیں لے جاتا اس کا ہوتا ہے، اور محنت جو ٹور لے جاتا ہے اس کی ہوتی ہے، اس معاملہ میں کوٹا کی خرید و فروخت نہیں ہوتی بلکہ ٹور پورا ہونے پر منافع میں حساب ہوتا ہے، اور ٹور کا جو دام ایک مرتبہ طے ہوتا ہے اس میں بھی فرق نہیں آتا تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۶) کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور کا دام شروع میں کم رکھتے ہیں، اور حج کمیٹی کی قرعہ اندازی (Draw) ہو جانے پر اور دوسرے ٹور میں جگہ بھر جانے پر ٹور کے دام زیادہ کر دیتے ہیں، تو اس طرح کا کاروبار کرنا اور حاجیوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۷) اب میرا سوال ان حاجیوں کے بارے میں ہے جن کا فرض حج ادا ہوگیا ہوتا ہے، اور وہ حج نفل ادا کرنے جا رہے ہیں تو کیا ان کا ان ٹور والوں سے زیادہ قیمت دے کر کوٹا (تصریح) خریدنا شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

نوٹ: کوٹا (Quota) (تصریح) کا بیچنا یا خریدنا گورنمنٹ آف انڈیا (Government of India) کے قانون کے سخت خلاف ہے۔ اس سوال کا جواب شریعت کی روشنی میں حوالہ کے ساتھ مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کے جوابات سے پہلے تمہید کے طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے؛ تاکہ جوابات سمجھنے میں آسانی ہو:

آپ نے لائسنس اور کوٹا (Quota) یعنی تصریح کی جو تفصیل کی ہے اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا (Government of India) کی طرف سے ان ہی ٹور اینڈ ٹراویلس (Tours&Travels) والوں کو حاجی لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو گورنمنٹ کے فورین افیرس کے حج سیل میں رجسٹرڈ (Registerd) ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ حاجیوں کو وہی ٹورس اینڈ ٹراویلس (Tours&Travels) حج کے لیے لے جاسکیں جو صحیح طریقہ سے اس ذمہ داری کو نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ تاکہ

وہاں جا کر حاجیوں کو کسی پریشانیوں کا سامنا نہ ہو؛ نیز سعودی گورنمنٹ کی طرف سے ہر ملک کے واسطے حاجیوں کی ایک مخصوص تعداد مقرر ہوتی ہے، جن کو حج کا ویزا دیا جاتا ہے؛ تا کہ سعودی گورنمنٹ کے لیے حاجیوں کا انتظام کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو، اسی کو حج کے کوٹے کا نام دیا گیا ہے۔ اس کوٹے میں سے ایک بڑا حصہ تو وہ ہوتا ہے جن کو انڈیا گورنمنٹ (IndiaGovernment) اپنے ایک شعبہ یعنی حج کمیٹی کی طرف سے انتظام کر کے حج کے لیے بھیجتی ہے، اور ایک مخصوص تعداد جو ٹور اور ٹراویلس کمپنیاں حج کے لیے حاجی لے جاتی ہیں ان کے حوالہ کرتی ہے، اور وہ ان حاجیوں کو اپنے انتظام سے حج میں لے جا کر حج کراتی ہیں، اس مخصوص مقدار میں سے ایک مقررہ تعداد ہر ٹور والے کو اس کی گذشتہ سالوں کی کارکردگی کی بنیاد پر لے جانے کی اجازت دیتی ہے، اسی اجازت کو تصریح کے نام سے جانا جاتا ہے، اور پھر اسی کے مطابق سعودی کونسیولیٹ (Consulate) کی طرف سے اس ٹور والے کو ویزا اجاری کیا جاتا ہے، گویا یہ ایک حق ہے جو اس ٹور والے کو اس کی سابقہ کارکردگی کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے، اور اس حق کے اس کو حاصل ہونے میں اس کی سابقہ کارکردگی کو دخل ہے؛، نیز اس تصریح پر کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا گیا، شرعی اعتبار سے یہ ایک خالص حق ہے، جس کو صاحب حق خود تو استعمال کر سکتا ہے؛ لیکن کسی کو معاوضہ لے کر اس کا بیچنا شرعاً جائز نہیں، اگر وہ اپنی مجبوری یا حالات کی وجہ سے اس سال حج کے لیے حاجیوں کو لے جانے کی طاقت نہیں رکھتا یا اس کا ارادہ نہیں، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے اس ارادہ سے گورنمنٹ کو باخبر کر دے؛ تا کہ وہ حق گورنمنٹ دوسرے کسی ٹور والے کو جو گورنمنٹ کے اصول کے مطابق یہ انتظام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو دے دے، خود گورنمنٹ نے بھی اس کو بیچنا جائز نہیں رکھا، گویا گورنمنٹ کے مطابق بھی ایسا کرنا قانون کی خلاف ورزی

ہے، اور اس طرح کے امور میں آدمی جس گورنمنٹ کے ماتحت رہتا ہو اس کا حکم ماننا ضروری ہو جاتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں چونکہ جیل یا ڈنڈ کا اندیشہ ہے، اس لیے بھی ایسا کرنا جائز نہیں، وہ کام جس سے جان یا مال کو خطرہ لاحق ہوتا ہو، اور شرعی اعتبار سے بھی اس میں کوئی قباحت نہ ہو، اس کا ارتکاب شرعاً جائز نہیں، چہ جائیکہ شرعاً بھی یہ عمل درست نہیں۔ اب آپ کے سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) اپنی تصریح (Quota) کسی دوسرے ٹور آپریٹر کو بیچنا درست نہیں، اور جو رقم اس طرح حاصل کی گئی ہے وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے، جس سے لی گئی ہے اُسی کو لوٹا دی جائے۔

(۲) یہ کاروبار بھی درست نہیں۔

(۳) یہ بھی درست نہیں۔

(۴) یہ بھی درست نہیں۔

(۵) جس ٹور آپریٹر کو کوٹا ملا ہوا ہے وہ خود بھی دوسرے ٹور آپریٹر کے ساتھ جو ٹور لے جا رہا ہے جاتا ہے، اور حاجیوں کو لے جانے، لانے کی خدمت میں حصہ لیتا ہے، تب تو ایسا کرنا درست ہے، ورنہ یہ بھی عملی طور پر تصریح بیچنے ہی کی طرح ہے جو درست نہیں۔

(۶) اپنی خدمات کی قیمت موقع اور محل کے اعتبار سے کم یا زیادہ وصول کرنا بشرطے کہ معاملہ کرتے وقت شروع ہی سے اس کی وضاحت کردی گئی ہو درست ہے؛ البتہ سامنے والے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا شرافت ایمانی کے خلاف ہے۔

''احسن الفتاوی'' سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے اس سے یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا:

سوال: ایک شخص ضرورت کی بنا پر اپنی کوئی چیز فروخت کرنا چاہتا ہے، اور خریدار

اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بہت کم دام لگاتا ہے، مثلاً ایک گھڑی جس کی قیمتِ خرید ۲۰۰ روپئے ہے، اور بحالت موجودہ ۱۰۰ روپئے میں فروخت ہوسکتی ہے؛ لیکن خریدار ۲۵ سے زیادہ پر خریدنے کے لیے تیار نہیں تو کیا خریدار کا یہ عمل جائز ہے؟

جواب: یہ عمل جائز تو ہے؛ مگر خریدار اگر صاحب استطاعت ہے اور بیچنے والا واقعۃً مجبور ہے تو خریدار کو مروّت سے کام لینا چاہیے اور حتی المقدور بائع کو صحیح قیمت ادا کرنا چاہیے، غرض بیع تو بہر صورت صحیح ہے؛ مگر کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اخلاق و مروّت کے خلاف ہے۔ (احسن الفتاوی ۶/۵۰۲)

(۷) اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱/۲/۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح　　الجواب صحیح

عباس داؤد بسم اللہ　　عبد القیوم راجکوٹی

جھوٹا حلف نامہ داخل کر کے سبسڈی حاصل کرنا جائز نہیں

سوال: (۱) ہر سال حکومت ہند کے بیت المال سے حج کمیٹی کے ذریعہ حج کرنے جانے والوں کے لیے سبسڈی کے نام پر ہوائی جہاز کے کرایہ میں مخصوص رعایت تقریباً بیس ہزار روپے دی جاتی ہے، امسال حکومتِ ہند نے یہ قانون بنادیا ہے کہ جو گذشتہ سالوں میں حج کمیٹی کے ذریعے حج کر چکے ہیں، اور دوسرے وہ جو انکم ٹیکس بھرتے ہیں (اس زمرے میں تمام سرکاری ملازمین آتے ہیں)، انھیں یہ سبسڈی نہیں دی جائے گی، اس کے لیے خاص طور سے حج کمیٹی ایک حلف نامہ مانگ رہی ہے اور اس کا مضمون صاف الفاظ میں یہی ہے کہ: ''میں (زید) نے اس سے قبل حج ادا نہیں کیا'' جب کہ میں

حج کر چکا ہوں، دوسرے یہ کہ میرے دوست عمر کو یہ حلف دینا پڑ رہا ہے کہ ''وہ انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے'' جب کہ وہ پابندی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، تو کیا جہاز کے کرائے میں بیس ہزار روپے بچانے کے لیے از روئے شرع جھوٹا حلف نامہ داخل کرنے کی اجازت ہوگی؟ اور کیا ایسا حج قبول ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرآن اور حدیث میں جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسم کھانے کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس پر وعیدیں سنائی گئی ہیں اور ان کا شمار کبیرہ گناہوں میں کیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا، اور ناحق کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔ (مشکوۃ ۱۷)

جہاز کے کرایہ میں بیس ہزار روپئے بچانے کے لیے فارم کی خانہ پُری کرتے وقت جھوٹا حلف نامہ داخل کرنا سخت حرام اور کمینہ حرکت ہے، جب وہ آدمی حج کمیٹی کے ذریعہ پہلے حج کر چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کا غالباً نفل حج ہے، اور سب جانتے ہیں کہ نفل کا مطلب یہ ہے کہ کرے تو ثواب اور نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں؛ لیکن یہ شخص اس نفل حج کے لیے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، جس سے بچنا اس کے لیے ضروری اور فرض تھا، بھلا ایسا حج کیا قبول ہوگا۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ ''اصلاح انقلاب'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل میں یا جہاز میں یا اونٹ پر فرض نمازیں برباد کرتے ہیں، سو انہوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور اتنے کثیر فرض فوت کیے اور اگر حج فرض نہیں تھا، نفل تھا تو اور بھی غضب ہوا کہ ایک نفل کے لیے اتنے فرض گئے

گذرے، سوا ایسے شخص کو حج کرنا جائز بھی نہیں"۔ (اصلاح انقلاب ۱/۱۶۲)

علماء نے لکھا ہے کہ: حج مبرور وہ ہے جس میں کسی گناہ اور خلاف شرع کام کا ارتکاب نہ ہوا ہو۔ جھوٹا حلف نامہ کبیرہ گناہ ہے، لہٰذا اس کے بعد یہ حج کہاں مقبول اور مبرور رہا، چند کوڑیوں کے لیے ایسی شنیع حرکتوں کا ارتکاب اور وہ بھی حج جیسی عظیم الشان عبادت کی ادائیگی کے نام پر سراسر ایمانی غیرت کے خلاف ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حجاج کرام کا حکومت کی سبسڈی سے فائدہ اٹھا کر حج کرنا

سوال: حج اسلام کا پانچواں رکن ہے جو صاحب استطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔ اور ادائیگیٔ حج کے لیے حاجی کی ذاتی ملکیت کا زادِراہ ہونا ضروری ہے۔

ہمارے ملک سے جو حجاج حج کمیٹی کے معرفت اس فریضہ کو انجام دیتے ہیں ان کے سفر کے کرائے میں حکومت ہند ایک حصہ سبسڈی (subsidy) دیتی ہے جس کی وجہ سے ان کا ہوائی سفر دوسرے ذرائع سے حج کرنے والے حجاج کے مقابلے میں کافی کم میں ہوتا ہے، نیز زرِمبادلہ کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔

سال گزشتہ بمبئی کے اخبارات میں سعودی عرب کے علماء سے منسوب یہ بیان شائع ہوا تھا کہ حکومت یا کسی اور طرح سے سبسڈی (subsidy) سے فائدہ لے کر ادا کیا ہوا حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا۔

برائے مہربانی اس بات کا خلاصہ کریں کہ حکومت کی سبسڈی (subsidy) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا ہوا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کرایہ میں حکومت ہند کی طرف سے دی جانے والی سبسڈی (subsidy) یہ

درحقیقت ایک رعایت ہے جو کرایہ کے سلسلہ میں حاجیوں کو دی جاتی ہے؛ اس لیے کہ حاجیوں کو لے جانے والی ہوائی سروس بھی حکومت کی ملک ہے، اسی طرح زرِمبادلہ کی شرح میں کمی بھی ایک طرح کی رعایت ہے۔ عقدِ اجارہ میں اجرت پر لے جانے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کرایہ کی مقررہ مقدار میں کسی فرد یا جماعت کے لیے کوئی حصہ کم کردے۔ اسی طرح خرید وفروخت میں بائع کو اختیار ہے کہ مبیع کے مقررہ ثمن میں کمی کردے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ اجرت پر حاجیوں کو سفر کے لیے لے جانے والی بھی درحقیقت حکومت ہند ہے؛ اس لیے اس کا یہ اقدام شرح کرایہ میں ایک قسم کی تخفیف کہلائے گا۔ اسی طرح زر مبادلہ میں حکومت ہند بائع کی حیثیت رکھتی ہے، اور زرمبادلہ کی شرح میں کمی ایسی ہی ہے جیسے بائع کی طرف سے مقررہ ثمن میں کی جانے والی تخفیف۔ اور یہ دونوں امور بلاشبہ درست ہیں، ہم اس ملک میں رہتے ہوئے بہت سے معاملات میں حکومت کی طرف سے دی جانے والی ایسی رعایتوں سے بلا دریغ فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً: گیس سلنڈر کی خریداری میں، حکومت کی طرف سے راشن کی دکان پر فروخت ہونے والے غلہ میں وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس بنیاد پر یہ کہنا کہ حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا، اصول شرع کے مطابق سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ حج کے لیے جن چیزوں کو شرائط وارکان وواجبات وسنن کا درجہ دیا گیا ہے ان تمام کے انجام دینے پر حج کے صحیح اور ادا ہونے کا حکم لاگو کیا جاتا ہے۔ حکومت سے ملنے والی سبسڈی کا قبول نہ کرنا ارکان وشرائط وواجبات میں سے نہیں۔

(قوله كالحج بمال حرام) كذا في البحر، والاولى التمثيل بالحج رياء و سمعة فقد يقال أن الحج نفسه الذى هو زيارة مكان مخصوص الخ۔ ليس حراما بل الحرام هو انفاق المال الحرام ولا تلازم بينهما كما أن الصلاة

فـی الارض المغصوبة تقع فرضا و انما الحرام شغل المکان المغصوب لا من حیث کون الفعل صلاة لان الـفرض لا یمکن اتصافه بالحرمة، و هنا کذلك فـان الـحج فی نفسه مأمور به و انما یحرم من حیث الانفاق و کأنه أطلق علیه الـحـرمة لأن للمال دخلاً فیه فان الحج عبادة مرکبة من عمل البدن و المال کما قدمناه، و لذا قال فی البحر و یجتهد فی تحصیل نفقة حلال فانه لا یقبل بـالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع أنه یسقط الفرض عنه معها و لا تنافی بین سقوطه و عدم قبوله فلا یثاب لعدم القبول و لا یعاقب عقاب تارك الحج. اه. أی لأن عـدم التـرك یبتنی علی الصحة و هی الاتیان بالشرائط و الارکان و الـقبـول الـمترتب علیه الثواب یبتنی علی أشیاء کحل المال و الاخلاص کما لـو صـلـی مرائیا أو صام و اغتاب فان الفعل صحیح لکنه بلا ثواب۔ و اللّٰہ تعالی أعلم. (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۱۵۲)

جولوگ حکومت ہند یا سعودی حکومت یا دنیا کی دیگر حکومتوں میں سے کسی حکومت کے مصارف پر پورا حج ادا کرتے ہیں، کیا آج تک ان کے متعلق سعودی عرب کے علماء یا کسی اور عالم نے ایسا بیان دیا ہے کہ ان کا حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۱/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

حج سبسڈی سے استطاعت حج کا تحقق

سبسڈی پر شبہ اور مشورہ

سوال: حج اسلام کا مقدس اہم، بنیادی اور آخری فریضہ ہے، جو ہر صاحب

استطاعت پر شرائط کے ساتھ صرف ایک بار فرض ہے، یعنی وہ شخص جو مکمل طور پر سفر خرچ، حرمین شریفین میں قیام طعام؛ نیز غیر حاضری میں اہل وعیال اور متعلقین کا نان ونفقہ، اور دیگر ضروریات پوری کرنے کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر فریضۂ حج لازم آتا ہے۔ اسلام اس کے لیے تکلفات قرض اور کسی کے احسان کو پسند نہیں کرتا۔

ہمارے ملک ہندوستان سے عازمین حج بڑی تعداد میں مرکزی حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کرتے ہیں، اور پرائیویٹ ٹورس اور ٹراویلس کے ذریعہ حج کرنے والوں کی بھی خاصی تعداد ہے، سینٹرل حج کمیٹی حکومت ہند کا ایک ادارہ ہے، جس کا کام پلیگریم پاس یعنی عارضی پاسپورٹ بنانا، زرمبادلہ دینا، حرمین شریفین میں قیام کا انتظام کرنا وغیرہ ہے، بحری جہاز میں کرایہ کم تھا اس وقت سبسڈی Subsidy دی جاتی تھی یا نہیں اس کا علم نہیں؛ لیکن جب سے وہ بند ہوئے اور ہوائی جہاز سے سفر شروع ہوا تو کرایہ میں بھی زبردست اضافہ ہوگیا، اس وقت مسلمان قائدین کی درخواست پر حکومت ہند نے کرایہ میں Subsidy کے نام سے رعایت دینی شروع کی، ہوائی جہاز ائیرانڈیا کی چارٹر ہو یا کسی بھی ایئر لائنس کی ہو، حکومت ہر ایئر لائنس کو فی کس 770 ڈالر تقریباً 35,000 روپۓ ادا کرتی ہے، جب کہ حاجیوں سے کرایہ صرف 12,000 لیتی ہے بقیہ 23,000 حکومت اپنی طرف سے ادا کرتی ہے، امسال جو ایک لاکھ حاجی سینٹرل حج کمیٹی کے ذریعہ حج کے سفر پر گئے ہیں ان کی طرف سے حکومت نے 225 کروڑ روپیہ ادا کیا ہے، یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ وہ رقم کہیں مشکوک تو نہیں؟ حکومت Subsidy آخر کس مد سے دیتی ہے؟ عام طور پر حجاج اس سے ناواقف ہوتے ہیں؛ لیکن اب یہ بات علم وشعور میں آنے لگی ہے کہ حکومت اس کو احسان سمجھتی ہے اور ملک کے دیگر طبقات میں اس کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، مسلمانوں

کے ساتھ مراعات واحسانات میں Subsidy کو گنایا جاتا ہے، اور جتلایا جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ حکومت ہم سے بہت سے ٹیکس وصول کرتی ہے اور وہی رقم ہمیں Subsidy کے نام سے دے دیتی ہے، کہاں تک صحیح ہے؟ جب کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ حکومت کی طرف سے بہت سے فلاح و بہبودی کے کام عوام کے لیے بلا تفریق مذہب وملت انجام دیے جاتے ہیں۔ جیسے اسکول چلانا، ہسپتال چلانا، اور سڑکیں بنوانا وغیرہ، اسی طرح یہ کہنا کہ حکومت جب دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے مذہبی تہواروں میلوں کے لیے رعایتیں دیتی ہے تو مسلمانوں کو بھی وہ رعایتیں حاصل کرنی چاہیے کہاں تک صحیح ہے؟ مسلمانوں کی اپنی ایک شان ہے اس کا امتیاز ہے دوسروں کی نقالی کرنا بالخصوص فریضۂ اسلام کی ادائیگی میں اس کو کیا زیب دیتا ہے؟

ملت کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ حج کے لیے مسلمانوں کو شرائط کی روشنی میں خود کفیل ہونا چاہیے تکلفات، احسانات اور بالخصوص حکومت کے زیر احسان حج کرے، یہ امر روح اسلام کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

پتہ نہیں یہ Subsidy صرف ہمارے سیکولر ملک میں ہے یا دیگر اسلامی مما لک میں بھی اس کی نظیر پائی جاتی ہے؟ حضرات علمائے کرام سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ بینوا و توجروا. فقط والسلام

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرات فقہاء نے حج کے لیے چار قسم کی شرائط بیان کی ہیں: (۱) شرائط وجوب حج (۲) شرائط وجوب ادا (۳) شرائط صحت ادا (۴) حج کے فرض کی جگہ واقع ہونے کے شرائط۔ (عمدۃ الفقہ ۴/ ۲۷)

وھی انواع ای اربعة: شرط الوجوب، وشرط الاداء، وشرط صحة الاداء، وشرط وقوعه عن الفرض. (مناسك ملا علی قاری ص۲۱)

حج کی شرطوں کی پہلی قسم شرائط وجوب حج ہے، اور یہ وہ شرطیں ہیں کہ جب کسی شخص میں وہ سب شرطیں پائی جائیں، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، اور اگر وہ تمام شرطیں یا ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو اس پر حج بالکل فرض نہیں ہوتا، اس پر خود ادا کرنا بھی فرض نہیں ہوتا، اور زندگی میں کسی دوسرے سے حج کرانا یا مرتے وقت وصیت کرنا بھی اس پر واجب نہیں ہوتا۔

(النوع الاول) ای من انواع شرائط الحج (شرائط الوجوب) وھی التی اذا وجدت جمیعھا وجب الحج علی صاحبھا، واذافقدوا احد منھا لایجب اصلاً، لابالنیابة، ولابالوصایة. (مناسك ملاعلی قاری ص۲۱)

ان ہی شرائط وجوب میں سے چھٹی شرط استطاعت ہے۔ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ زادِراہ (توشہ) اور راحلہ (سواری) پر اس طرح قدرت ہو کہ وہ اس کا مالک ہو یا کرایہ پر لے کر قابض ہو، اور اگر مانگ کر یا اس کے مباح ہونے کی وجہ سے قادر ہوا ہو تو اس سے حج فرض نہیں ہوتا، خواہ وہ اس شخص نے مباح کیا ہو جس کا اس پر احسان شمار نہیں ہوتا جیسے ماں، باپ، اور اولاد، یا ان کے علاوہ کسی اور نے مباح کیا ہو، جیسے اجنبی لوگ۔

(السادس الاستطاعة) وھی شرط الوجوب لاشرط الجواز......

(وھی ملك الزاد) ای النفقة فی المأتی والمعاد (التمکن من الراحلة) ای الاقتدارعلی رکوب المرکوب حیث شاء. (مناسك ص۲۷)

(ولاتثبت الاستطاعة ببذل الغیر) ای باعطاء غیره له (مالاً) ای قدر

زاد و راحلة، (اوطاعة) ای خدمة لمن یحتاج الیهافی الطریق کالزمن، (ملکاً) ای من جهة التملیك فی المال والخادم، (أوباباحة) ای بالاعارة فی الخادم والراحلة اوبالاجارة فی استعمال الزادمن المال، فان ثقل المنة تدفع حصول الاستطاعة. (مناسك ص ۳۰)

ولایجب علیه القبول عندنا. (مناسك ص۳۱) قوله لایجب علیه القبول، لان شرائط اصل الوجوب لایجب علیه تحصیلهاعند عدمها، قاله فی البحرالرائق. اھ. حباب قال العلامة طاهر سنبل وکذا لاتثبت الاستطاعة ببذل غیره الزادوالراحلة حتی لایجب علیه الحج عندنا. (شرح لباب ص۳۱)

منها: ملك الزاد والراحلة فی حق النائی عن مکة، والکلام فیه فی موضعین. احدهمافی بیان انه من شرائط الوجوب، والثانی فی تفسیر الزاد والراحلة، اما الاول فقد قال عامة العلماء انه شرط، فلایجب الحج بباحة الزاد والراحلة، سواء کانت الاباحة ممن له منّة علی المباح له، اوکانت ممن لامنة له علیه کالاب. (بدائع ۱۲۲/۲)

اگر کسی نے اس کو مال دیا کہ اس سے حج کرلے تو اس پر اس کا قبول کرنا واجب نہیں، اس لیے کہ جب وجوب کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو اس کا حاصل کرنا اس پر واجب نہیں۔ (عمدۃ الفقہ ۳۳۳/۴)

''فتاوی محمودیہ'' سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: حکومتِ ہند موسمِ حج میں حاجیوں کی دیکھ بھال کے لیے ویلفیر آفیسر بنا کر کسی کو منتخب کر کے اس کے تمام مصارف برداشت کرتی ہے، اور اس کے لیے بقدر

ضرورت تمام رقم پیشگی دے دیتی ہے، وہ منتخب آفیسر اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ حج بیت اللہ بھی ادا کر لیتے ہیں، ان کا یہ حج کیسا ہوگا؟ اس کا وہ حج فرضیت حج میں شمار ہوگا یا نفل؟ کیا حکومت نے جب رقم دی اس وقت وہ صاحب نصاب شمار نہیں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جب کوئی شخص خود صاحب نصاب نہیں جس سے اس پر حج فرض ہو، یعنی زادراہ پر قادر نہیں؛ مگر وہ پیدل پہنچ جائے، یا کوئی شخص اس کو اپنے ساتھ لے جائے، یا کسی نے اس کو روپیہ دیدیا جس سے وہ وہاں پہنچ گیا اور حج ادا کر لیا تو اس کا حج ادا ہو جائے گا۔ پھر غنی ہو جانے پر اس کے ذمہ دوبارہ حج فرض نہیں ہوگا۔

''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: کہ کسی فرض کی ادائیگی کے لیے جو شرائط ہوں ان کی تحصیل مقصود نہیں بلکہ جب ان کا حصول ہو جائے خواہ کسی طریقہ سے ہو تو بھی کافی ہے، مثلاً نماز کے لیے طہارت شرط ہے، ایک شخص بلا اختیار نہر میں گر گیا پانی اس کے بدن پر پہنچ گیا اور بہہ گیا، پھر اس نے نماز پڑھی تو اس کی نماز ہو جائے گی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اپنے قصد سے وضو نہیں کیا اس لیے اس کی نماز نہیں ہوئی، اسی طرح یہاں بھی اس کا حج ہو جائے گا۔ (فتاوی محمودیہ ۱۷/۲۱۲)

ہمارے ملک ہندوستان میں سینٹرل کمیٹی (جو حکومت کا ایک ادارہ ہے) حج کے لیے جانے والوں کے لیے ضروری انتظامات کرتی ہے، اس کے واسطے سے حج کے لیے جانے والے ہر شخص کے کرایہ میں سبسڈی کے نام سے ایک مخصوص رقم ادا کرتی ہے، اور اس کی طرف سے ہوائی کمپنی کو جو مجموعی کرایہ ادا کیا جاتا ہے وہ تقریباً ۳۵ ہزار روپے ہوتا ہے، جب کہ حکومت کا یہ ادارہ حاجیوں سے کرایہ کے نام پر صرف ۱۲ ہزار روپے وصول کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بقیہ ۲۳ ہزار روپے کرایہ کے طور پر حاجی کی طرف سے حکومت ادا

کرتی ہے، اس صورت حال کے پیش نظر یہاں پر کئی مسائل کا حل اور وضاحت ضروری ہو جاتی ہے۔

(۱) اگر حج کا ارادہ رکھنے والے کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ حکومت کی مذکورہ مدد کے بغیر وہ زاد اور راحلہ پر قدرت نہیں رکھتا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وجوب حج کے شرائط میں سے چھٹی شرط استطاعت اس میں پائی نہیں جاتی؛ اس لیے اس پر شرعاً حج فرض نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے باوجود اگر وہ حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کر کے حج ادا کر لے گا، یعنی حکومت کی طرف سے دی جانے والی اس مدد کو قبول کر کے حج کر لے گا تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، بشرطیکہ اس نے احرام کے وقت حج فرض یا مطلق حج کی نیت کی ہو، نفل یا نذر کی نیت نہ ہو، اب اگر اس کے بعد اس کے پاس اتنا مال آ گیا کہ حکومت کی مدد کے بغیر بھی زاد و راحلہ پر استطاعت حاصل ہو گئی تب بھی دوبارہ حج کے لیے جانا ضروری نہیں، اس صورت میں اگر وہ حج کمیٹی کے واسطہ سے سفر کرنا پسند نہ کرے اور حج نہ کرے تب بھی گنہگار نہیں، اور نہ ہی اس پر بوقت وفات وصیت کرنا ضروری ہے۔

(۲) اگر کسی شخص کے پاس حوائج اصلیہ کو چھوڑ کر اتنی رقم موجود ہو کہ حکومت کی مذکورہ مدد کے بغیر بھی وہ زاد و راحلہ پر قدرت رکھتا ہے، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر وہ حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کی شکل اختیار کر کے حج ادا کرے گا، یعنی حکومت کی طرف سے دی جانے والی اس مدد کو قبول کر کے حج کر لے گا، تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا۔

صورتِ مذکورہ میں اگر وہ شخص حج کمیٹی کے واسطہ سے سفر نہ کرتے ہوئے اپنے طور پر سفر کا انتظام کرتا ہے تب بھی اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، اور اگر یہ سوچ کر کہ حج کمیٹی کی قرعہ اندازی میں نام نہیں نکلا حج کے لیے نہیں گیا تو گنہگار ہوگا، اور اگر موت تک

حج ادا کرنے کا موقع نہ ملا تو اس پر بوقت وفات اپنی طرف سے حج فرض ادا کرنے کی وصیت کر جانا ضروری ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ چاہے حکومت کی امداد کے بغیر اس کے لیے حج کرنا ممکن نہ ہو یا ہو، دونوں صورتوں میں اگر اس نے حج کمیٹی کے ذریعہ سفر والی شکل اختیار کر کے حج ادا کیا، تو بلا شک وشبہ اس کا حج درست ہو جائے گا، اور اگر یہ زندگی میں پہلی مرتبہ حج کر رہا ہے، اور بوقت احرام حج فرض یا مطلق حج کی نیت بھی کر رہا ہے تو اس کا فرض حج بھی ادا ہوا سمجھا جاوے گا؛ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے لیے حکومت کی اس امداد کو قبول کرنا مناسب ہے یا نہیں؟

فقہاء نے استطاعت والی شرط وجوب پر کلام کرتے ہوئے اس بات کی تصریح کی ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی کو بطور اباحت زاد وراحلہ دے رہا ہے، یعنی اس کو زاد وراحلہ کا مالک نہیں بنا رہا ہے بلکہ ایسی صورت اختیار کی جا رہی ہے جس میں وہ شخص مالک بنے بغیر زاد وراحلہ سے فائدہ اٹھا کر حج کر سکتا ہے تو اس صورت میں اس پر حج فرض نہیں، چاہے وہ شخص جو بطور اباحت زاد وراحلہ دے رہا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہو جس کا یہ سلوک احسان شمار نہیں ہوتا، مثلاً باپ بیٹے یا بیٹا باپ کے ساتھ یہ معاملہ کرے، اور چاہے وہ شخص ان لوگوں میں سے ہو جس کا یہ سلوک احسان شمار ہوتا ہے، مثلاً باپ، بیٹے کے علاوہ اور کوئی اجنبی شخص ایسا سلوک کر رہا ہو۔

اسی طرح فقہاء نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو زاد وراحلہ بطور تملیک دے رہا ہو، اس صورت میں اگر اس نے قبول کرلیا تو اس پر حج فرض ہو جائیگا؛ لیکن اس کے لیے اس کو قبول کرنا ضروری نہیں، چاہے دینے والا ان لوگوں میں سے ہو

جس کا دینا احسان شمار نہیں ہوتا، اور چاہے ان لوگوں میں سے ہو جس کا دینا احسان شمار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے ''مناسک ملا علی قاری'' میں ایک جملہ یہ لکھا ہوا ہے:

فان ثقل المنة تدفع حصول الاستطاعة. (ص: ۳۰)

اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے بطور تملیک دینے پر جس کا دینا احسان شمار ہوتا ہو قبول کرنا مناسب نہیں، چہ جائیکہ اس کا یہ دینا بطور اباحت ہو، اس لیے حکومت کی طرف سے دی جانے والی یہ امداد جب کہ حکومت غیر مسلمہ ہونے کے ساتھ اس کو اپنے احسان کے طور پر علانیہ بیان کرتی ہے، قبول کرنا غیرت ایمانی کا تقاضہ نہیں؛ البتہ حکومت کی یہ امداد واقعتاً کس درجہ میں احسان بنتی ہے یہ بھی قابل غور ہے، اس سلسلہ میں ایک جانکار کا مضمون جو اردو ٹائمز (بمبئی) کے حوالہ سے ندائے شاہی میں شائع ہوا تھا ضرور پڑھ لیں۔ [1] اور اس مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کریں کہ امداد کی اتنی بڑی

---

[1] حج سبسڈی کے عنوان سے مرکزی حکومت اور اس کے زیرِ اقتدار سرکاری ادارے سینٹرل حج کمیٹی کی جانب سے اوندھے سیدھے اقدامات کیے جا رہے ہیں جو مسلمانوں اور خاص طور پر عازمین کے لیے تشویش اور فکر کا باعث ہے، جہاں تک ہوائی جہاز کے کرائے میں سبسڈی کا سوال ہے، حکومت ہند نے بحری جہازوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ قدیم ذریعۂ سفر حج کو بند کرنے کے عوض ہرجانہ کے طور پر سبسڈی شروع کی تھی۔

اول تو یہ ہے کہ یہ سبسڈی نہیں، بحری جہاز کے ذریعے سفر حج ختم کرنے اور عازمین حج کو بذریعہ طیارہ سفر حج کرنے پر مجبور کرنے کے لیے حکومت ہند تب سے ہرجانہ ادا کر رہی ہے، جب سے ہوائی جہاز سے تمام ہندوستانی عازمین کی روانگی ہو رہی ہے۔

دوئم یہ کہ سبسڈی کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں اور عوام سے دھوکہ دہی کی جا رہی ہے کہ سبسڈی کی رقم اتنی ہرگز نہیں ہوسکتی کہ جتنی بتائی جا رہی ہے، آج پرائیویٹ ٹور آپریٹرس ۲۸/ ہزار روپیوں میں حجاج کرام کو جدہ، ہندوستان۔ جدہ پہنچا دیتے ہیں یہ ٹور آپریٹر ایک آدھ ٹکٹ کا چارج ۲۸/ ہزار روپئے کر رہے ہیں، جب کہ ایئر انڈیا جس نے ۲۷/ ہزار عازمین حج کے ایئر ٹکٹوں کو اپنی مونو پولی بنا دیا ہے، وہ حکومت ہند سے فی حاجی ۳۲/ ہزار تا ۳۶/ ہزار روپئے چارج کر رہی ہے۔ =

....

= یہ زیادتی ہے، دھوکہ بازی ہے، گھپلہ ہے، کیونکہ ۲۷/ ہزار مسافروں کے ہند، جدہ، ہند واپسی کے ایئر ٹکٹوں کا اگر بین الاقوامی ٹینڈر منگوایا جائے تو اس کرایہ کی رقم پرائیویٹ آپریٹروں کے کرائے (۲۸/ ہزار) سے بھی بہت کم ہو جائے گی، حکومت ہند کا ادارہ (ایئر انڈیا) حجاج کرام کو مارکیٹ سے کہیں زیادہ چارج کر کے کروڑوں روپے ہر سال منافع کما رہا ہے، اور حکومت ہند سبسڈی کا احسان کا خواہ مخواہ بوجھ ہندوستانی حجاج کرام اور ہندوستانی مسلمانوں پر لا د رہی ہے، گھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں، کھچڑی کون کھا رہا ہے؟ مرکزی حکومت کے عہدیداران وافسران۔ روپیہ جا رہا ہے حجاج کرام کا، احسان جتایا جا رہا ہے ہندوستانی مسلمانوں پر، اب اس ریاکاری کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ضروری ہے، اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو صاف موقف اپنا لینا چاہیے کہ حکومت ہند حج سبسڈی (جو کہ اصلاً تو سبسڈی نہیں ہے اگر سبسڈی مان لی جائے تو بحری جہاز بند کرنے کا جرمانہ ہے) ختم کرنا چاہتی ہے، تو پھر تمام ۲۷/ ہزار حجاج کرام کو سبسڈی دینا بند کر دے؛ لیکن اس کے عوض مندرجۂ ذیل اقدامات کرنے کے لیے بھی حکومتِ ہند آمادہ ہو جائے۔

(۱): عازمین حج کے لیے بحری جہازوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے، یا پھر پرائیویٹ شپنگ کمپنیوں کو حجاج کرام کے لیے سروس شروع کرنے کی اجازت دی جائے، اگر حکومت ہند کراچی سے ممبئی لانچ سروس دوبارہ شروع کرنے پر غور کر سکتی ہے تو پھر ہندوستانی حجاج کرام کے لیے بحری جہاز دوبارہ کیوں شروع نہیں کیے جا سکتے؟ یہاں یہ واضح ہو کہ سعودی حکومت نے بھی بحری جہازوں پر پابندی عائد نہیں کی ہے، اور جدہ کی بندرگاہ پر آج بھی عازمین حج کو لے کر بحری جہازوں کے اترنے کی اجازت ہے۔

(۲): ہوائی سفر سے جدہ جانے والے عازمین کے لیے ایئر انڈیا نے جو مونوپولی کر رکھی ہے اسے ختم کیا جائے، جس طرح زرمبادلہ کا ٹھیکہ ہر سال کھلے عام نیلامی یا ٹینڈر کے ذریعہ دیا جاتا ہے، اور عازمین حج کو دیے جانے والے زرمبادلہ میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی مونوپولی یا اجارہ داری ختم کر دی گئی ہے، اسی طرح ہوائی سفر میں ایئر انڈیا کی مونوپولی ختم کی جائے۔

(۳): دورانِ حج مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ۲۷/ ہزار رہائشی یونٹوں اور عمارتوں کو کرائے پر لینے کے کام میں ہندوستانی وزارت خارجہ (حج سیل) اور ہندوستانی سفارت خانہ (جدہ) کے افسران نے بھی اجارہ داری (مونوپولی) قائم کر رکھی ہے، اور یہ معاملہ شفاف نہیں ہے۔ رہائشی عمارتوں کو کرائے پر لینے کی اجارہ داری بھی ختم کی جائے، اور اسے شفاف =

مقدار جو بتلائی جارہی ہے واقعۃً قابل تسلیم ہے؟ نیز حکومت نے ہندوستان سے حج کے لیے جانے والے حضرات کو ہوائی سفر کا پابند بنایا، کیا اس کا یہ اقدام ان کے حقوق شہریت کے منافی تو نہیں؟ نیز اگر حاجیوں کے سفر پر سے ایئر انڈیا کا اجارہ اٹھا دیا جائے؛ نیز بحری جہازوں کی بھی اجازت دے دی جائے تب بھی کیا حکومت کے اس بار احسان کو اٹھانے کی ضرورت رہے گی، آپ حضرات اپنے صوبہ کے ذمہ داروں میں سے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس احسان کو قبول نہ کرنے کے عنوان سے آپ کے ذریعہ حجاج کرام کو ملنے والی سہولت تو ختم ہو جائے؛ لیکن ان کا جو استحصال حکومت کی طرف سے ہو رہا ہے اس کا کوئی مداوا نہ ہو۔

آپ نے جو تحریر فرمایا ہے: ''ملت کا ایک طبقہ کہتا ہے: حج کے لیے مسلمان کو شرائط کی روشنی میں خود کفیل ہونا چاہیے، تکلفات، احسانات اور بالخصوص حکومت کے زیرِ احسان حج کرے، یہ امر روح اسلام کے خلاف ہے'' جو طبقہ یہ کہتا ہے اس کو چاہیے کہ خود کفیل ہونے کے اسباب اختیار کرے، اس میں کامیابی ہونے کے بعد حکومت کے

= بنایا جائے، بس یہ تین اقدامات ہی کر دیے جائیں، تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کو ایک کوڑی سبسڈی یا نام نہاد سبسڈی کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۴): ممبئی سمیت ملک کے جتنے شہروں پر سنٹرل حج کمیٹی اور ریاستی حج کمیٹیوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اسے فوراً ختم کیا جائے اور ان حج ہاؤسز کو ایک مسلم ٹرسٹ تشکیل دے کر اس کے سپرد کیا جائے، سینٹرل حج کمیٹی اور دیگر تمام صوبوں کی ریاستی حج کمیٹیاں جو اپنے دفاتر ان حج ہاؤسز میں قائم رکھے ہوئے ہیں اپنے دفاتر کا کرایہ ہندوستانی حجاج ٹرسٹ کو ادا کریں۔

(۵): ہندوستانی حجاج ٹرسٹ کے حوالے حج سیزن کے ذریعہ زرمبادلہ فلکسڈ ڈپازٹ عطیات حج ہاؤسز کے کرائے ہونے والی مکمل آمدنی کی جائے اور اس آمدنی سے حاجیوں کو کرائے میں سبسڈی دی جائے۔ سبسڈی کی ہندوستانی مسلمان از خود سرمایہ کاری (Self Financing) کر سکتے ہیں، حکومت سے مسلمانوں کو سبسڈی کی بھیک مانگنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ (ماہنامہ ندائے شاہی جنوری ۲۰۰۸ء از قلم سعید احمد اردو ٹائمز کے خصوصی نامہ نگار)

سبسڈی والے احسان کو قبول نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روح اسلام والے حج کے حصول میں حجاج کرام کی ایک معتد بہ تعداد نفس حج سے محروم ہو جائے۔

دیگر یہ کہ آپ نے سبسڈی کے نام سے دی جانے والی رقم کے متعلق شبہ ظاہر فرمایا، کہ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ وہ رقم کہیں مشکوک تو نہیں؟ حکومت Subsidy آخر کس مد سے دیتی ہے؟ اس سے زیادہ تحقیق طلب بلکہ ذمہ داران حج کمیٹی کا فرض منصبی ہے کہ وہ حکومت کے اس دعویٰ کہ وہ ہر ایئر لائنس کو فی کس 770 ڈالر تقریباً 35000 روپے ادا کرتی ہے، کی صحت و صداقت کو ایئر کمپنیوں کے کرایوں کی شرح اور چارٹر جہازوں میں ملنے والی خصوصی رعایت وغیرہ اصولوں کے مطابق جانچیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۷/ جمادی الاول ۱۴۲۷ھ۔ مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

مدینہ منوّرہ سے مکہ مکرمہ بغیر احرام جانے سے دم لازم ہوگا؟ یا کوئی اور صورت ہے؟

سوال: (۵) مکہ مکرمہ کے اندر مدرسہ صولتیہ میں ہم نے ایک مولانا سے معلوم کیا کہ مدینہ شریف سے مکہ بغیر احرام باندھے ہوئے آئے تو کیا اس کے متعلق دم دینا پڑے گا؟ تو جواباً انہوں نے کہا کہ ہاں دم دینا ہوگا؛ مگر پھر ہم نے کہا کہ دم کے بغیر اور کوئی راستہ ہے؟ جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر آپ دوسری مرتبہ ہندوستان سے مدینہ منورہ آویں تو اس طرح نیت کریں کہ گذشتہ وقت میں ہم مکہ شریف بغیر احرام کے چلے گئے تھے تو وہ احرام بھی شامل کرتے ہوئے حالیہ احرام کرنے کی نیت کرتا ہوں، تو معلوم کرنا یہ ہے کہ اس طرح نیت کرنے سے گذشتہ چھوٹے ہوئے احرام کی ادائیگی

درست ہوجائے گی؟ برابر اسی طرح اگر جدہ سے مکہ مکرمہ بغیر احرام باندھے داخل ہوگئے اور اس کی قضاء بھی مذکورہ بالا صورت کے مطابق دوسری مرتبہ جانے پر ترک شدہ احرام کی بھی نیت کرلینے سے احرام باندھنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تحریر کردہ حیلہ صحیح ہے؛ مگر اتنا یاد رہے کہ بغیر احرام باندھے داخل ہونے کے بعد اس سال اس نے حج یا عمرہ نہ کیا ہو تو یہی مسئلہ ہے کہ آئندہ جب میقات سے احرام باندھ کر جائے گا تو دم ساقط ہوجائے گا اور اگر بغیر احرام باندھے داخل ہوگیا اور حج یا عمرہ کرلیا تو دم ساقط نہ ہوگا۔ (زبدہ ۲/۱۲۳)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

عورت کا بلا محرم اپنی سہلیوں کے ساتھ حج میں جانا

سوال: ہماری والدہ محترمہ بیت اللہ شریف کی زیارت (حج یا عمرہ میں جانے) کی تمنا کررہی ہیں؛ مگر کم نصیبی کہ مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے بلا محرم اپنی سہیلیوں کے ساتھ حج یا عمرہ کرلیا جائے تو کیا اجر وثواب کی مستحق ہوں گی؟ حالانکہ میں محرم ہونے کی وجہ سے اماں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؛ مگر مالی حالت اس قدر کمزور ہے کہ میں ساتھ جانے سے قاصر ہوں، تو کیا والدہ محترمہ بلا محرم سہیلیوں کے ساتھ حج یا عمرہ میں جاسکتی ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عورت کو دوسری عورتوں کے ساتھ بلا محرم (حج یا عمرہ کے لیے) جانا جائز نہیں۔ (معلم الحجاج۔۸٦) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

جس عورت کا شوہر یا محرم نہ ہو وہ حج کس طرح کرے؟

سوال: وہ عورت جس کا شوہر یا کوئی بھی محرم نہ ہو اور وہ حج کرنا چاہتی ہو تو اس

کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس عورت کا کوئی محرم یا شوہر نہیں ہے اور وہ حج کرنا چاہتی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی نیک صالح مرد سے نکاح کر کے اس کے ساتھ جائے، چناں چہ ایک روایت کے بموجب فرض حج کے لیے نکاح کو واجب لکھا ہے اگر چہ وہ قول مختار نہیں۔ (شامی ۲/ ۱۵۸)

(زبدۃ المناسک ۱/ ۲۲)

ایسی عورت جس پر حج فرض ہو چکا تھا؛ لیکن محرم یا شوہر نہ ہونے کی وجہ سے جا نہ سکی، اس کے لیے موت کے وقت وصیت کر جانا ضروری ہے کہ اس کی طرف سے حج بدل کرا دیا جائے۔ (شامی ۲/ ۱۵۷) البتہ اگر وہ اتنی بوڑھی ہوگئی کہ بوڑھاپے کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں رہی یا اپاہج بن گئی یا اندھی ہوگئی تو زندگی ہی میں کسی کو حج بدل کے لیے بھیج سکتی ہے، اگر اس سے قبل کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دیا اور محرم و شوہر نہ ہونے والا اس کا یہ عذر وفات تک رہا تو درست ہے ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/ ۲۵۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیوہ عورت اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حج میں جا سکتی ہے؟

سوال: ایک بیوہ عورت حج کرنا چاہتی ہے جس کا کوئی محرم نہیں ہے اس کے رشتہ داروں میں سے تین جوڑے یعنی تین مرد اور تین عورتیں حج کو جا رہی ہیں، اس بیوہ عورت کا مردوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے؛ البتہ عورتوں میں سے کوئی اس کی چچازاد بہن ہے وغیرہ وغیرہ تو کیا یہ بیوہ عورت ان کے ساتھ حج کا سفر کر سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عورت کی جائے سکونت سے حرم کا فاصلہ اگر مسافتِ سفر یعنی اڑتالیس میل اور

اس سے زیادہ کا ہے تو اس صورت میں ایسی عورت کسی محرم یا شوہر کے بغیر حج کے لیے نہیں جاسکتی۔(در مختار علی ھا مش الشامی ۲/۱۵۷)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مزدلفہ میں صبح صادق کے بعد مغرب وعشاء بہ نیت ادا پڑھی تو کیا حکم ہے؟

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں:

(۱) کوئی حاجی مزدلفہ میں دیر سے پہنچا یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی اس نے مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی نیت سے پڑھی حالانکہ قضاء کی نیت کرنی چاہیے تھی، تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی یا دہرانی پڑے گی؟

مزدلفہ میں دیر سے پہنچنے پر مغرب وعشاء پڑھنے سے دم نہیں

(۲) مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھنا واجب ہے وہ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے صبح صادق سے پہلے مزدلفہ میں یہ نمازیں نہ پڑھ سکا تو کیا اس پر دم آئے گا یا نہیں؟

طواف زیارت کی تکمیل نفلی طواف سے

(۳) کسی حاجی نے طوافِ زیارت کے دو تین شوط چھوڑ دیے اور ایام نحر کے بعد اس نے نفل طواف کیا تو کیا اس نفل طواف کے شوط طواف زیارت میں شامل کر لیے جائیں گے؟ اور کیا اس طرح طوافِ زیارت مکمل ہو جائے گا اور تاخیر کی وجہ سے اس حاجی پر صدقہ وغیرہ آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) دل میں اگر اس بات کا تعین کیا ہو کہ میں نے گذشتہ شب کی مغرب اور عشاء پڑھی تو چاہے نیت اداء کی کی ہو پھر بھی یہ نماز درست ہو جائیگی دہرانے کی ضرورت نہیں،

اور اگر ایسا نہیں تو دہرانا ضروری ہے۔ (ماخوذ از عمدۃ الفقہ ۲/ ۷۷)

(۲) اس صورت میں دم واجب نہیں ۔ (ماخوذ از بدۃ المناسک ۲/ ۵۰)

(۳) جی ہاں، اس طرح طواف زیارت کی تکمیل ہو جائے گی اور دم ساقط ہو جائے گا؛ البتہ ہر شوط کے بدلہ میں ایک کامل صدقہ نکالنا ضروری ہے۔ (زبدۃ المناسک ۲/ ۷۸، عمدۃ الفقہ کتاب الحج ۴/ ۵۳۱)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم. املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۰/ صفر ۱۴۲۵ھ

منیٰ کے مکہ مکرمہ میں شامل ہونے پر دو مسئلوں کا حل

حج کے ارکان ومناسک کے بارے میں بعض نئے فتاویٰ

سفر حج کے بارے میں نئے دور میں کچھ نئے مسائل سامنے آئے ہیں، جن کے متعلق برصغیر کے معتبر علماء ومفتیان نے غور وفکر کر کے احکامات متعین کیے ہیں، ان کا جاننا حنفی حجاج کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ پرانی لکھی ہوئی مناسک حج کی کتابوں اور رسائل سے مغالطہ نہ پیش آئے، اس طرح کے مسائل کو نمبر وار تحریر کیا جا رہا ہے۔

منیٰ کا مکہ معظّمہ میں شامل ہونا

پرانی سب کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ مکہ معظّمہ اور منیٰ دونوں الگ الگ جگہیں ہیں؛ لیکن اس وقت مکہ مکرمہ کی آبادی منیٰ سے بالکل متصل ہو چکی ہے اور ان دونوں جگہوں کی میونسپلٹی بھی ایک ہے۔ مکہ معظّمہ کا بڑا اسپتال بھی خاص منیٰ کے حدود میں قائم ہے۔ جو سال بھر کھلا رہتا ہے۔ نیز رابطہ عالم اسلامی کا دفتر بھی منیٰ میں واقع ہے؛ اس لیے اب منیٰ پر بھی مکہ مکرمہ کے احکامات جاری کیے جائیں گے اور اس کو مکہ معظّمہ میں شامل کرنے کے حکم سے حجاج کرام کے درج ذیل مسائل وابستہ ہوں گے:

نمبر۱: جو شخص ذی الحجہ کی نو تاریخ سے پہلے پہلے تک پندرہ دن مکہ مکرمہ میں مقیم ہو تو اس کو نماز پوری پڑھنی ہوگی، پہلے اس سلسلہ میں آٹھویں تاریخ کا اعتبار تھا، اب نویں تاریخ کا اعتبار رہوگا، کیونکہ اسی دن منیٰ سے عرفات جانا ہوتا ہے۔

نمبر۲: جو شخص پہلے سے مقیم نہ ہو اور اسے دس ذی الحجہ سے آگے پندرہ روز یا اس سے زیادہ تک مکہ مکرمہ میں رہنا ہے تو وہ منیٰ ہی میں دس تاریخ کو ظہر کے وقت سے مقیم شمار ہوگا، اور اسے نمازیں پوری ادا کرنی ہونگی۔

نمبر۳: جب ایسا حاجی جو پہلے سے مقیم ہو یا آئندہ پندرہ دن رہنے کے ارادے سے مقیم ہو گیا ہو، تو دس ذی الحجہ کو اقامت کی حالت میں رہنے کی وجہ سے اس کے ذمہ مالی قربانی (جو صاحب نصاب اور مقیم ہونے سے واجب ہوتی ہے یہ حج کے دم شکر کے علاوہ ہے) بھی واجب ہو جائے گی (اگر چہ اس مالی قربانی کو حدود حرم ہی میں ذبح کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اپنے وطن میں بھی ذبح کرایا جا سکتا ہے اور اگر ایسے مقیم نے ایام نحر میں مالی قربانی نہ کی تو بعد میں قربانی کی قیمت کا صدقہ واجب ہے) مذکورہ تین مسائل کے سلسلے میں موسم حج ۱۴۲۰ھ ہندو پاک کے اکابر مفتیان نے درج ذیل فتویٰ کی تصدیق کی جس کا متن یہ ہے:

اقامت وقصر حاجی، منیٰ کی تحدید وآبادی، مسافر کی قربانی

استفتاء

(۱) کیا منیٰ مکہ مکرمہ میں داخل ہے یا خارج؟

(۲) کیا منیٰ میں حاجی کو قصر کرنا ہے یا پوری نماز ہوگی؟

(۳) حاجی پر مالی قربانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب مبسملا و محمدلاً و مصلیاً و مسلما: (۱،۲) عام کتب فقہ میں یہ تحریر ہے کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ میں پہنچا اور ۸/ ذی الحجہ تک اس کے پندرہ روز نہیں بنتے تو اس کو قصر نماز ادا کرنی ہوگی، کیونکہ ۸/ تاریخ کو اس کو ہر حال میں مکہ مکرمہ چھوڑنا ہے؛ لہٰذا اس کا پندرہ روز قیام کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب منٰی مکہ مکرمہ سے علاحدہ تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی آبادی منٰی سے بھی متجاوز ہوچکی ہے، اور منیٰ مکہ مکرمہ کا ایک محلّہ ہے، جیسا کہ مقامی حضرات سے تحقیق کرنے سے اور مشاہدہ سے معلوم ہوا اور دونوں کی بلدیہ بھی ایک ہے۔ لہذا اب ۸/ تاریخ نہیں بلکہ ۹/ کا اعتبار ہوگا۔ نیز اگر حج سے قبل مسافر ہے اور حج کے بعد یعنی ۹/ ذی الحجہ کے بعد اس کو پندرہ روز مکہ مکرمہ رہنا ہے تو ۱۰/ ذی الحجہ کو ظہر کی نماز سے مقیم ہوگا اور نمازیں پوری ادا کرنا ہوں گی۔ اور جو پہلے سے مقیم ہے وہ تو ہر حال میں منیٰ، عرفات، مزدلفہ میں نماز پوری ادا کرے گا کیونکہ عندالاحناف قصر سفر کی وجہ سے ہے نہ کہ حج کی وجہ سے۔

(۳) جب حاجی ۱۰/ ذی الحجہ کو مقیم ہوگیا تو دیگر شرائط پوری ہونے پر اس کے ذمہ مالی قربانی بھی واجب ہوگی، اور پہلے اگر مال نہیں تھا ایام نحر میں مال آگیا اور بقدر نصاب ہے تو قربانی واجب ہوتی ہے۔ اس پر حولان حول شرط نہیں ہے، اور اگر آخری دن مال آگیا، پہلے مسافر تھا آخری دن مقیم ہوگیا اور قربانی نہیں کی، تو بعد گذرنے ایام نحر کے اس پر قربانی کی قیمت کا تصدق واجب ہے، اور درمیانی درجہ کے بکرے کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔
فقط واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ شیر محمد علوی، دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور

تصدیق مفتیان کرام وارد ین مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ موسم حج ٣/ ذی الحجہ ١٤٢٠ھ مطابق ٢٠٠٠ء نزیل مکہ معظّمہ

(١) محمد فاروق غفرلہ، جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ، نزیل مکہ مکرمہ

(٢) مشرف علی تھانوی، دارالعلوم الاسلامیہ کامران بلاک اقبال ٹاون لاہور، نزیل مکہ مکرمہ

(٣) العبد احمد خانپوری، مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات انڈیا، ١٤٢٠/١٢/٢٢ھ

(٤) مبین احمد غفرلہ، خادم جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ ١٩/ ذی الحجہ ١٤٢٠ھ نزیل مکہ مکرمہ

(٥) شبیر احمد عفی اللہ عنہ، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد، یوپی، انڈیا، نزیل مکہ مکرمہ ١٤٢٠/١٢/٢٠ھ

(٦) احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ، مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد، نزیل مکہ المکرّمۃ ١٤٢٠/١٢/٢١ھ

(٧) رئیس الدین غفرلہ، مدرس جامعہ مظاہر علوم وقف سہارنپور، یوپی، انڈیا۔

(٨) رشید احمد غفرلہ، خادم دارالافتاء دارالعلوم عبدیہ ہتھین ضلع: فرید آباد، انڈیا۔

منیٰ میں نماز جمعہ کا قیام

نمبر (٤) منیٰ کے مکہ معظّمہ میں شامل ہونے سے چوتھا مسئلہ یہ متعلق ہے کہ اگر منیٰ کے ایام (١٠، ١١، ١٢، ١٣/ ذی الحجہ) میں جمعہ کا دن پڑ جائے تو وہاں جمعہ قائم کرنا ضروری ہوگا اگر مسجد میں نماز جمعہ قائم نہ ہو تو خیموں میں الگ الگ جماعتوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی؛ اس لیے کہ یہ بھی مکمل شہر کے درجہ میں ہو چکا ہے۔ حجاج کرام اس کا خاص خیال رکھیں۔

قربانی کی مشکلات

نمبر (٥) حج ١٤١٩ھ تک عام لوگوں کو قربانی میں کوئی زیادہ پریشانی پیش نہ آتی

تھی؛ اس لیے کہ منیٰ کے اخیر میں مزدلفہ کے بالکل ابتدائی حصہ میں ایک بہت بڑی قربان گاہ قائم تھی جس میں لوگ جاتے اور وہیں جانور خرید کر اسی احاطے میں ذبح کر کے آجاتے تھے، اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے یا کرانے میں کوئی مشکل نہ تھی۔

لیکن موسم حج ۱۴۲۰ھ سے حکومت نے مزدلفہ کی اس قربان گاہ کو بالکل ختم کر دیا، اور اس جگہ پر حجاج کے خیمے لگا دیے گئے اور منیٰ سے بالکل الگ کئی کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑوں سے راستے نکال کر "المعیصیم" کے نام سے بڑے اور چھوٹے جانوروں کی الگ الگ جدید سہولیات سے آراستہ قربان گاہیں تعمیر کی ہیں، جن میں ذبح، صفائی ستھرائی اور پھر جانور کو کولڈ اسٹور میں رکھ کر فوری طور پر گوشت غریب ممالک میں بھیجنے کا انتظام ہے۔ بلا شبہ یہ ایک عظیم منصوبہ ہے؛ لیکن حنفی حجاج کو اس میں یہ مشکل پیش آئی کہ اب ان جدید قربان گاہوں میں کوئی آدمی اپنی مرضی سے خرید وفروخت کر کے خود آسانی سے ذبح نہیں کر سکتا، زیادہ تر قربان گاہوں میں وکالت کا انتظام ہے، اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ جانور کس وقت ذبح ہوگا، اور جن چند قربان گاہوں میں اپنے ہاتھ سے ذبح کی اجازت ہے ان میں بھی پہلے لائن لگا کر ٹوکن خریدنا پڑتا ہے پھر اجازت ملنے پر اندر جاتے ہیں اس میں بھی کافی تاخیر اور دقت پیش آتی ہے، جو ایک ناواقف آدمی اور بالخصوص خواتین اور ضعفاء، کے لیے تو انتہائی مشکل ہے۔ اس نئی صورت حال میں حنفی حجاج کے لیے رمی، قربانی اور حلق کے درمیان ترتیب قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے، حکومت سعودیہ کا پورا زور اس پر ہے کہ لوگ قربانی خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے بجائے بینکوں سے قربانی کے ٹوکن خرید لیں اور مطمئن ہو جائیں، اسی طرح کی مشکلات کے مداوا کے لیے "ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ العلماء ہند" کے چھٹے فقہی اجتماع منعقدہ ۱۶ تا ۱۸ ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ میں حنفی حجاج کو سہولت

دیتے ہوئے یہ تجویز منظور کی گئی:

''متمتع اور قارن کے لیے رمی، ذبح اور حلق کے درمیان امام اعظم رحمۃ اللہ کے قول پر جو مفتی بہ ہے ترتیب لازم ہے، اس کے ترک سے دم واجب ہو جاتا ہے۔ جب کہ صاحبین کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے اس کے ترک پر دم لازم نہیں ہے۔ آج کل حجاج ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر اگر ترتیب قائم نہ رکھ سکیں تو صاحبینؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے''۔

اس تجویز کا مقصود یہ ہے کہ اولاً تو پوری کوشش یہ کی جائے کہ ترتیب قائم رہے، خواہ اس کے لیے کچھ دقت ہی اٹھانی پڑے؛ لیکن اگر کوشش کے باوجود ترتیب باقی رہنے کی کوئی شکل نہ رہے تو صاحبینؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے دم واجب نہ ہوگا۔

حج بدل میں تمتع

(۶) جو شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کرے اصل حکم اس کے لیے یہی ہے کہ اس کا حج میقاتی ہونا چاہیے۔ یعنی میقات ہی سے آمر کی طرف سے احرام باندھے، پہلے زمانے میں اس کی بہتر شکل یہ تھی کہ لوگ حج سے پہلے مدینہ منورہ کے ارادے سے سفر کرتے اور حج کے قریب ذوالحلیفہ سے احرام باندھ کر آمر کی طرف سے حج کر لیا کرتے تھے؛ لیکن اس دور میں حاجیوں کے لیے براہ راست مدینہ جانا کارے دارد ہے اور بہت مشکل سے سیدھے مدینہ جانے کی اجازت ملتی ہے؛ نیز حج کمیٹی یا گروپ سے جانے والے اپنی مرضی کے مالک بھی نہیں ہوتے بلکہ مقررہ نظام کی پابندی ان کے لیے ناگزیر ہوتی ہے ایسی صورت میں اگر حج بدل کے لیے حج میقاتی کو ضروری قرار دیا جائے تو احرام کی مدت طویل ہونے کی وجہ سے نہ صرف مشکل پیش آتی ہے بلکہ بے احتیاطی کا بھی خطرہ

رہتا ہے؛ اس لیے ادارۃ المباحث الفقہیہ کے مذکورہ اجتماع میں حج بدل کرنے والوں کو آمر کی اجازت سے حج تمتع کرنے کے جواز کا بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔

تجویز کا متن حسب ذیل ہے:

''حج بدل کا اصل حکم تو یہی ہے کہ مامور حج افراد کرے؛ لیکن اگر آمر یا وصی تمتع کی اجازت دے دے تو تمتع بھی درست ہے، البتہ دم تمتع مامور اپنے مال سے ادا کرے الا یہ کہ آمر دم تمتع ادا کرنے کی بھی اجازت دیدے، خواہ یہ اجازت صراحۃً ہو یا دلالۃً، لہٰذا اس فیصلے سے معلوم ہو گیا کہ اگر حج پر بھیجنے والا شخص جانے والے کو تمتع کی اجازت دیدے تو تمتع کرنے سے بھی حج بدل ادا ہو جائے گا، اور اس وقت عام حجاج کو حج تمتع کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے؛ اس لیے کہ یہی آسان اور احوط ہے''۔

حالت حیض میں طواف زیارت

(۷) ایک اور مسئلہ خاص طور پر خواتین سے متعلق ہے، وہ یہ کہ اگر ایام نحر میں کسی عورت کو ناپاکی کی بنا پر طواف زیارت کا موقع نہ مل سکے اور بعد میں اس کے اتنے روز ٹھہرنے کا بھی نظم نہ ہو کہ وہ پاک ہونے کے بعد طواف زیارت کر کے وطن لوٹ سکے اور ایسی ناگزیر شکل سامنے آجائے کہ پاکی کے ساتھ اس سفر میں طواف کا موقع ہی نہ رہے۔ تو اس میں جو شرعی گنجائش فقہاء نے دی ہے اس بارے میں بھی مذکورہ فقہی اجتماع نے مندرجہ ذیل تجویز بکمال احتیاط منظور کی:

''اگر طواف زیارت سے قبل کسی عورت کو حیض آجائے تو اس پر ایسی تدبیر اختیار کرنا ضروری ہے جس سے وہ پاک ہونے کے بعد طواف زیارت کر کے ہی مکہ مکرمہ سے واپس ہو سکے، جیسے ٹکٹ اور ویزے کی تاریخ بڑھانا۔ یا حج کمیٹی سے روانگی

کو موخر کرانا وغیرہ، اور اگر کوئی ایسی صورت ممکن نہ ہو سکے اور دوبارہ وطن سے واپسی بھی مشکل ہو اور وہ حالت حیض ہی میں طواف زیارت کر لے تو اگر چہ وہ گنہگار ہوگی؛ لیکن اس کا یہ طواف زیارت شرعاً معتبر ہو جائے گا، اور وہ پوری طرح حلال ہو جائے گی؛ مگر اس پر ایک بدنہ یعنی بڑے جانور کی قربانی جنایت میں لازم ہوگی، اور اگر قربانی نہیں کی جا سکی اور وہ کسی بھی موقع پر طواف زیارت کا اعادہ کر لے تو بدنہ کا وجوب اس سے ساقط ہو جائیگا''۔

ایام منیٰ میں مزدلفہ میں قیام

منیٰ کی حدود شرعاً متعین ہیں، جہاں حکومت سعودیہ نے بڑے بڑے نیلے بورڈ لگا رکھے ہیں؛ لیکن موسم حج ۱۴۲۰ھ سے حکومت نے خیموں کی پلاننگ زیادہ محفوظ طریقہ پر کرنے کے لیے خیموں کا سلسلہ منیٰ کے اندر تک محدود نہ رکھ کر مزدلفہ کے کافی حصہ تک وسیع کر دیا ہے۔ مزدلفہ میں بنے ہوئے ان خیموں میں ہزار ہا ہزار حاجیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے، اب اس صورت حال میں منیٰ میں رات گذارنے کی جو خاص سنت ہے وہ متروک ہو رہی ہے: اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرنے والے حجاج اگر بسہولت منیٰ کے حدود میں انتظام کر سکیں تو فبہا ورنہ اگر مزدلفہ میں ہی رہنا پڑے، جیسا کہ عام حجاج کا حال ہے تو اس کی وجہ سے ان پر کوئی دم وغیرہ لازم نہیں ہے اور حکومتی نظام کی مجبوری کی وجہ سے انشاء اللہ وہ ترک سنت کے گنہگار بھی نہ ہوں گے، اور یہاں ٹھہرنے والے حضرات اگر عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ کے حدود میں اپنے بنے ہوئے خیموں میں آکر رات گزاریں تو ان کا وقوف مزدلفہ کا عمل متحقق ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

از ڈیوز بری مرغوب احمد لاجپوری

محترم المقام حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

بحمد اللہ خیریت سے ہوں اور حضرت کی خیر وعافیت کا طالب ہوں۔

غرض تحریر ایں کہ ماہنامہ ''ندائے شاہی'' نے حج نمبر میں حج کے متعلق بعض نئے فتاوی شائع کیے ہیں جن کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے، حضرت کے نزدیک یہ جوابات صحیح ہوں تو تصدیق فرمادیں، بصورت دیگر آپ کے نزدیک جو جوابات صحیح ہوں وہ تحریر فرمادیں۔

اگر مرسلہ فتاویٰ صحیح ہیں اور منی مکہ مکرمہ میں شامل ہے، تو دو مسئلہ کی مزید تحقیق مطلوب ہے۔

(۱) تیرہویں کی صبح صادق منی میں ہوجائے تو تیرہویں کی رمی واجب ہے، اب جب کہ منی مکہ مکرمہ میں شامل ہے تو تیرہویں کی رمی کا مسئلہ کیا ہوگا، اگر تیرہویں کی صبح صادق منی میں ہوجائے تو منی اور مکہ مکرمہ ایک شہر ہونے کی وجہ سے رمی کا وجوب رہے گا؟

(۲) منی میں قیام سنت ہے اب منی اور مکہ مکرمہ ایک ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بجائے منی جانے کے مکہ مکرمہ ہی میں قیام کر کے وہیں سے عرفات ومزدلفہ ہو آئے تو تارک سنت کہلائے گا یا نہیں؟ فقط۔　　طالب دعا: مرغوب احمد لاجپوری

۲/ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۴/ جون ۲۰۰۱ء

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آپ نے ماہنامہ (ندائے شاہی کے حج وزیارت نمبر جنوری، فروری ۲۰۰۱ء)

کے صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۶ کی زیروکس ارسال فرمائی ہے۔ جس میں مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب زید مجدہم کا ایک مضمون حج کے ارکان ومناسک کے بارے میں بعض نئے فتاوی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں مذکور تمام ہی مسائل سے اتفاق کرتے ہوئے ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

منیٰ کے باعتبار آبادی مکہ مکرمہ میں شامل ہونے کے فیصلہ اور فتویٰ کی وجہ سے جن مسائل پر اثر پڑتا ہے ان کی تفصیلی وضاحت اسی مضمون میں کردی گئی ہے۔ اس فیصلہ کی نسبت سے آپ نے جو سوال قائم فرمائے ہیں اس کی ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو مخصوص اوقات میں مخصوص افعال کے ذریعہ مخصوص جگہوں میں ادا کی جاتی ہے؛ چنانچہ اس کی صحت ادا کے شرائط میں مکان اور زمان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

''عالمگیری'' میں ہے: اما شرائط صحة ادائه فثلاثة: الاحرام، و المكان، و الزمان. (۲۱۹/۱)

''غنية الناسك'' میں ہے: واما شرائط صحة الاداء فتسعة: الاسلام، والاحرام، و الزمان، والمكان، والتمييز، والعقل. (ص۱۳)

آگے مکان والی شرط کی وضاحت وتفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والمكان المسجد للطواف و لو سطحه، و المسعى للسعى، و عرفات للوقوف، و مزدلفة للجمع، و المبيت والوقوف و منى للرمى، والحرم للذبح، فلا يصح شىء من افعاله فى غيرما اختص به من المكان. (ص۱٤)

چناں چہ حج کے تمام اعمال ومناسک (چاہے وہ رکن اور واجب ہوں یا سنت ہوں) میں سے جس کے لیے جو جگہ مخصوص کی گئی ہے اس کے علاوہ میں انجام دینے سے

ادا نہیں ہوں گے۔

''مناسک ملا علی قاری'' میں ہے: فلا یصح شئ من افعاله ای من اعمال الحج رکنا او واجباً او سنة فی غیرما اختص به ای من اماکنها. (ارشاد الساری الی مناسك الملا علی القاری: ٤٢)

''عمدۃ الفقہ'' کتاب الحج میں ہے: چوتھی شرط حج کی جگہ کا ہونا ہے، یعنی وقوف، رمی، حلق اور ذبح وغیرہ میں سے ہر ایک کا اس کی متعین جگہ میں کرنا صحتِ اداء کے لیے شرط ہے، اور مسجد الحرام طواف کے لیے متعین جگہ ہے اگرچہ اس کی چھت پر ہو۔ اور سعی کے لیے مسعیٰ (صفا اور مروہ کے درمیان کی جگہ) متعین ہے، اور وقوف کے لیے عرفات متعین ہے، اور سب حاجیوں کے عرفات سے روانہ ہو کر جمع ہونے اور رات گذارنے اور پھر وقوف کرنے کے لیے مزدلفہ متعین ہے، اور رمی جمار کے لیے منیٰ، اور ہدی وغیرہ کے ذبح کے لیے حدود حرم متعین ہے۔ پس اگر کوئی شخص حج کے اعمال میں سے کوئی عمل خواہ وہ رکن (فرض) ہو یا واجب یا سنت ہو اس کی خاص جگہ کے علاوہ دوسری جگہ کرے گا تو وہ عمل صحیح نہ ہوگا۔ (ص ٦١)

حرم، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ مقامات جہاں اعمال ومناسک حج ادا کیے جاتے ہیں اور صحت ادا کے لیے شرط ہیں۔ ان کے حدود اربعہ بھی کتب مناسک اور کتب فقہ میں بیان کیے جاتے ہیں، اور ان کو بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ان مقامات کے یہ حدود معلوم و متعین ہیں ان میں تغیر وتبدل کی اجازت اور امکان نہیں۔ بیان حدود کے سلسلہ میں چند کتابوں کے حوالجات پیش ہیں۔ تفصیل کے لیے مراجعت فرمالیں۔

حدود عرفات: ارشاد الساری الی مناسك القاری: ١٤٠، ١٤١، غنية الناسك فی بغية

المناسك: ٧٨٤، زبدة المناسك ١٣٨/١، هداية السالك الى المذاهب الاربعة فى المناسك: ١٠٠٦/٣، عمدة الفقه كتاب الحج ٢٢٣.

حدود مزدلفه: ارشاد السارى: ١٤٧، غنية الناسك: ٨٩، هداية السالك: ١٠٤٧/٣، زبدة المناسك: ١٥٦/١، عمدة الفقه كتاب الحج: ٢٣٠.

حدود منٰى: ارشاد السارى: ١٤٩، غنية الناسك: ٩٠، ٩١، هداية السالك ٩٧٦/٣، زبدة١/١٧٨،١٧٩.

مصنف ''زبدۃ المناسک'' حضرت مولانا شیر محمد صاحب نے منیٰ کے حدود کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ایک تنبیہ فرمائی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں اور چونکہ حاجیوں کو منیٰ میں رہنا سنت ہے۔ان کو بھی چاہیے کہ جن جبلوں کا جو سامنا طرف منیٰ میں داخل ہے، اگر ان پر چڑھ کر قیام کریں تو بھی سنت ادا ہو جاتی ہے۔اسی طرح اور کام جو منیٰ کی حد میں کرنے ہیں واجب ہوں یا سنت وغیرہ وہ بھی اس حد کے اندر کرنا چاہیے، جبلوں کے پیٹھ کی طرف جو منیٰ سے خارج شمار کیا گیا ہے وہاں قیام نہ کریں۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ عقبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف پہاڑیوں پر خیمہ لگائے یا ایسے بھی پڑے رہتے ہیں ان کی یہ سنت وغیرہ ادا نہیں ہوتی۔(زبدۃ ۱/۱۷۹،۱۸۰)

اب آپ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب عرض ہیں:

(۱) باعتبار آبادی منیٰ کے مکہ مکرمہ سے متصل ہونے کے نتیجہ میں منیٰ کو مکہ مکرمہ کا ایک حصہ قرار دینے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ مکہ مکرمہ پر منیٰ کا حکم جاری کر دیا جائے۔ تیرھویں کی صبح اگر منیٰ میں ہو جائے تو حاجی پر اس دن کی رمی واجب ہوگی؛ لیکن حدود منیٰ سے باہر مکہ مکرمہ کے کسی اور حصہ میں تیرھویں کی صبح ہونے سے رمی واجب نہیں ہوگی۔

(۲) آٹھویں ذی الحجہ اور ایام رمی میں منی میں قیام سنت ہے، وہ سنت اسی وقت ادا ہوگی جب کہ وہ اوپر ذکر کردہ حدود منیٰ میں قیام کرے۔ منی کو باعتبار آبادی کے مکہ مکرمہ میں شامل کر لینے کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ کے کسی اور حصہ میں قیام کرنے سے وہ سنت ادا ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۰/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

طواف زیارت کیے بغیر وطن آنے پر نئی شادی والی بیوی بھی حلال نہیں

سوال: ایک آدمی نے حج کیا، اور طواف زیارت نہیں کیا اور وطن واپس چلا گیا تو کیا اس کی بیوی اس کے لیے حلال ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو کیا پھر دوسری شادی کر سکتا ہے یا اس کی صورت کیا ہوگی۔ ''معلم الحجاج'' میں لکھا ہے کہ جب تک طواف زیارت نہیں کرے گا بیوی حلال نہیں ہوگی چاہے سالہا سال گزر جائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

''معلم الحجاج'' میں جیسا کہ لکھا ہے اس آدمی کے لیے عورت کے ساتھ وطی اور دواعی وطی حلال نہیں جب تک کہ طواف زیارت نہ کر لے، دوسری شادی کرنے سے بھی مسئلہ حل نہ ہوگا نئی آنے والی بیوی کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

قران کا احرام باندھنے کے بعد حیض آ گیا

ذوالمجد والکرم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۱) ایک عورت حج قران کا احرام باندھ کر مکہ شریف پہنچی، پہنچتے ہی ماہواری کے ایام شروع ہو گئے، یہاں تک کہ عمرہ ادا نہ کر سکی حج کے ایام آنے کی وجہ سے منیٰ، عرفات، مزدلفہ جا کر حج کے ارکان پورے کیے، پاک ہونے کے بعد طواف زیارت بھی ادا کر لیا، اس کا عمرہ جو رہ گیا ہے اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ کیا یہ حج اس کا حج افراد ہوگا؟

عورتیں اقتداء کی نیت نہیں کرتیں

(۲) حرم شریف میں جو عورتیں امام کے پیچھے نماز ادا کرتی ہیں، اکثر وہ امام کی اقتداء کی نیت نہیں کرتیں تو کیا ان کی نماز ہو جائے گی یا یہ نمازیں دہرانی پڑیں گی؟

تیرھویں کی رمی مغرب کے بعد کرنا

(۳) کسی حاجی نے تیرھویں ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام کیا؛ لیکن اس نے رمی مغرب کی نماز کے بعد کی تو کیا رمی ادا ہو جائے گی یا دم آئے گا؟

حج کی سعی سے پہلے عمرہ

(۴) کسی حاجی نے پندرہ ذی الحجہ تک حج کی سعی نہیں کی، وہ حج کی سعی سے پہلے عمرہ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا عمرہ ہو جائے گا یا اس کو عمرے سے پہلے حج کی سعی کرنا ضروری ہے؟

ہوائی جہاز میں نماز کیسے پڑھیں

(۵) ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اشارے سے نماز ادا کی تو کیا نماز ہو جائے گی یا دہرانی پڑے گی؟ اور اگر اس نے ہوائی جہاز میں باقاعدہ رکوع اور سجدے کے ساتھ نماز ادا کی تو کیا نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) وہ عورت اپنے فوت شدہ عمرہ کی قضا کرے اور ترک عمرہ کی وجہ سے ایک دم دے اس کا یہ حج، حج افراد ہے؛ اس لیے اس پر دم قران نہیں۔

نوٹ: اس مسئلہ کی تفصیل اذان بلال ماہ رجب ۱۴۲۴ھ جلد ۱۴ شمارہ ۹ دیکھ لیں۔

(۲) امام کے پیچھے ادا کی جانے والی نماز کے صحیح ہونے کے لیے اقتداء کی نیت بھی شرط ہے؛ اس لیے اگر کسی نے اقتداء کی نیت نہیں کی تو اس کی وہ نماز درست نہیں ہوئی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

(۳) جی ہاں، دم واجب ہوگا۔ (زبدۃ المناسک ۱/۱۹۱)

(۴) اس کو چاہیے کہ پہلے حج کی سعی کرلے اس کے بعد عمرہ کرے، اس کے باوجود اگر کسی نے سعی سے پہلے عمرہ کرلیا تو وہ درست ہوجائے گا۔

(۵) فرض نماز اگر ہوائی جہاز میں سیٹ پر بیٹھ کر اشارہ سے ادا کی اور کوئی معذوری نہیں ہے تو وہ ادا نہیں ہوئی لوٹانا ضروری ہے؛ البتہ نفل نماز اس طرح پڑھنا درست ہے، اور فرض نماز اگر رکوع سجدہ کے ساتھ ادا کی تو درست ہوجائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۱/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

حج تمتع کرنے والی عورت حائضہ ہوگئی تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) ایک عورت ذی الحجہ کی شروع تاریخ میں حج تمتع کے ارادہ سے چلی، اپنے ملک کے میقات سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظّمہ پہنچی، اب عمرہ کے ارکان ادا کرنے سے پہلے حیض شروع ہوگیا، حیض سے پاک ہونے سے پہلے حج کا احرام باندھنے

کا وقت آ گیا تو ایسی عورت کے لیے حج تمتع ادا کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ عمرہ کے احرام سے نکلنے کے لیے چوٹی سے بال کاٹنے ہوں گے یا نہیں؟ عمرہ کی قضاء یا دم لازم آئے گا یا نہیں؟

(۲) اسی طرح ایک عورت حج سے پہلے عمرہ کے ارکان ادا کرنے کے بعد وقت کی قلت کی بناء پر مدینہ منورہ چلی گئی، اور اس کا ارادہ حج تمتع کا تھا، اب واپسی کے وقت حیض شروع ہو گیا، تو ایسی شرعی عذر والی عورت مدینہ منورہ سے واپسی پر حج افراد کا احرام باندھے؟ یا اس کے لیے کوئی شکل آپ کے علم میں ہو تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) امام محمدؒ نے ''مؤطا'' میں اس مسئلہ پر مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب المرأة تقدم مكة بحج أو بعمرة فتحيض قبل قدومها أو بعد ذلك، (مؤطا امام مالکؒ روایة محمد ابن الحسن الشيباني مع تعليق الممجد على مؤطا محمد تعليق و تحقيق الدكتور تقى الدين الندوى ۲/۳۵۵) آگے اس کا حکم بیان فرماتے ہیں: قال محمدؒ: و بهذا نأخذ الحائض تقضى المناسك كلها غير ان لا تطوف ولا تسعى بين الصفا والمروة حتى تطهر، فان كانت أهلت بعمرة، فخافت فوت الحج فلتحرم بالحج و تقف بعرفة و ترفض العمرة فاذا فرغت من حجها قضت العمرة كما قضتها العائشة رضى الله عنها، و ذبحت ما استيسر من الهدى. (ایضاً ۲/۳۵۹،۳۶۰)

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ عورت اگر عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظمہ پہنچی اور وہ حائضہ ہے ایام حج آجانے کی وجہ سے حج کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے، یعنی عمرہ کا احرام باقی رکھ کر پاکی کا انتظار کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ حج فوت ہو جائے گا، تو اس کو چاہیے کہ حج کا احرام باندھ لے اور وقوف عرفات کرلے، اور عمرہ کا احرام کھول کر عمرہ چھوڑ

دے، اس کے بعد حج سے فارغ ہو کر عمرہ کی قضاء کر لے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے کیا تھا، اور دم رفض کے طور پر جانور ذبح کرے۔

احرام عمرہ سے نکلنے کے لیے محظورات احرام میں سے کوئی کام کر لے، مثلاً کنگی کر لے یا اور کوئی کام (چوٹی کاٹنا) کر لے۔

''مرقاۃ'' میں ہے: فأمرني النبی ﷺ أن أنقض رأسي أی شعره، وامتشط و أهل بالحج، أی أمرني أن أحرم بالحج، و أترك العمرة أی أرفضها، قال ابن الملکؒ: أی أمرني أن أخرج من احرام العمرة و اترکها باستباحة المحظورات من التمشيط وغيره لعدم القدرة على الاتيان بأفعالها بسبب الحيض الخ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۵/۳۰۶)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں: حنفیہ نے اپنے اس مدعا پر کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہ فسخ کر دیا تھا کئی وجہ سے استدلال کیا ہے، ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا اپنے عمرہ کو چھوڑ دو، دوم یہ کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: اپنا سر کھول کر کنگی کر لو، ظاہر ہے کہ احرام میں کنگی کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ بالوں کے جھڑنے کا اندیشہ ہے۔ (حجۃ الوداع وعمرات النبی ﷺ اردو ص:۶۰)

وہ عورت عمرہ کی قضاء بھی کرے، جیسا کہ اوپر ''مؤطا'' کی عبارت میں آچکا ہے اور چونکہ عمرہ چھوڑا ہے؛ اس لیے دم بھی دے گی۔

حضرت شیخ الحدیثؒ تحریر فرماتے ہیں: واهدت أی یجب علیها الهدی ایضاً کما اهدی النبی ﷺ عن عائشةؓ بقرة کما فی روایات مسلم الا أن ذاك الهدی عندهم هدی القران و عند الحنفية هدی الرفض. (اوجز المسالك ۵/۸۷، ۸۸)

''فتح القدیر'' میں ہے: و کل من رفض نسکا فعلیه دم لما روی ابو حنیفة
عن عبد الملك بن عمیر عن عائشةؓ ان النبی ﷺ امر لرفضها العمرة بدم. (۳/ ۱۱٤)

''زبدۃ المناسک'' میں ہے: مسئلہ: جس چیز کو چھوڑا ہے اس کے چھوڑنے کی وجہ سے ایک تو دم رفض دینا واجب ہوگا، دوسرا یہ کہ اس چھوڑی ہوئی چیز کی قضاء کرنی ہوگی، پس عمرہ کے چھوڑنے سے اس کی قضاء اور دم رفض لازم ہے۔ فقط (۱۴/۲)

(۲) ایسی عورت افراد ہی کا احرام باندھے۔

''زبدۃ المناسک'' میں ہے: اکثر الوقوع ضروری: مسئلہ اکثر حاجی اشہر حج میں آکر عمرہ کرتے ہیں، پھر اشہر حج میں حج کرنے سے پہلے مدینہ طیبہ روضۂ مقدسہ اور حجرۂ مطہرہ و معطرہ ﷺ کی زیارت کے لیے چلے جاتے ہیں، پس ان کو چاہیے، جب وہاں سے واپس ہوں تو فقط حج مفرد ہی کا احرام باندھ کر آئیں، تو امام صاحبؒ کے نزدیک ان کا تمتع صحیح ہے، اس سفر کرنے سے تمتع باطل نہ ہوگا، کیونکہ وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کر چکے ہیں، اور عمرہ کرنے کے بعد وہ حکماً مکیوں میں داخل ہیں، اگر چہ اشہر حج میں میقات سے بھی باہر نکل گئے ہوں، کیونکہ وہ اپنے اصلی وطن میں نہیں گئے ہیں، تو ان کا سفر باعتبار حکم کے واحد ہے، اس کو المام فاسد کہتے ہیں، جو کہ مبطل تمتع نہیں، اب ان کو مدینہ طیبہ سے قران کا احرام باندھنا ممنوع ہے کہ وہ مکیوں کے حکم میں ہیں، اگر قران کا احرام باندھیں گے تو دم جنایت لازم ہوگا۔ (شرح اللباب وغنیة ۲/ ۱٤، ۱۵) البتہ اس صورت میں اس پر دم تمتع لازم ہے۔ (زبدۃ المناسک ۲/۱۴)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲/ جمادی الاخری ۱۴۲۰ھ

قران کا احرام باندھنے والی حائضہ ہوگئی

سوال: اگر کسی عورت نے قران کا احرام باندھا، اور مکہ معظّمہ پہنچنے سے پہلے حائضہ ہوگئی، اور ایام حج تک پاکی کی امید نہیں، اس کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ احرام فسخ کرے اور وہ حج کا نیا احرام باندھے؟ یا اسی احرام سے حج کرے؟ اگر احرام فسخ کرے تو قضاء کس کی کرے، اور کتنے دم دے؟ اگر اسی احرام سے حج کرے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کا دریافت کیا ہوا مسئلہ مستقل طور پر صراحۃً باوجود تتبع اور تلاش کے نہیں ملا، البتہ ''عمدۃ الفقہ'' کتاب الحج میں قران کے بیان میں کچھ عبارت ایسی ملی جس سے آپ کا سوال حل ہوسکتا ہے۔

مؤلف کتاب شرائط قران کے عنوان کے ماتحت تیسری شرط بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۳) عمرہ کا پورا یا اکثر طواف وقوف عرفہ کو اس کے وقت میں ادا کرنے سے پہلے کرنا، پس اگر کسی قارن نے عمرہ کا پورا یا اکثر طواف نہیں کیا، مثلاً: وہ مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوا، بلکہ سیدھا عرفات چلا گیا، یا اس نے اقل حصہ یعنی تین چکر یا اس سے کم طواف کر کے زوال کے بعد وقوف عرفہ کرلیا، خواہ کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا ہو، مثلاً: کسی عورت کو حیض آ گیا اور وہ اس کی وجہ سے طواف عمرہ نہ کرسکی تو اس کا عمرہ جاتا رہا اگر چہ اس نے عمرہ ترک کردینے کی نیت نہ کی ہو پس اس کا عمرہ جاتا رہا اور قران ساقط ہوگیا؛ اس لیے کہ جب اس کا عمرہ جاتا رہا تو وہ دو نسک (دو عبادتیں) ادا کرنے کا فائدہ حاصل نہیں کرسکا اور اس پر دم رفض واجب ہوگا، کیونکہ اس نے عمرہ شروع کر کے ترک کردیا ہے، اور ایام تشریق کے بعد اس عمرہ کی قضاء

دینا اس پر واجب ہے کیونکہ اس عمرہ کا شروع کرنا صحیح ہو گیا پس وہ محصر کے مشابہ ہو گیا؛ اس لیے اب اس کا ادا ممکن نہیں رہا، کیونکہ اگر وہ اس کو وقوف عرفہ کے بعد ادا کرے گا تو وہ افعال حج پر افعال عمرہ کی بنا کرنے والا ہو گا اور یہ مشروع طریقہ کے خلاف ہے۔(عمدۃ الفقہ ۲۶۱/۴)

(اضافہ از احقر): اوپر عبارت میں مؤلف نے لکھا ہے: اگر چہ اس نے عمرہ ترک کر دینے کی نیت نہ کی ہو...... الخ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قران کا احرام باندھنے والی عورت کو مکہ مکرمہ پہنچ کر یا پہلے حیض آجائے اور عمرہ کے افعال کی ادائیگی کا وقت نہ رہے اور عرفات میں وقوف کا وقت آجائے تو اس کو چاہیے کہ عمرہ کے ترک کی نیت کرلے؛ لیکن یاد رہے کہ تمتع کا احرام باندھنے کی صورت میں وہ عورت عمرہ کا احرام کھولنے کے لیے کوئی منافیٔ احرام کام (مثلاً بالوں میں تیل ڈالنا وغیرہ) کر کے عمرہ کا احرام ختم کرتی تھی ایسا یہاں نہ کیا جائے؛ اس لیے کہ یہاں پر یہ احرام صرف عمرہ کا نہیں بلکہ ساتھ میں حج کی بھی نیت کی گئی ہے گویا دونوں کا مشترک احرام ہے، اب اگر یہاں عمرہ کا احرام ختم کرنے کے لیے کوئی منافیٔ احرام کام کرے گی تو یہ عمل حج کے احرام کے حق میں جنایت ثابت ہوگا، جیسا کہ متمتع عمرہ کے افعال ادا کرنے کے بعد حلق کرا کر عمرہ کا احرام کھول دیتا ہے؛ لیکن قارن عمرہ کے افعال ادا کرنے کے بعد حلق نہیں کرائے گا، (جیسا کہ کتب فقہ میں مصرح ہے) بہر حال قران کا احرام باندھنے والی عورت صورت مسؤلہ میں عمرہ ترک کرنے کی صرف نیت کرلے اور عرفات چلی جائے، اور اگر نیت نہیں کی تب بھی وقوف عرفات کر لینے سے خود بخود عمرہ ترک ہو جائے گا اور ان دونوں صورتوں میں افعال حج ادا کرنے کے بعد احرام کھول دے اور اس عورت پر دم قران واجب نہیں؛ اس لیے کہ قران ہوا ہی نہیں؛ البتہ چھوٹے ہوئے عمرہ کی قضاء اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اس کو چھوڑ

دینے کی وجہ سے ایک دم جس کو فقہاء کی اصطلاح میں دم رفض کہتے ہیں واجب ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ

چوتھے دن تک رمی مؤخر کرنے کی صورت میں دم کے وجوب میں مفتیٰ بہ قول

سوال: رمی جمار کے متعلق ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک عریضہ ارسال کررہا ہوں، امید کہ تفصیلی جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

(۱)وفی الاصل لوترك رمی الجمارفی سائرالایام الی الیوم الرابع قضاهاعلی التالیف فی الیوم الرابع؛لان وقت الرمی باق؛والجنس واحد.

(المحیط البرهانی۳/ ٤١٠ الفصل الثالث تعلیم اعمال الحج کتاب المناسك)

(۲)فعلی هذالقول لواخررمی الجمارالثلالث عن یوم القرّالی یوم النفرالاول؛ رماهابعدطلوع الفجرقبل طلوع الشمس؛یکون اداءً لاقضاءً؛ ولا یلزمه دم. (البحرالعمیق فی مناسك المعتمروالحاج الی بیت اللّٰه العمیق؛٤/ ١٨٨٠ الباب الثانی فی الاعمال المشروعة یوم النحر.فصل فیما یفعله الحاج ایام التشریق ولیالیها)

(۳)فان ترك الرمی کله فی سائرالأیام الی آخرأیام الرمی وهو الیوم الرابع فانه یرمیهافیه علی الترتیب وعلیه دم عنده؛ وعندهمالادم علیه لما بیّنا أن الرمی مؤقت عنده وعندهمالیس بمؤقت. (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ص: ۳۲٦ کتاب الحج وقت الرمی)

(٤)ثم بتاخیرهایجب الدم عنده خلافاً لهما. (شامی ۳/ ٥٨٦باب الجنایات)

(۵)لو اخر رمی الایام کلها الی الرابع مثلاً رماها کلها فیه قبل الزوال أو بعده علی التالیف قضاء عنده وعلیه دم واحد للتاخیر ،واداء عندهما ولا شئی علیه . (غنیة جدید ص:۱۸۲-قدیم ص:۹۷)

ان عبارات مذکورہ سے معلوم ہو،اکہ اگر کوئی شخص تینوں دن کی رمی ترک کردے اور چوتھے دن ان سب دنوں کی کنکری ماردے، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو ایک دم واجب ہوگا،اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک یہ بھی ادا ہے،اوراس پر کوئی دم نہیں۔

کیا حضرات صاحبینؒ کا قول مفتی بہ ہے یا حضرت امام صاحبؒ کا؟ آج کے سخت ہجوم کے حالات میں کوئی شخص حضرات صاحبینؒ کے قول پر عمل کرلے تو اس میں کراہت کا ارتکاب لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اصول افتاء کے پیش نظر امام صاحبؒ ہی کا قول راجح اور مفتی بہ قرار دیا جائے گا۔

فی شرح المنیة للبرهان ابراهیم الحلبی من فصل التیمم حیث قال فللّٰه در الامام الاعظم ماأدق نظره وماأسدفکره والأمر ماجعل العلماء الفتوی علی قوله فی العبادات مطلقاً. (شرح عقودرسم المفتی ص:۱۱۰)

”هدایة السالك الی المذاهب الاربعة فی المناسك“ میں ہے:وعند الحنفیة: أنه یدخل وقت رمی جمرة العقبة بطلوع الفجریوم النحر؛ویبقی الی غروب شمسه وفیما بعدذلك من اللیل الی طلوع الفجرمن الغدیجزئ الرمی مع الکراهة؛ولا شئی علیه وفیمابعدذلك من أیام التشریق ولیالیهایجزئه، وعلیه مع ذلك دم عندأبی حنیفةؒ، ولا شئی علیه عندالصاحبینؒ؛ وقدأساء.

(هداية السالك الى المذاهب الاربعة فى المناسك۳/۱۰۹۷)

اس کے حاشیہ پر شیخ نورالدین عتر تحریر فرماتے ہیں: المفتى به عندالحنفية قول أبى حنيفة بوجوب الدم. (حاشیہ صفحہ مذکورہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/صفر المظفر ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

خوف زحام کی بناء پر ترک رمی

محترم المقام حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وتجوز الانابة فى الرمى لمن عجز عن الرمى بنفسه لمرض أو حبس أو كبر سن أو حمل المرأة فيصح للمريض بعلة لا يرجى زوالها قبل انتهاء وقت الرمى و للمحبوس و كبير السن والحامل أن يوكل عنه من يرمى عنه الجمرات كلها. و يجوز التوكل عن عدة أشخاص على أن يرمى الوكيل عن نفسه أولاً كل جمرة من الجمرات الثلاث. (الفقه الاسلامى وادلته ج ۳ ص۱۹۳)

سوال: (۱) زید نے رمی جمرات ثلثہ ۱۲/ تاریخ کو عورتوں کی طرف سے وکالۃً کی، کیونکہ قافلہ چل رہا تھا، عورتوں کو رمی کرنا بہت دشوار تھا، یہ رمی صحیح ہوئی یا نہیں؟ بہ حالتِ عدمِ صحت دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

رمی جمار واجب ہے، اور ترک واجب اگر بہ سبب کسی عذر کے ہو تو اس میں کچھ نہیں آتا۔ کمافی رد المحتار. و كذا كل واجب اذا تركه بعذر لا شيء عليه

كما روى البحر، شامى و هكذا فى المناسك وغيره. پس اس صورت میں بہ سبب عذر ازدحام کے جو عورتوں کی رمی ترک ہوئی تو اس میں دم واجب نہ ہوگا۔ (فتاویٰ دار العلوم مدلل و مکمل جلد ششم ص ۵۵۳و۵۵۴)

لكن لو تركه بعذر كزحمة بمزدلفة لا شىء عليه. (در المختار ۲/۵۱۲)

وقد صرحوا بأنه لو أفاض من عرفات لخوف الزحام وجاوز حدودها قبل الغروب لزمه دم مالم يعد قبله، و كذا لو ند بعيره فتبعه كما صرح به فى الفتح ...... وقد يجاب بأن خوف الزحام لنحو عجز و مرض انما جعلوه عذرا هنا لحديث أنه ﷺ قدم ضعفة أهله بليل، ولم يجعل عذراً فى عرفات لما فيه من اظهار مخالفة المشركين، فانهم كانوا يدفعون قبل الغروب فليتأمل.

(وقوله لا شىء عليه) وكذا كل واجب اذا تركه بعذر لا شىء عليه كما فى البحر. (رد المحتار ۲/۵۱۱و ۵۱۲ مطلب فى الوقوف بمزدلفة).

(۱) اب سوال یہ ہے کہ آج کل جمرات پر دن یا رات کے کسی بھی وقت میں حتی کہ رات بارہ بجے ایک بجے بھی اتنا ہجوم اور ازدحام ہوتا ہے کہ کمزور ضعیف اور بوڑھی عورتوں کے لیے تو بسا اوقات جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، اور یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔ جس طرح بہ ذات خود رمی کرنا واجب ہے اسی طرح یوم النحر کے افعال میں ترتیب بھی واجب ہے اور ترتیب قائم رکھنے میں جان کا خطرہ تو نہیں؛ لہٰذا ترتیب قائم رکھنے کی مشقت و تکلیف بہ ذات خود رمی کرنے کی بہ نسبت اخف اور کمتر ہے، اور مذکورہ بالا لوگوں کو بہ ذات خود رمی کرنے کی مشقت و تکلیف اس سے بدرجہا سخت تر ہے۔

جمعیت علماءِ ہند کی زیر نگرانی محمود ہال، دیوبند میں منعقد ہونے والے چھٹے فقہی اجتماع نیز اسلامک فقہ اکیڈمی کے تحت ہونے والے فقہی سمینار میں آج کل کے حالات میں ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کی بناء پر یوم النحر کے افعال میں ترتیب قائم رکھ نہ سکنے کی صورت میں تیسیر أعلی الناس دم واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا گیا۔ تو کیا خوفِ زحام اور دیگر پریشان کن اعذار کی بناء پر ضعیف، مریض، کبیر السن عورتوں اور مردوں کے لیے نیابت فی الرمی یعنی دوسرے کسی شخص کے ذریعہ رمی کرانا بغیر وجوبِ دم کے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ترکِ وقوفِ مزدلفہ میں عجز ومرض وغیرہ کی بناء پر خوفِ زحام کو عذر قرار دیا جانا مذکورہ بالا حدیث (أنه ﷺ قدم ضعفة أهله بليل) کی بناء پر منصوص ہے، لہٰذا اس پر قیاس کر کے خوفِ زحام کو نیابت فی الرمی یا ترکِ رمی کے بارہ میں عذر قرار دے کر درج بالا لوگوں کے لیے نیابت فی الرمی یا ترکِ رمی جائز نہ ہوگا۔

امید کہ ان دونوں سوالوں کے مدلل تشفی بخش جواب سے نواز کر ممنون فرمائیں گے۔ والأجر عندالله.

از عبداللہ ڈیوز بری، انگلینڈ، یوکے

۸/ جنوری ۲۰۰۴ء ۱۶/ ذی القعدہ ۱۴۲۴ھ بروزِ جمعرات

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آپ کے سوال میں یہ عبارت ہے کہ ”آج کل جمرات پر دن یا رات کے کسی بھی وقت میں حتی کہ رات کے بارہ بجے ایک بجے بھی اتنا ہجوم اور ازدحام ہوتا ہے کہ کمزور ضعیف بوڑھی عورتوں کے لیے تو بسا اوقات جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے“ جمرات کے پاس ہجوم کا ہونا اور اس ہجوم کا اتنی مقدار میں ہونا کہ اس حالت میں

کمزور ضعیف اور بوڑھی عورتوں کے لیے جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے یہ تو درست ہے؛ لیکن ہجوم کی یہ کیفیت اور نوعیت رمی کے پورے وقت میں باقی نہیں رہتی، بلکہ رمی کے لیے شریعت کی طرف سے جو وقت مقرر ہے، مثلاً پہلے دن کی رمی کے لیے دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے لے کر گیارھویں ذی الحجہ کی صبح صادق تک کا جو وقت مقرر ہے، اس میں بعض لمحات ایسے آتے ہیں کہ ان اوقات میں ہجوم کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے؛ لیکن اس پورے وقت میں مسلسل از ابتداء تا انتہاء یہ کیفیت نہیں ہوتی بلکہ اسی مقررہ وقت میں بہت سے لمحات ایسے بھی آتے ہیں کہ ان میں مذکورہ افراد بسہولت رمی کر سکتے ہیں؛ اس لیے سوال میں مذکور آپ کا دعوی خلاف مشاہدہ ہے۔ رہی وہ عبارت جو سوال میں ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' کے حوالے سے نقل فرمائی ہے، اس میں اس بات کی تصریح نہیں کہ یہ حنفیہ کا مسلک ہے بلکہ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے مطالعہ سے اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

"غنية الناسك في بغية المناسك" جو ہمارے اکابر کے یہاں اس باب میں بہت مستند سمجھی جاتی ہے اس کی عبارت پیش خدمت ہے:

السادس: أن يرمى بنفسه فلاتجوز النيابة فيه عندالقدرة، وتجوز عند العذر فلو رمى عن مريض با مره أومغمى عليه ولو بغيرامره أوصبى أو معتوه أو مجنون جاز، والأفضل أن توضع الحصاة فى اكفهم فيرمونها أويرمونه بأكفهم ولو رمى عنهم يجزيهم ذلك، ولا يعادان زال العذرفى الوقت ولا فدية عليهم وان لم يرموا الاالمريض.

وحد المريض أن يصيربحيث يصلى جالسا لأنه لايستطيع الرمى راكبا ولامحمولا، امالأنه تعذرعليه الرمى أو يلحقه بالرمى ضرر فان كان

مـريـض له قدرة على حضورالمرمى محمولاو يستطيع الرمى كذالك من غير أن يلحقه ألم شديد ولا يخاف زيادة المرض ولا بطوء البرء لايجوزالنيابة عنه الا أن لايجدمن يحمله.(غنية الناسك فى بغيةالمناسك ص ١٠٠)

آگےتحریرفرماتے ہیں:(تـنبيـه): قـدتبيـن مـمـا قدمنا أنهم جعلوا خوف الزحام عذرا للمرأة و لمن به علة أوضعف فى تقديم الرمى قبل طلوع الشمس أو تـأخيـره الـى الـلـيـل، لا فـى جـواز النيابة عنهم لعدم الضرورة، فلو لم يرموا بأنفسهم لخوف الزحام تلزمهم الفدية. والله سبحانه و تعالى أعلم (١٠٠)

یوم النحر کے افعال میں ترتیب کے سلسلہ میں فقہی اجتماع اور فقہی سمینار میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اس میں جس قول کواختیار کیا گیا ہے وہ مذہب احناف سے بالکلیہ خارج نہیں، بلکہ صاحبینؒ کا قول ہونے کے ساتھ ائمہ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں اس کو اختیار کرنے کی وجہ سے مذہب حنفی سے بالکلیہ خروج لازم نہیں آتا اور یہ چیز آپ پر مخفی نہیں۔

بعض حضرات کی جو رائے آپ نے ترک وقوف مزدلفہ کے مسئلہ پر قیاس والی پیش کی وہ بھی سمجھ میں آنے والی نہیں، خود آپ نے جو عبارت پیش فرمائی ہے اس میں صراحت موجود ہے کہ اگر خوف زحام کی وجہ سے حدود عرفات کو قبل الغروب پار کرلیا تو دم واجب ہوگا، حالانکہ نفس وقوف عرفات کا تحقق ہو چکا، صرف غروب آفتاب تک اس کو ممتد نہ کرنے کی وجہ سے دم واجب ہوا، اور سب جانتے ہیں کہ امتداد الی الغروب واجب ہے اور یہاں واجب چھوڑنے پر اگرچہ خوف زحام کی وجہ سے ہے دم لازم کیا گیا، اور خوف زحام کو سقوط دم کے لیے کافی نہیں سمجھا گیا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۳/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

رمی جمار ترک کرنے سے دم واجب ہوگا

سوال: کوئی شخص حج کو گیا جیسا کہ بمبئی سے ٹور لے جاتا ہے؛ لہٰذا ایام نحر میں سات کنکریاں جمرۂ عقبہ پر ماردی؛ مگر جلدی میں تین جمرہ پر کنکریاں نہ مارسکا، اب اسے یاد آیا کہ حج میں اس سے کوتاہی ہوگئی ہے؛ لہٰذا اب آپ بتایئے اس کا کفارہ کیا ہے؟ کیا حج ادا ہوگیا؟ اب اس کی استطاعت بھی نہیں ہے کہ دوبارہ حرم جائے۔ برائے مہربانی آپ کوئی راستہ بتائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورت مسئولہ میں حج ادا ہوگیا؛ مگر چونکہ حاجی نے تین جمرہ پر کنکریاں مارنا ترک کردیا ہے؛ اس لیے حج میں نقص آنے کی بناء پر اس پر دم (قربانی کے لائق جانور کا حرم میں ذبح) لازم ہے؛ لہٰذا اسے چاہیے کہ یہ دم غرباء وفقراء پر صرف کرے اس میں سے مالداروں کو دینا یا اپنے لیے رکھنا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ۱/۲۴۷)

حکم مذکور اس وقت ہے جب تک حاجی حرم شریف میں موجود ہو؛ لیکن اگر گھر آنے کے بعد جو جنایت کی ہے وہ یاد آئی، جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اسے چاہیے کہ کسی کو وکیل بنا کر یا کسی بھی ذریعہ سے دم کی قیمت حرم شریف میں پہنچا دے، یہ کہہ کر کہ اس رقم سے ایک دم جنایت خرید کر ذبح کیا جائے اس کے بعد وہ سبکدوش ہوجائے گا انشاءاللہ۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہجوم کی وجہ سے مرد کا عورت کی طرف سے وکیل بن کر رمی کرنا

سوال: حج کے ایام میں شیطان کو کنکری مارنے کے لیے زیادہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے شوہر اپنی بیوی کی طرف سے وکیل بن کر کنکری مارسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عورت کی طرف سے کسی دوسرے کو نائب بن کر ہجوم کی وجہ سے رمی کرنا (شیطان کو کنکری مارنا) جائز نہیں، اگر ہجوم کے خوف سے عورت نے رمی نہیں کی تو فدیہ واجب ہوگا۔ (معلم الحجاج ص ۱۸۶)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

تیسرے دن کی رمی چھوڑ دی تو کیا حکم ہے؟

سوال: دو دن جمرات کی رمی کی اور تیسرے دن رمی نہیں کی تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تیسرے دن سے مراد اگر بارہویں ذوالحجہ ہے، تو اس کی رمی چھوڑنے پر دم واجب ہوگا، اور اگر تیسرے دن سے مراد تیرہویں ذوالحجہ ہے، تو اگر وہ شخص بارہویں کے غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے مکہ چلا آیا تھا، اس پر تیرہویں کی رمی واجب نہیں ہوئی، اور یہ چلا آنا بلا کراہت جائز ہے، اور اگر بارہویں کے غروب آفتاب کے بعد تیرہویں کی صبح صادق سے پہلے منیٰ سے مکہ چلا آیا تھا تو اس صورت میں بھی تیرھویں کی رمی واجب نہیں ہوئی؛ لیکن یہ چلا آنا بکراہت جائز ہے؛ مگر جو تیرھویں کی صبح صادق منیٰ میں ہوگئی تو رمی تیرہویں کی واجب ہے اگر بدون کیے چلا آئے گا تو دم واجب ہوگا۔ (زبدۃ المناسک ۱۹۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

باپ کا قرض ادا نہ کرنے والے کا حج صحیح ہے

سوال: ایک شخص اپنے باپ کے پاس سے قرضہ کے طور پر پیسے لے کر سعودیہ ملازمت کرنے کے لیے گیا، پھر ایک سال کے بعد باپ اپنے بیٹے سے دیے ہوئے پیسے طلب کرتا ہے، تو بیٹا جواب میں کہتا ہے کہ میں حج کرنے کے بعد دوں گا اور اس نے حج کیا

تو اس لڑکے کا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حج صحیح ہوجائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

بغیر وصیت میت کی طرف سے حج بدل کرے تو فرض ساقط ہوجائے گا

سوال: میں سال گذشتہ اپنا حج کر چکا ہوں، امسال اپنے مرحوم بھائی کی طرف سے حج بدل کا ارادہ تھا اسی نیت سے فارم بھی بھر دیا تھا، مرحوم بھائی پر حج فرض نہ تھا، بعد میں بعض رشتہ داروں نے توجہ دلائی کہ والد مرحوم پر حج فرض تھا، اور انہوں نے اپنی زندگی میں حج نہیں کیا ہے؛ لہٰذا والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کرلوں، تو کیا میں والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس صورت میں والد مرحوم کی طرف سے حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟ اور میں حج بدل میں احرام باندھتے وقت کیا نیت کروں؟ بعض ساتھیوں کی رائے یہ ہے کہ میں پہلے مدینہ جاؤں اور پھر عین حج کے موقع پر یعنی ۷/ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر مکہ پہنچوں۔ حج بدل میں افراد افضل ہے یا قران یا تمتع؟ مذکورہ مسئلہ میں قربانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر آپ کے والد مرحوم پر حج فرض ہو چکا تھا، اور زندگی میں انہوں نے حج ادا نہیں کیا اور بوقتِ وفات وصیت بھی نہیں کی ہے، اور اب آپ اپنے خرچ سے تبرعاً فرض حج ادا کررہے ہیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کا حج فرض اداء ہوجائے گا۔ (شامی ۲/ ۲۶۶) احرام کے وقت نیت اپنے والدِ مرحوم کے حج کی کریں، اگر زبان سے کہہ دیں ''لبیك عن أبي''

تو بہتر ہے ورنہ دل سے بھی کافی ہے، چونکہ یہ حج آپ اپنے والد مرحوم کی طرف سے تبرعاً کررہے ہیں؛ اس لیے آپ کو اختیار ہے، چاہیں افراد کا احرام باندھیں، چاہیں قران و تمتع کا۔ پہلے مدینہ منورہ جاکر عین حج کے موقعہ پر افراد کا احرام باندھ کر مکہ معظّمہ آنا چاہیں تو ایسا بھی کرسکتے ہیں، ضروری نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ اگر تمتع یا قران کا احرام باندھیں گے تو دم قران و تمتع واجب ہوگا، اور اگر افراد کا احرام باندھا ہے تو جانور ذبح کرنا افضل ہے، واجب نہیں۔ یہ حکم تو حج کی قربانی کا ہے؛ رہی عیدالاضحیٰ کی قربانی تو آپ حج کے خاص ایام شروع ہونے سے پہلے مکہ معظّمہ مقیم بن چکے ہیں، یعنی پندرہ یوم یا اس سے زیادہ قیام کی نیت کے ساتھ اتنا قیام کرچکے ہیں اور ساتھ ہی بقدرِ نصاب مال کے مالک ہیں تو عیدالاضحیٰ والی قربانی بھی آپ پر واجب ہے، ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/ ۱۹۶، زبدۃ المناسک ۲/ ۱۲۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

فرض حج کے ذریعہ ایصال ثواب

سوال: مسئلہ یہ پیش آیا ہے کہ ناچیز کی پھوپھی نے ماہِ ذی الحجہ میں یہ نیت کی تھی کہ میں اپنے بھتیجے خالد کو آئندہ سال اس کے والد مرحوم کے حج بدل میں بھیجوں گی (انشاء اللہ) (یہ بھی یاد رہے کہ والدِ مرحوم پر اپنی حیات میں حج فرض نہیں ہوا تھا)۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ اسی سال والد مرحوم کے بھانجی داماد نے والد مرحوم کی طرف سے حج ادا کردیا، جو انہوں نے حج کی ادائیگی کے بعد ظاہر کیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا پھوپھی کی نیت کا پورا کرنا ضروری ہے؟ یا یہ کہ پھوپھی یہ رقم ناچیز کو ہدیہ کردیں اور ناچیز اپنا حج پڑھ لے۔ کیا اس کی گنجائش ہے؟

دراصل بات یہ ہے کہ پھوپھی یہ کہہ رہی ہے کہ میں تو اپنی نیت کے مطابق یہ رقم

تیرے حوالہ ضرور کر دوں گی، اب مفتی صاحب سے یہ معلوم کرلیں کہ والد صاحب کی طرف سے حج پڑھا جائے گا یا ناچیز اپنی طرف سے پڑھ سکتا ہے؟

اخیراً اپنی مستجاب دعاؤں میں ناچیز کو یاد فرما کر کرم فرمائیں۔ فقط والسلام۔

ناچیز: خالد کاپودروی عفی عنہ

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چونکہ آپ کے والد مرحوم پر حج فرض نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے اپنی طرف سے حج بدل کرانے کی کوئی وصیت کی تھی، ایسی صورت میں آپ کی پھوپھی صاحبہ کا ان کی طرف سے ان کے بیٹے کو حج بدل کے لیے بھیجنے کا حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ اس حج کا ثواب ان کو پہنچے؛ اس لیے اگر ان کی دی ہوئی رقم سے آپ اپنا فرض حج ادا کریں اور بعد میں اپنے اس فرض حج کا ثواب والد مرحوم کو بخش دیں تو دونوں مقصد حاصل ہو جائیں گے، فقہاء نے فرائض کا ثواب دوسروں کو پہنچانے کے درست ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۳۰/ ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

سوال: کسی آدمی نے حج کی ادائیگی سے پہلے عمرہ کرلیا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا عمرہ کرنے کی وجہ سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسا آدمی جس پر پہلے سے حج فرض نہیں ہے وہ جب عمرہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ اور کعبۃ اللہ شریف جا پہنچا تو اس پر فرضیت حج متعین ہو جاوے گی؛ لیکن یہ

فرضیت حج بالاتفاق تب ہوگی جب حج کے مہینوں میں آکر کعبۃ اللہ شریف میں پہنچا ہو، اور اگر کعبۃ اللہ شریف میں حج کے مہینوں میں نہیں پہنچا تو سب علماء کے نزدیک مشہور اور راجح قول میں اس پر حج فرض نہ ہوگا، کیونکہ حج کے واجب ہونے کے لیے وقت بھی شرط ہے۔ (زبدۃ المناسک ص۱۴، ۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سواری چلانے والے کے لیے مستقل سعی کی ضرورت نہیں

سوال: سوار ہونے والے اور سواری چلانے والے کی سعی ایک ساتھ ہو جاتی ہے یا سواری چلانے والے کو مستقل طور پر اپنی سعی کرنی ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سواری چلانے والے کی سعی بھی ادا ہو جائے گی، چاہے نیت کی ہو یا نہ کی ہو؛ البتہ نیت کر لینا سنت ہے۔ (زبدۃ المناسک ص۱۲۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

عمرہ کا احرام باندھتے ہی حیض آ گیا

سوال: ایک عورت ہندوستان سے عمرہ کا احرام باندھ کر چلی اور فوراً اسے حیض شروع ہو گیا، اور سات دن کی اس کی عادت ہے تو اب چونکہ وہاں پہنچ کر عمرہ کا طواف نہیں کرے گی اور دو تین دن کے بعد حج کا احرام باندھنے کا وقت آ گیا تو اب عورت کیا کرے گی؟

اور اگر حج کا احرام بھی اس نے وقت پر باندھ دیا اور حج کے سارے ارکان بھی پورے کر دیے تو اب سوال یہ ہے کہ طوافِ زیارت پہلے کرے یا عمرہ کا طواف کرے یا پھر ایک ہی طواف و سعی میں دونوں ادا ہو جائیں گے۔ مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسی عورت عمرہ کا احرام چھوڑ کر حج کا احرام باندھ لے۔ (اوجز المسالک ۸/۸۷)

عمرہ کا احرام چھوڑنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا سر کھول کر کنگھا کرے، یا ناخن تراش لے یا بال کترے۔ (شامی ۲/۴/۲۷)

اب چونکہ اس نے عمرہ کا احرام چھوڑا تھا؛ اس لیے حج کی ادائیگی سے فارغ ہو کر وہ اپنے اس عمرہ کی قضاء کرے گی اور اس پر دم بھی واجب ہوگا، ایک بکری یا بڑے جانور کا ساتواں حصہ بطور دم ذبح کرے۔ (شامی ۲/۴/۲۷، زبدۃ المناسک ۲/۳۳۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ

والدین نے حج نہ کیا ہو تو کیا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ حج کو جا سکتا ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

سوال: میاں بیوی دونوں پانچ سال سے الگ رہتے ہیں، اور بیوی کو ان کے والد صاحب نے ملکیت کے طور پر ان کے نام پر الگ پیسے دیے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ شوہر کی ساس سسر کہتے ہیں کہ تم حج کا فارم بھر دو، اور حج پڑھ لو، اور اتنے پیسے ہیں کہ حج آسانی سے ہو سکتا ہے، اور حج کا فارم وغیرہ بھی بھر دیا ہے، اور دیگر تمام کاراوائی بھی ہو چکی ہے۔ اب اصل بات یہ ہے کہ بیوی کے والد والدہ نے تو حج پڑھ لیا ہے، اور شوہر کے والد والدہ نے حج نہیں پڑھا اور بات ایسی بنی ہے کہ اگر شوہر بیوی کہ ساتھ حج کو جاتا ہے تو ماں باپ ناراض ہوتے ہیں اور ناراض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک حج نہیں پڑھا اور بیٹا حج کو جائے؟ یہ ظاہری وجہ ہے۔ اور گاؤں میں ایک عام ذہن بنا ہوا ہے کہ جب تک ماں باپ حج نہ پڑھیں وہاں تک اولاد حج کو نہیں جا سکتی، اور اس خیال میں عوام وخواص سب ہی مبتلا ہیں اور سب کا کہنا ہے کہ اگر تم حج کو چلے گئے اور حج پڑھ لیا تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا، اور شوہر کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان کو ساتھ میں حج پڑھائے اور

شوہر کی تو یہ دعاء ہے کہ اللہ تعالی والدین کو بھی حج نصیب فرمائے، اور اللہ تعالی جب بھی ان کے لیے حج میں جانا مقدر فرمائیں گے، وہ حسب استطاعت ان کے خرچ میں پوری مدد کرے گا۔ اور میاں بیوی جو حج میں جا رہے ہیں اس میں شوہر کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے وہ بیوی کی ملکیت ہے جس میں شوہر محرم بن کر ساتھ میں جا رہا ہے تو اس طرح ناراض کر کے حج کو جانے میں حج کے اندر کچھ خرابی آسکتی ہے؟ اور خواص وعوام کے اس طرح کہنے کی وجہ سے حج میں تاخیر کی جاسکتی ہے؟ کیا والدین کے حج کرنے کا انتظار کیا جاسکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بیوی ساس سسر سے معافی مانگنے جائے جو حقوق ادا نہیں ہوئے اس کی، اور ساس سسر معاف نہ کریں تو بیوی کے حج میں کوئی خرابی آسکتی ہے؟

برائے کرم ان سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں، بڑی احسان نوازی ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے جس کی فرضیت کے لیے شریعت مطہرہ کی طرف سے کچھ شرائط ضروری قرار دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک شرط استطاعت یعنی مالدار ہونا ہے، استطاعت سے مراد یہ ہے کہ زادِ راہ (توشہ) اور راحلہ (سواری) پر اس طرح قدرت ہو کہ وہ اس کا مالک ہو یا کرایہ پر لے کر قابض ہو، زادِ راہ اور سواری کا مالک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی حاجت سے زیادہ مال ہو، یعنی اس کے رہنے کا مکان، لباس، خادم، اور گھر کے اسباب کے سوا اس قدر سرمایہ ہو کہ سواری پر مکہ مکرمہ کو جائے اور واپس آئے۔ (عمدۃ الفقہ ۴/۳۳،۳۴)

حج فرض ہو جانے کے بعد اسی سال حج کرنا واجب ہے، بغیر عذر تاخیر کرنے سے گنہگار ہوگا۔ (انمول حج ص ۲۰)

اگر بیٹے میں حج کی فرضیت کی شرطیں پائی جاتی ہیں تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے چاہے اس کے ماں باپ نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ بیٹا جب تک کہ والد صاحب کو حج نہ کرائے اپنا حج بھی نہ کرے یہ شریعت کے خلاف اور غلط مشہور ہے۔ ''فتاوی محمودیہ'' سے ایک سوال جواب نقل کیا جا رہا ہے:

سوال: ایک شخص نے اپنی کمائی سے حج کے لیے روپیہ اکٹھا کیا اور وہ حج کو جانا چاہتا ہے؛ مگر لوگ کہتے ہیں پہلے والد کو حج کرانا چاہیے بعد میں خود کرے اب اس کو کیا کرنا چاہیے، جب کہ اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ والد کو بھی ساتھ لے جا سکے؟

جواب: اس کو خود اپنا حج کرنا چاہیے، پھر اگر کسی وقت وسعت ہو اور اپنے والد کو بھی حج کرا دے تو عین سعادت ہے۔ یہ بات کہ جب تک والد کو حج نہ کرائے اپنا حج بھی نہ کرے، شرعی مسئلہ نہیں، بلکہ بے علم عوام میں غلط مشہور ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۳/ ۱۷۸)

اِسی طرح ''آپ کے مسائل اور ان کا شرعی حل'' میں ہے۔ سوال: (۱) جو شخص غیر شادی شدہ ہو اور اس کے والدین زندہ ہوں، اور والدین نے حج نہیں کیا ہو اور یہ شخص حج کرنا چاہے تو کیا اس کا حج ہو سکتا ہے؟

(۲) اگر والدین اس کو حج پر جانے کی اجازت دیں تو کیا وہ حج کر سکتا ہے؟

جواب: اگر یہ شخص صاحب استطاعت ہو تو خواہ اس کے والدین نے حج نہ کیا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے اور حج فرض کے لیے والدین کی اجازت شرط نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا شرعی حل ۴/ ۳۷)

اِس لیے صورت مسئولہ میں بیوی صاحب استطاعت ہے اور اس پر حج فرض ہو چکا ہے، وہ اپنا فرض حج ادا کرنے کے لیے سفر میں اپنے شوہر کو بھی لے جا رہی ہے تو

شوہر کو بیوی کے ساتھ حج کے لیے جانے میں شرعاً کوئی حرج یا گناہ نہیں، چاہے شوہر کے ماں باپ نے حج نہ کیا ہو، لوگوں کا یہ سمجھنا کہ ماں باپ نے اگر حج نہیں کیا ہے اور بیٹا حج کر لے گا تو اس کا حج قبول نہیں ہوگا یہ سب غلط اور بے اصل ہے، اور لوگوں کے اس طرح کہنے سے حج میں تاخیر کرنے کی وجہ سے عورت گنہگار ہوگی، اگر اس کا شوہر ماں باپ کا خیال کر کے حج میں آنے کے لیے تیار نہ ہو تو عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دوسرے محرم رشتہ دار باپ، بھائی یا چچا یا ماموں میں سے کسی کو ساتھ لے جائے اور اپنا فرض حج ادا کرے، اور بیوی کو ایسا کرنے کے لیے شرعاً شوہر کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں اگر شوہر اجازت نہ بھی دے تب بھی عورت جا سکتی ہے، بیوی سفر حج سے پہلے ساس سسر سے معافی تلافی کے لیے جائے پھر بھی ساس سسر معاف نہ کریں تو اس سے بیوی کے حج میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۳/۶/۱۴۲۶ھ

کیا محرم کے لیے سلی ہوئی لنگی کا پہننا بلا کراہت جائز ہے؟

سوال: انوار مناسک ''ص ۲۱۰'' پر لکھا ہے۔ ''لہٰذا سلی ہوئی لنگی پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے''۔ نیز ص ۲۶۰ پر لکھا ہے ''لیکن سلی ہوئی لنگی کا پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے، اسی طرح احرام کی دو چادروں میں سے ایک کو لنگی کی طرح سل دیا جائے؛ تا کہ چلتے وقت ران اور ستر نہ کھلے تو بلا کراہت جائز اور درست ہے'' تو کیا احرام کی حالت میں لنگی پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننے کی ممانعت کے سلسلہ میں حضرات فقہاء

ایک ضابطہ اور اصول تحریر فرماتے ہیں۔ چناں چہ شامی میں ہے: وفی البحر عن مناسك ابن امیر حاج الحلبی: ان ضا بطه لبس کل شی ء معمول علی قدر البدن او بعضه بحیث یحیط به بخیا طة او تلزیق بعضه ببعض او غیرهما و یستمسك علیه بنفس لبس مثله الا المکعب. اه. قلت: فخرج ما خیط بعضه ببعض لا بحیث یحیط با لبدن مثل المرقعة فلا باس بلبسه کما قدمناه. (شامی کوئٹہ ۱۷۷/۲)

(ترجمہ): **''بحرالرائق'' میں ابن امیر حاج حلبی کی مناسک کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ اس کا اصول یہ ہے کہ جو لباس انسان کے تمام بدن یا بدن کے بعض حصے کے موافق بنایا گیا ہو اس طرح پر کہ وہ سلائی کے ذریعہ یا بعض حصوں کو بعض کے ساتھ چپکانے سے یا کسی اور طرح سے (مثلاً بنائی سے) کل بدن یا بدن کے بعض حصوں کو ڈھانپ لے اور وہ خود بخود جسم پر ٹھہرا رہے، ایسا لباس احرام کی حالت میں پہننا منع ہے سوائے مکعب کے، میں کہتا ہوں کہ اس حکم سے وہ کپڑا خارج ہے جس کا بعض حصہ بعض کے ساتھ اس طرح سلا ہوا ہو کہ وہ بدن یا اس کے کسی حصہ کی وضع پر نہ ہو، مثلاً پیوند لگا ہوا کپڑا کہ اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔**

یہی ضابطہ غنیۃ الناسک میں ص ۴۴ پر موجود ہے۔

چناں چہ اسی اصول کے ماتحت فقہاء ایسے آدمی کے لیے جس کے پاس اتنی بڑی چادر موجود نہیں، جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے؛ لیکن دو ٹکڑوں کو جوڑ کر اس چادر کو تیار کیا گیا ہے تو اگر چہ یہاں پر کپڑے کے دو ٹکڑوں کو جوڑنے کے لیے سلائی کی گئی ہے اور لغوی اعتبار سے یہ سلا ہوا کپڑا کہا جا سکتا ہے؛ لیکن چونکہ یہ سلائی آدمی کے بدن یا کسی عضو کے موافق نہیں کی گئی ہے؛ اس لیے اگر اس آدمی کے پاس پوری لمبی چادر نہیں ہے اس

کے لیے اس چادر کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ اگر پوری لمبی چادر موجود ہو جس کے ذریعہ جسم کو ڈھانپا جا سکتا ہے تو اس کا استعمال بہتر ہے۔ چناں چہ ''امداد الفتاوی'' میں ایک سوال کے اندر یہ پوچھا گیا ہے کہ کوئی ازار یا چادر جو کہ کم عرض ہونے کی وجہ سے احرام کی حالت میں دو پاٹ کر کے پہن لی جاوے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ تحریر فرماتے ہیں: ''گو افضل یہی ہے کہ اس میں بالکل سلائی نہ ہو؛ لیکن اگر دو پاٹوں کو جوڑنے کے لیے سلائی کی جاوے تب بھی جائز ہے'' (امداد الفتاوی ۲/۱۴۶)

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو سلا ہوا وہ لباس جس کو احرام کی حالت میں پہننے کی وجہ سے دم واجب ہوتا ہے، اس کے لیے تو وہی ضابطہ ہے جو جواب کے شروع میں بتلایا گیا؛ اس لیے اگر کوئی ایسا لباس جو بدن یا بدن کے کسی عضو کی ہیئت پر سلا یا بنایا نہیں گیا ہے؛ لیکن اس میں سلائی موجود ہے تو اس کے پہننے سے دم تو واجب نہیں ہوگا؛ مگر افضل اور بہتر یہی ہے کہ سلائی کسی شکل میں موجود نہ ہو جیسا کہ اوپر ''امداد الفتاوی'' کے جواب سے ظاہر ہے۔

رہا سلی ہوئی لنگی کا پہننا، تو اگر کسی آدمی کو ستر کھل جانے کا اندیشہ ہے اگر وہ اس سے حفاظت کی غرض سے سلی ہوئی لنگی استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے اجازت ہے ورنہ عام حالات میں محرم کا سلی ہوئی لنگی پہننا مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے؛ چنانچہ ''معلم الحجاج'' میں مسئلہ ہے: ''تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے، اگر کسی نے ستر عورت کی حفاظت کی وجہ سے سی لیا تو دم واجب نہ ہوگا''۔ (معلم الحجاج ص ۱۱۴)

''عمدۃ الفقہ'' میں ہے: (۷) چادر اور تہبند میں گرہ لگانا یعنی چادر یا تہبند کے ایک سرے کو دوسرے سرے کے ساتھ باندھنا یا کانٹے وسوئی و پن وغیرہ سے اٹکانا یا چادر و تہبند کو رسی و کمر بند وغیرہ سے باندھ لینا۔ (عمدۃ الفقہ مکروہات احرام ۴/ ۱۴۹)

''غنیۃ الناسک'' میں "فصل فی مکروھات الاحرام و محظورات التی لا جزاء فیھا سوی الکراھۃ" کے ماتحت لکھا ہے "وعقد الازار والرداء بان یربط طرف احد ھما بطرفہ الآخر (شرح) وان یخللہ بخلال او یشددہ بحبل ونحوہ" (٤٧)

صاحبِ ''انوارِ مناسک'' نے معلم الحجاج ص ۱۰۵ کی عبارت ذیل ''چادر لنگی اگر بیچ میں سے سلی ہوئی ہے تو جائز ہے؛ مگر افضل یہ ہے کہ احرام کا کپڑا بالکل سلا ہوا نہ ہو'' سے جو استدلال کیا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے، مسئلۂ بالا کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی لنگی کپڑے کے دو پاٹ کو جوڑ کر تیار کی ہو تو اس کو پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لنگی کے دو پلوں کو سیا گیا ہو تو وہ بھی بلا کراہت جائز ہے، اس مسئلہ کو صاحب ''معلم الحجاج'' نے ص ۱۱۴ پر مکروہات احرام کے عنوان کے ماتحت الگ سے بیان کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے: مسئلہ: تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے، اگر کسی نے سترِ عورت کی حفاظت کے لیے سی لیا تو دم واجب نہ ہوگا۔ (۱۱۴)؛ اس لیے سلی ہوئی لنگی کے متعلق علی الاطلاق یہ کہنا کہ اس کا حالتِ احرام میں پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے، صحیح نہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ املاہ: احمد خانپوری، ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

حجاج کرام کے لیے مرکنٹائل بینک کی اشیاء کا استعمال

سوال: بمبئی میں حجاج کرام کو حج میں جانے کی کاروائی کرنی ہوتی ہے اس مکمل کاروائی کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ مروج بینک (مرکنٹائل بینک) کی جو مقررہ رقم سعودی میں جا کر خرچ کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے اتنی رقم کا ڈرافٹ اس بینک کا لینا ہوتا ہے،

عام رواج میں اسی بینک کا ڈرافٹ لیتے ہیں، ویسے کسی دوسری بینک کا بھی ڈرافٹ اگر حاجی لے لیتا ہے تو بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اب یہ مرکنٹائل بینک حج کمیٹی کے دفتر کو اپنے برانچ کی طرف سے ایک ڈرم پانی کا، ایک چھوٹا سا کیٹ پاسپورٹ وغیرہ رکھنے کے لیے، ایک مصلی نماز پڑھنے کا، یہ اشیاء دیتی ہے کہ ہر حاجی کو بلا کسی استثناء کے بینک کی طرف سے یہ اشیاء دی جائیں تو حاجی نے چاہے کسی دوسرے بینک کا بھی ڈرافٹ لیا ہو، پھر بھی اس کو اور دوسرے حاجیوں کو جنھوں نے اس بینک کا ہی ڈرافٹ لیا ہے سب کو حج کمیٹی یہ اشیاء دیتی ہے، اور جس کو یہ اشیاء نہ لینی ہو اس کو اس کی قیمت ۵۶ (چھپن) روپیہ نقد دی جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ہر حاجی صاحبان کریں یا عدم ضرورت کی صورت میں نقد روپیے لے کر خود کے استعمال میں لانا چاہیے؟ یہ استعمال مباح ہے یا نہیں؟ اگر مباح نہیں ہے تو اس کا کیا مصرف کیا جائے؟ یہ چیزیں سود میں شمار ہوں گی؟ اور اس کا لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مرکنٹائل بینک بواسطۂ حج کمیٹی یہ اشیاء یا اس کی قیمت دیتی ہے وہ رقم کہاں سے لاتی ہے؟ اگر کسی مخصوص آدمی کی طرف سے حجاج کرام کو بطور ہدیہ یہ اشیاء دی جاتی ہیں تب تو اس کا استعمال مباح ہے، اور اگر بینک اپنی سودی آمدنی سے یہ دیتی ہے تو اس کا استعمال نہ کریں بلکہ قبول ہی نہ کریں، اس سلسلہ میں بینک کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم فرما کر حقیقت حال معلوم کی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

مناسک حج، رمی جمار، ذبح اور حلق میں ترتیب

سوال: حج کے دنوں میں یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲/ ذی الحجہ کو منی میں لاکھوں جانوروں کی

قربانی ہوتی ہے؛ مگر اس کے گوشت وغیرہ کا معقول انتظام نہ ہونے پر چند سال پہلے ان تمام جانوروں کا گوشت ضائع ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں سعودی حکومت نے ابھی چند سال ہوئے غریب ممالک میں پہونچانے کا انتظام کیا اور اس کے لیے منی میں ایک بڑا مذبحہ (SLAUGHTER HUOSE) بنا کر اس کی ساری ذمہ داری ایک مقامی کمپنی کے سپرد کی ہے، اس کمپنی کا طریقۂ کار یہ ہے کہ قربانی کرانے والے حضرات سے پیسے لے کر رسید دے دی جاتی ہے، جس میں قربانی، دم، صدقہ وغیرہ کی خانہ پُری کے ساتھ قربانی کرنے کا وقت بھی لکھ دیا جاتا ہے تاکہ جس قسم کی قربانی جس وقت کرانا چاہے وہ متعین ہو جائے، اس سلسلہ میں حنفی حاجی صاحبان ایک اندازہ لگاتے ہیں کہ اتنے بجے تک ہم رمی جمار سے فارغ ہو جائیں گے اس اندازے کے مطابق اپنی قربانی کرانے کی اجازت دے دیتے ہیں؛ مگر بعض مرتبہ رمی جمار میں گڑبڑ ہو جانے سے طے شدہ اندازے کے مطابق رمی جمار نہیں کر پاتے، حالانکہ احناف کے نزدیک حج میں ترتیب واجب ہے اس کے خلاف ہو جانے سے بطور کفارہ مزید ایک جانور کی قربانی ضروری ہو جاتی ہے، تو کیا ہزاروں حنفی حضرات ان لاکھوں کے اضافی اخراجات سے بچنے کے لیے اگر صاحبینؒ کے قول پر (ان کے یہاں ترتیب واجب نہیں) عمل کرلیں تو احناف کے یہاں کوئی گنجائش ہے؟ اس طرح ہر سال لاکھوں جانوروں کا گوشت بھی ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور حاجی صاحبان کے لیے اس بھیڑ میں سہولت ہو جائے گی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تمتع اور قران کرنے والے کے لیے رمی، ذبح اور حلق کے درمیان امام اعظمؒ کے قول پر جو مفتی بہ ہے ترتیب لازم ہے، اس کے ترک سے دم واجب ہوتا ہے، جب کہ

صاحبینؒ کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے اس کے ترک پر دم واجب نہیں۔

آج کل حجاج ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر اگر ترتیب قائم نہ رکھ سکیں تو صاحبینؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے، چھٹا فقہی اجتماع بمقام شیخ الھند ہال دیوبند منعقدہ ۲۶، ۲۷/ مارچ ۱۹۹۷ء (انمول حج ۱۱۵) اس فیصلہ کے متعلق مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں: آج کل بے پناہ ہجوم اور دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر سقوط ترتیب کے متعلق آپ کا اور دیوبند کے فقہی اجتماع کا فیصلہ غلط تو نہیں؛ مگر یہ عام فتویٰ نہیں ہوسکتا، معذورین کے لیے مخصوص ہونا چاہیے استطاعت ہوتے ہوئے دم دینے میں احتیاط ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے رسائل الارکان، ہدایہ اولین، فتح القدیر کی عبارت تحریر کرکے لکھا ہے کہ: حج عمر بھر میں ایک مرتبہ (بطور فرض) ادا کیا جاتا ہے؛ اس لیے اس طرح ادا ہونا چاہیے جو اس کا حق ہے، لہذا نوجوان، صحت منداور باہمت لوگ مفتیٰ بہ قول پر ہی عمل کرنے کی کوشش کریں، اور جو حضرات ضعیف، کمزور اور معذور ہوں اور وہ لوگ ہجوم اور اپنی معذوری کی وجہ سے مفتی بہ قول پر عمل کرنے سے قاصر ہوں، تو ایسے ضعیف اور معذور حضرات صاحبینؒ کے قول پر عمل کرلیں تو اس کی گنجائش ہے۔اھ۔ پوری تفصیل چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ (فتاوی رحیمیہ ۱۰/۱۸۴تا۱۹۰)

علاوہ ازیں اس مشکل کا ایک حل یہ بھی ہے کہ آدمی افراد کرلے، کیوں کہ مفرد پر قربانی واجب نہیں۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینار منعقدہ ۲۴ تا ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں حج وعمرہ سے متعلق جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں تجویز نمبر ۷ حسب ذیل ہے:

حنفیہ کے قول راجح کے مطابق ۱۰/ ذی الحجہ کے مناسک میں رمی، ذبح اور حلق کو

ترتیب کے ساتھ انجام دینا واجب ہے۔ اور صاحبینؒ اور اکثر فقہاء کے یہاں مسنون ہے جس کی خلاف ورزی سے دم واجب نہیں۔ حجاج کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ترتیب کی رعایت کو ملحوظ رکھیں، تاہم ازدحام اور موسم کی شدت اور مذبح کی دوری وغیرہ کی وجہ سے صاحبینؒ اور دیگر ائمہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے؛ لہٰذا اگر یہ مناسک ترتیب کے خلاف ہوں تو بھی دم واجب نہ ہوگا۔ (اہم فقہی فیصلے دسواں ایڈیشن ۱۱۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

طواف زیارت کیے بغیر وطن لوٹنے والا جرم کا تدارک نیا احرام باندھ کر کرے یا سابق احرام سے؟ صاحب فتاویٰ رحیمیہ کا تسامح

سوال: فتاوی رحیمیہ ۵/ ۲۲۷ سوال نمبر: ۱۵۱۸ میں ایک عورت کے متعلق سوال کیا گیا ہے، جو بیماری کی وجہ سے طواف زیارت نہ کرسکی، اور طواف زیارت کیے بغیر ہی وطن واپس لوٹی، کہ وہ طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ احرام باندھ کر جائے یا بغیر احرام باندھے؟ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اب اسے چاہیے کہ طواف زیارت ادا کرنے کے لیے عمرہ کا احرام باندھ کر جائے'' تو کیا اس کے لیے نیا احرام باندھ کر جانا ضروری ہے؟ یا اس کا پہلے والا احرام ابھی مکمل ختم نہیں ہوا بلکہ باقی ہے؛ اس لیے نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو شخص (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) طواف زیارت کیے بغیر اپنے وطن واپس آ گیا، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ واپس مکہ مکرمہ جا کر طواف زیارت ادا کرے، جب تک کہ طواف زیارت ادا نہیں کرے گا، اگر وہ مرد ہے تو اس کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا، اور اگر وہ عورت ہے تو اس کے ساتھ اس کے شوہر کا صحبت کرنا جائز نہیں،

طواف زیارت کی ادائیگی کے لیے جب وہ مکہ مکرمہ جائے گا تب اس کے لیے نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں، طواف زیارت نہ کرنے کی وجہ اس کا پہلے والا احرام ختم نہیں ہوا بلکہ باقی ہے اپنے اسی احرام کے ساتھ وہ مکہ مکرمہ جائے گا۔

چنانچہ "بدائع الصنائع" میں ہے: "واما حکمه اذا فات عن ایام النحر فهو انه لا یسقط بل یجب ان یاتی به لان سائر الاوقات وقته، بخلاف الوقوف بعرفة انه اذا فات عن وقته یسقط لانه موقت بوقت مخصوص ثم ان کان بمکة یاتی به باحرامه الاول لانه قائم اذ التحلل بالطواف ولم یوجد وعلیه لتاخیره عن ایام النحر دم عند ابی حنیفةؒ وان کان رجع الی اهله فعلیه ان یرجع الی مکة باحرامه الاول ولا یحتاج الی احرام جدید، وهو محرم عن النساء الی ان یعود فیطوف، وعلیه للتاخیر دم عند ابی حنیفة ولا یجزئ عن هذا الطواف بدنة لانه رکنه وارکان الحج لا یجزئ عنها البدل ولا یقوم غیرها مقامها بل یجب الاتیان بعینها کالوقوف بعرفة. (بدائع ۱۳۳/۲)

(ترجمہ) اور طواف زیارت کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ (اپنے مقررہ وقت یعنی) ایام نحر سے فوت ہو جائے تو وہ معاف نہیں ہوتا، بلکہ ضروری ہے کہ اس کو ادا کیا جائے؛ اس لیے کہ پوری زندگی اس کا وقت ہے، برخلاف وقوف عرفہ کے کہ اگر وہ اپنے وقت سے فوت ہو گیا تو وہ ساقط ہوئے گا؛ اس لیے کہ وہ مخصوص وقت کے ساتھ موقت ہے، پھر اگر وہ آدمی (جس کا طواف زیارت ایام نحر میں ادا نہیں ہو پایا ہے) مکہ مکرمہ ہی کے اندر موجود ہے تو وہ اپنے پہلے والے احرام ہی کے ذریعہ طواف کرے گا؛ اس لیے کہ جب تک طواف نہیں کیا ہے پہلے والا احرام موجود ہے اور طواف کو ایام نحر سے مؤخر کرنے کی وجہ سے امام

ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر ایک دم واجب ہے، اور اگر وہ اپنے گھر لوٹ چکا ہے تب بھی اس پر ضروری ہے کہ اپنے پہلے والے احرام کے ساتھ مکہ واپس جائے اور اس کو نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں ......الخ۔

''غنیۃ الناسک'' میں ہے ''ولو ترك طواف الزيارة كله او اكثره فهو محرم ابدا فی حق النساء حتى يطوف، فكلما جامع لزمه دم اذا تعدد المجلس الا ان يقصد الرفض فلا يلزمه بالثانى شى ء فعليه حتما ان يعود بذلك الاحرام ويطوف ولا يجزئ عنه البدل اصلا'' (غنية الناسك ١٤٦)

''معلم الحجاج'' میں ہے۔مسئلہ: اگر طواف زیارت کے چار چکر یا پورا طواف چھوڑ دیا تو ساری عمر عورت حلال نہ ہوگی، اور عورت کے حق میں احرام باقی رہے گا، اور اسی احرام سے آ کر طواف کرنا واجب ہوگا، بدل دینا کافی نہ ہوگا، جب ادا کرے گا اس وقت عورت حلال ہوگی اور اس حالت میں اگر جماع کر لے گا تو ہر جماع کے بدلہ میں مجلس مختلف ہونے کی صورت میں ایک دم واجب ہوگا۔(معلم الحجاج ۲۴۵،۲۴۶)

''زبدۃ المناسک'' میں ہے۔مسئلہ: اور اگر طواف زیارت کے چار شوط چھوڑ دیے جب تک ادا نہ کرے ساری عمر حقِ عورت میں احرام سے نہ نکلے گا اسی احرام سے آ کر ادا کرنا واجب ہوگا، دوسرے احرام کی ضرورت نہیں ہے اگر چہ میقات سے نکل گیا ہو، کیوں کہ جب مکہ معظّمہ کو عود کرے گا تو میقات سے گزرتے وقت کے لیے وہ پہلا احرام جو حق نساء میں باقی ہے وہی کافی ہے، طواف زیارت کا بدل دینا کافی نہیں ہوگا۔(زبدۃ المناسک ۲/۷۹)

عبارات بالا سے معلوم ہوا کہ اس عورت کے لیے طواف زیارت کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ جاتے وقت نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں، اس کا پہلے والا احرام جو ابھی

تک باقی ہے وہی اس کے لیے کافی ہے، اور اسی احرام کے ساتھ وہ مکہ مکرمہ لوٹے گی؛ اس لیے ''فتاوی رحیمیہ'' میں حضرت اقدس مفتی صاحبؒ نے نیا احرام باندھنے کا جو حکم لکھا ہے وہ حضرتؒ کا تسامح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: احمد خانپوری، ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

احرام کی حالت میں کیسا جوتا پہننا جائز ہے؟

سوال: حالت احرام میں کیسی چپل استعمال کی جائے؟ اس کے متعلق ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ عریضہ ارسال کر رہا ہوں امید کہ تفصیلی جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

(۱) اگر جوتا نہ ہو تو موزہ کو وسط قدم پر سے کاٹ کر پہنے۔ (زبدہ) اس طرح کہ پیر کی پشت کھلی رہے مع اوپر کے دونوں ٹخنوں کے۔ (ناقل) ضروری انتباہ...... اکثر عوام وخواص میں یہ مشہور ہے، کہ فقط پیر کی بیچ کی ہڈی کھلی رکھنا ضروری ہے، یہ بالکل غلط ہے؛ مگر وضو میں جو دو کعبین دھونے واجب ہیں ان کے اوپر سے لے کر پیر کی بیچ کی ہڈی سے بھی کچھ نیچے تک کاٹنا چاہیے، کہ اچھی طرح پیر کی ہڈی سے نیچے سے اوپر دونوں ٹخنوں تک مع اطراف پیر اور ایڑی کے موزہ وغیرہ سے خالی رہے، اور مثل جوتی کے رہ جائے۔ (ناقل)

''الذی فی الحدیث ویقطعهما حتی یکونااسفل من الکعب وهو افصح مما هذاابن کمال؛والمرادقطعهمابحیث یصیر الکعبان ومافوقهامن الساق مکشوفالا یقطع موضع الکعبین فقط کمالا یخفی'' (ردالمحتار ص:۲۲٤)

''ایضاًلو کان الکوش الهندی یستر العقب ومافوقه ممایحاذی الکعب

ینبغی ان لایجوزلبسه لانه لم یکن اسفل من الکعبین فی کل جانب وھو الظاھر من النص ولعله محل النص علی قطع الخفین حتی یکونا کالنعلین من جانب الموخر". (زبدة المناسك ص:۱۰٤)

(۲)"وعن ھذافسر الشارح رحمه الله تعالیٰ المکعب بالکوش الهندی؛ ولم یلتفت الی انه یستر العقب؛ فمافی ردالمحتار: والظاھر انه لایجوز ستر العقب. اھ. ویتفرع علی عدم جوازلبس الکوش الهندی ونحوه ممایستر العقب؛ لیس بظاھر؛ نعم لوکان الکوش الهندی یستر العقب ومافوقه مما یحاذی الکعب ینبغی ان لایجوزلبسه؛ لانه لم یکن اسفل من الکعبین فی کل جانب؛ وھوالظاھر من النص"۔(غنیة الناسك ص:۸۷باب الاحرام)

(۳)......احرام کی حالت میں پاؤں میں ہر اس جوتے کا پہننا جائز ہے، جس سے وسط قدم کی ابھری ہوئی ہڈی کھلی رہے، خواہ وہ چپل ہو یا سلیپر، یا ہندوستانی یا پاکستانی دیسی جوتا اور نیو کٹ وغیرہ۔(بحرالرائق ۲/۳۲۴، عمدۃ الفقہ ۴/۱۴۰، عمدۃ المناسک ص:۲۱۴)

(۴)......حاصل یہ کہ احرام کی حالت میں دونوں ٹخنے اور پیروں کے اوپر جہاں بال اگتے ہیں جو ابھرا ہوا حصہ ہے، اس کا کھلا رہنا ضروری ہے، پس احرام کی حالت میں مردوں کو بہتر تو ہوائی چپل پہننا ہے، اور اگر جوتا یا چپل ایسا ہو جو ٹخنوں اور مذکورہ پیروں کے بالائی حصہ کو نہ چھپاتا ہو، تو اس کا پہننا بھی درست ہے؛ البتہ اگر ایڑی، پنجہ انگلیاں چھپی رہیں، تو کوئی حرج نہیں۔(مسائل حج وعمرہ ص:۲۱۲)

ان عبارات میں سے بعض سے سمجھ میں آتا ہے کہ احرام کی حالت میں جوتے ایسے ہونے چاہیے جس میں ایڑی وغیرہ چھپی ہوئی ہوں، اور دوسرے حوالوں سے معلوم

ہوتا ہے کہ ایڑی وغیرہ کا چھپا رہنا ضروری نہیں۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی تفصیلی وضاحت فرمائیں کہ حرام کی حالت میں جوتا کس طرح کا ہونا چاہیے؟ کیا صرف قدم کے اوپر کا حصہ کھلا رکھنا کافی ہے یا ایڑی اور ٹخنہ کے نیچے تک کا سارا حصہ کھلا رکھنا ضروری ہے؟

بعض سنڈل اس قسم کی بنی ہوئی ہے کہ اوپر کی پشت تو کھلی ہوئی ہے؛ مگر پشت سے اوپر ایک پٹی ہے جو سنڈل کو پکڑ کر رکھتی ہے اور اس میں ایڑی بھی چھپی رہتی ہے، اس کا استعمال احرام کی حالت میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں پاؤں کی حفاظت کے لیے دو چیزیں استعمال کی جاتی تھیں: ایک کو خُف سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور دوسری کو نَعل سے۔ خف چمڑے یا اسی طرح کی چیز سے اس طرح بنا ہوا ہوتا تھا کہ وہ پاؤں کو دونوں ٹخنوں اور اوپر کے کچھ حصہ سمیت چھپا لیتا تھا، اور خف کو وہ حضرات پاؤں میں تنہا بھی پہن کر چلتے پھرتے تھے۔ دوسری کو نَعل سے تعبیر کیا جاتا تھا، ان کے یہاں نَعل کا اطلاق چپل پر ہوتا تھا، اور جس کو ہمارے یہاں جوتی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کو اہل عرب مدَاس سے تعبیر کرتے ہیں، اور عربی زبان کا لفظ حذاء اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے؛ لیکن وہ عرب میں رائج نہیں تھا، متأخرین اسی کو مکعب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ''ترمذی'' کی شرح ''معارف السنن'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''الخف فی الشرع اسم للمتخذمن الجلد أو نحوه الساتر لكعبين

فصاعداً متصلاً بالقدم من غير أن يشف، هذامايستفادمن مواضع من البحر الرائق وغيره وكان الخف كالنعل يمشون فيه .... والنعل عندهم ما يسميه أهل الهند"چپلی" ومايسمونه "جوتی" فهوالمداس (بالفتح) كما ذكره صاحب القاموس. وفيه هواسم لمايلبس فی الرجل اه قال الراقم وفی هذا المعنی حذاء عند هم قديما وحديثا ولم يكن رائجا فی العرب وقديسمی عندهم فی متأخريهم بالمكعب". (معارف السنن ۱/۳۳۳،۳۳٤)

حالت احرام میں محرم کے لباس کے سلسلہ میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: الاان يكون احدليست له نعلان فليلبس الخفين وليقطعهما ماأسفل من الكعبين. یعنی حالت احرام میں محرم کو چاہیے کہ خفین کا استعمال نہ کرے، البتہ اگر کسی محرم کے پاس نعلین (چپل) نہ ہوں تو خفین کو کعبین سے نیچے کاٹ کر استعمال کرسکتا ہے۔ عربی زبانی میں لفظ کعب دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ ابھری ہوئی ہڈی جو پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہے (جس کو اردو میں ٹخنہ کہتے ہیں)۔

(۲) اور وہ ابھری ہوئی ہڈی جو چپل کے تسمہ کے پاس پاؤں کی پشت پر ہے، اس ارشاد میں نبوی میں امام محمدؒ نے لفظ کعب کو اسی دوسرے معنی میں بر بنائے احتیاط لیا ہے۔

حضرت بنوریؒ تحریر فرماتے ہیں: ونسب الی محمدابن الحسن انه فسر الكعب بالعظم الذی فی وسط القدم المسمی عندالاطباء ب:"العظم الزودقی" وبعضهم جره الی غسل الرجلين أيضاًوهوخطأ،وانماالكعب عنده بذلك المعنی فی قطع الخفين للمحرم لاغير،وخلاصة مادارالبحث:ان لفظ

الكعب عند محمدؒ والاصمعیؒ فی اللغة يستعمل بالمعنيين: بمعنى العظم الناتی عند مفصل الساق والقدم، وبمعنى العظم عند معقد الشراك فأخذه محمدؒ بهذا المعنى فی المحرم لكونه احوط ومحمد حجة فی اللغة فلاعبرة بقول من لم يعرفه. وراجع العمدة.(٤/ ٢١ ٥)والفتح(٣/ ٣٢٠) للتفصيل (٦/ ٣٣٢)

مطلب کہ کعب کا جو مشہور مفہوم ہے، یعنی پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر دائیں بائیں جو ابھری ہوئی ہڈی ہے، اس کے ساتھ اس کا جو غیر معروف مفہوم اور معنی یعنی پاؤں کی پشت کا ابھرا ہوا حصہ، جس کا حاصل یہ ہوا کہ خفین یعنی چمڑے کے موزوں کو اس طرح کاٹ دیا جائے کہ یہ دونوں حصے کھلے رہیں؛ البتہ ان دونوں حصوں کے کھلے رہنے کے ساتھ ساتھ پاؤں کا پچھلا حصہ جس کو عربی میں لفظ عقب، اور اردو میں لفظ ایڑی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بھی کھلا رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ تو کتب فقہ کی عبارتوں سے اتنی بات تو واضح ہوتی ہے کہ قدم کی پشت کا اوپر والا حصہ (جو لفظ کعب کے ایک مفہوم کا مصداق ہے) اور دونوں ٹخنے اور ان کے محاذات کا پورا حصہ اور ان کے اوپر کا حصہ کھلا رہنا ضروری ہے، البتہ ایڑی کے متعلق بعض عبارتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کا کھلا رہنا ضروری نہیں، یعنی پاؤں کا پچھلا حصہ جو ٹخنوں سے نیچے ہے، اور ہندوستانی دیسی جوتا پہننے کی صورت میں وہ بھی کچھ چھپ جاتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے، البتہ آپ نے جس سنڈل کے متعلق دریافت کیا ہے کہ اس میں پشت تو کھلی رہتی ہے؛ مگر پشت سے اوپر ایک پٹی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی صراحت نظر سے نہیں گزری۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

كتاب الطلاق

''فارختی'' سے طلاق بائن واقع ہوگی

سوال: ہماری چالی میں ایک بھائی کے گھر میں گھریلو معاملات پر میاں بیوی میں جھگڑا ہوگیا، شوہر نے جھگڑے کے دوران بیوی کی زبان درازی سے غصے کے عالم میں تین سے زیادہ مرتبہ اپنی بیوی کو کہا میں نے تجھے ''فارختی'' دیا، میں نے تجھے فارختی دیا، میں نے تجھے فارختی دیا، ایسا مردوں اور عورتوں کی حاضری میں کہا۔ تو کیا اسلامی رو سے اس عورت کو فارختی ہوگئی؟ اگر اس عورت کو فارختی ہوگئی ہو اور دونوں میاں بیوی پھر سے ازدواجی زندگی گزارنا چاہیں تو کیا کرنا چاہیے؟

لہذا آپ سے ہماری عاجزانہ گزارش ہے کہ آپ اس مسئلہ پر دینی روشنی ڈال کر حل بتایئے اور تحریر کرکے دیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اس عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی۔ (شامی ۲/۵۰۴، فتاویٰ دارالعلوم مطبوعہ کراچی ۲/ ۶۱۹، فتاویٰ رحیمیہ ۲/۱۲۱) اب اگر وہ دونوں پھر سے ازدواجی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو پھر سے نکاح کرلیں، حلالہ کی ضرورت نہیں، چونکہ سابق شوہر ہی نکاح کرنا چاہتا ہے؛ اس لیے عدت کے اندر بھی کرسکتا ہے۔ (شامی ۲/۵۸۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم ذوی الحجۃ ۱۴۰۷ھ

سرکاری کارروائی نہ کرنے یا نکاح ثانی کرنے کی شرط پر طلاق دی تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) زید نے اپنی زوجہ سے کہا کہ میں تم کو تین طلاق دیتا ہوں بشرطیکہ آئندہ نہ تم کوئی کارروائی کرو، نہ میں کروں گا (کارروائی سے مراد سرکاری عدالت ہے)۔

(۲) بکر نے اپنی زوجہ سے کہا کہ میں تم کو اس شرط پر طلاق دیتا ہوں کہ تم آئندہ

کسی سے نکاح ثانی کرلو، (تا کہ در بدر بھٹکنے کا اتفاق نہ ہو)

دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں اور اگر ہوگی تو کونسی؟ دونوں صورتوں میں شرط و مشروط دونوں ایک دوسرے کے اوپر موقوف ہے، پہلی صورت میں شرط غیر محدود ہے لہذا اس کو تادم حیات مانا جاسکتا ہے تو تادم حیات وہ کس صورت میں ہوگی اور کہاں رہے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسئولہ دونوں صورتوں میں مسئلہ کی نوعیت یکساں ہے، یہ مسئلہ مشائخ احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے، بعض حضرات فوری طور پر وقوع طلاق کے قائل ہیں اور شرط کو لغو قرار دیتے ہیں، بعض حضرات صحت تعلیق کے قائل ہیں اور شوہر یا بیوی میں سے کسی ایک (جو پہلے وفات پا جائے) کے آخری لمحہ زندگی میں وقوع طلاق کے قائل ہیں، اور بعض حضرات اس کے بھی قائل ہیں کہ اگر بیوی قسمیہ طور پر اپنے اس ارادہ کا یقین دلا دے کہ میں معاملہ عدالت میں نہیں لے جاؤں گی یا دوسرا نکاح کرلوں گی تو طلاق واقع ہوگی، ورنہ نہیں۔ علامہ گازرونی نے پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے (شامی ٢/٥٣٦، فتاوی کاملیہ/ ٢٧)

علامہ رافعیؒ فرماتے ہیں: والاظهر ان التعليق صحيح، وتطلق في آخر جزء من حياتها، وهي على عصمته. قوی یہ ہے کہ تعلیق صحیح ہے اور عورت کے آخری لمحۂ حیات میں طلاق واقع ہوگی، اس وقت نکاح باقی ہے۔ (تقريرات الرافعي على الشامي ١/٢٢٣)

صورت مسئولہ میں پہلی صورت میں احتیاط یہ ہے کہ اس عورت کو چھوڑ دے، اور دوسری صورت میں اگر رکھنا چاہتا ہے تو درمیان عدت رجوع کر لے اور بعد انقضائے عدت تجدید نکاح کر لے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ١٣/ محرم الحرام ١٤٠٨ھ

میاں بیوی میں وقوع طلاق کا اختلاف ہو تو کس کی بات معتبر ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیان شرعِ متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ:

زید کی بیوی زینب ہے، باہم کشیدگی کے باعث اور زینب کے متعدد بار کے پیش ورفت پر عاجز آ کر یہ کہہ دیا: کہ اگر ایسا ہی رہا تو چھوڑ دوں گا، طلاق دے دوں گا، نہیں رکھوں گا، بعد اس کے وہ میکے گئی اس شرط پر کہ چار یوم بعد آپ خود آ جاؤں گی، بحسبِ وعدہ نہ آنے پر زید رخصت کرانے گیا تو بیوی زینب نے جواب دیا کہ تم نے ہم کو طلاق دیدی ان لفظوں کے ساتھ میں نے تجھ کو طلاق دے دی، طلاق دی، طلاق دی، بایں سبب زید حلفیہ کہنے کو تیار ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کہا ہے جیسے کہ تم کہہ رہی ہو، اور زینب بھی حلفیہ کہنے کو تیار ہے کہ ہم کو طلاق دے دیا ہے؛ تو جب حلفیہ بیان کے لیے دونوں تیار ہیں اس صورت میں زید کو قابل اعتبار مانا جائے یا زینب کو؟ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ آپس میں ہی سلجھ جائے کورٹ کی نظر نہ جائے۔ مہربانی فرما کر مفصل لکھئے کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس صورت میں عورت طلاق کا دعویٰ کرے اور شوہر طلاق سے منکر ہو تو دو گواہ عادل مسلمان، یعنی نمازی، پرہیزگار، فسق وفجور سے بچنے والوں کی گواہی سے طلاق ثابت ہوتی ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہر دو گواہ باہم متفق اللفظ والمعنیٰ گواہی دیویں، گواہوں کا اختلافِ بیان بھی موجب ردِ شہادت ہے، جیسا کہ گواہوں کا فاسق و بے نمازی ہونا موجبِ ردشہادت ہے۔

ولـزم فی الکل الخ لـفـظ اشهـد بقولها و العدالة لوجوبها الخ و ایـضاً فی الدر

المختار و کذا تجب مطابقة الشهادتین لفظا و معنیً الخ

پس صورت مسئولہ میں اور واقعۂ مذکورہ میں اگر دو گواہ مسلمان عادل بلا اختلاف بیان طلاق کی گواہی دیویں تو شرعاً طلاق واقع ہوتی ہے، اور تین طلاق کے ثابت ہونے کی صورت میں علاقہ نکاح مابین الزوجین منقطع ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم عزیز الفتاویٰ ۱/۵۳۳ مطبوعہ کراچی) اور گواہوں کے نہ ہونے یا ان کے عادل وثقہ نہ ہونے کی صورت میں شوہر کا انکار بحلف معتبر ہوگا، جیسا کہ قاعدۂ معروفہ حدیث شریف میں ہے "البینة علی المدعی و الیمین علی من انکر"، اور اس کی تصریح جملہ کتبِ فقہ میں ہے۔ (ایضاً ۱/۴۸۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ ربیع الآخر ۱۴۰۷ھ

"رمضان سے پہلے شادی نہ ہوئی تو وہ عورت میرے لیے حرام ہے" قسم کھانا

سوال: ایک شخص نے قسم کھائی اس بات پر کہ اس کی منگنی ایک عورت کے ساتھ ہو چکی تھی اور نکاح نہ ہوا تھا، پھر اس شخص نے چند لوگوں کی حاضری میں جذبات میں آ کر قسم کھائی کہ رمضان سے پہلے اس عورت کے ساتھ اگر میری شادی نہ ہوئی تو وہ عورت میرے لیے حرام۔ جب اس لڑکی کے والدین کو خبر ہوئی تو رمضان کے ایک دن پہلے شام کو پانچ چھ بجے صرف نکاح پڑھا دیا، اور رخصتی نہیں ہوئی اور رخصتی ایک سال کے بعد ہوئی تو وہ عورت اس لڑکے کے لیے حلال ہے یا حرام؟ مفصل حوالہ کے ساتھ برائے کرم جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں وہ عورت اس کے لیے حلال ہے اور یہ تعلیق صحیح نہیں۔

قال فی التنویر: (شرطه الملك) ...... (كقوله لمنكوحته) ...... (ان ذهبت فانت طالق، او الاضافة اليه) أو إن (نكحتك فانت طالق).

قال الشامی: (قوله او الاضافة الیه) بان یکون معلقا بالملک کما مثل وکقوله ان صرت زوجة لی او بسبب الملک کالنکاح ای التزوج الخ. (شامی ۲/ ۵۳۶، ۵۳۷) وفی الصورة المذکورة علق الطلاق بعدم التزوج. فافهم وتدبر. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۴/ ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ

دھمکی سمجھ کر شرطی طلاق سے طلاق کا وقوع

اردو میں لفظ ''طلاقیں'' کا اطلاق دو پر ہوتا ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں:

کہ زید نے ایک شخص عادل کے روبرو کہا کہ میں نے آج اپنے خسر کو ایک خط لکھا ہے، اگر اس کا جواب آج رات ۱۲/ بجے تک نہ ملا تو ان کی لڑکی کو طلاق نہیں بلکہ طلاقیں ہیں۔ شخص عادل نے کہا کہ: تم نے یہ بات بڑی خطرناک کہہ دی، اس کے بعد زید نے ایک مفتی صاحب سے کہا کہ: یہ بات میں نے دھمکی کے لیے کہی تھی، مفتی صاحب نے کہا کہ چاہے دھمکی کے لیے کہی ہو طلاق واقع ہو جائے گی۔ دو روز کے بعد زید نے شخص عادل سے کہا اچھا ہوا تم نے مجھے بچالیا، تو اس نے کہا کہ: تم کس طرح بچ سکتے ہو جب کہ رات کے ۱۲/ بجے تک تم کو کوئی جواب نہیں ملا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کے اس کلام سے اس کی بیوی کو طلاق ہوئی یا نہیں؟ اگر طلاق واقع ہوئی تو کتنی اور کیسی؟ اور اس کا کیا حکم ہے؟ جواب باصواب سے ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر زید نے فی الحقیقت یہ جملہ ''میں نے آج اپنے خسر کو ایک خط لکھا ہے اگر اس

کا جواب آج رات ۱۲/ بجے تک نہ ملا تو ان کی لڑکی کو طلاق نہیں بلکہ طلاقیں ہیں'' کہا ہے، تو گویا اس نے اپنی بیوی کی طلاق کو شرط پر معلق کیا، پھر جب زید کے خسر نے وقت معہود گزرنے تک جواب نہیں دیا تو شرط وجود میں آکر طلاقیں واقع ہو گئیں۔

اذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط. (عالمگیری ۱/۴۲۰)

اردو میں لفظ ''طلاقیں'' کا اطلاق کم از کم دو پر ہوتا ہے؛ اس لیے دو طلاقیں واقع ہوئی سمجھی جائیں گی، اور لفظ صریح ہونے کی وجہ سے دونوں رجعی شمار ہوں گی، عدت کے اندر زید رجوع کر سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۴/ شوال ۱۴۱۱ھ

ہوٹل، بھینس وغیرہ کے کاروبار سے متعلق مسائلِ شرکت، بیع، اجارہ وغیرہ

پالنے کے لیے دی گئی بکری میں شرکت کا حیلہ

سوال: مسئلہ کی صورت یہ ہے، مثلاً: زید بکر کو ایک بکری پالنے کے لیے دیتا ہے دراں حالیکہ بکری کی قیمت بھی اسی وقت دوسو روپیہ متعین کر دیتا ہے، اور اس میں شرط یہ ہوتی ہے کہ اس میں جو بھی منافع ہوگا اس منافع میں زید اور بکر نصف نصف حصہ دار ہوں گے، اب چند ایام کے بعد بکری بچہ دیتی ہے، اب اس وقت بکری کی قیمت پانچ سو روپیہ ہو جاتی ہے، اب بکری کی اصل قیمت دوسو روپیہ زید کو دے کر تین سو روپیہ میں نصف نصف زید اور بکر تقسیم کرتے ہیں، یہ تقسیم کرنا کیسا ہے جائز ہے یا نہیں؟

اور اسی طرح (مذکورہ بالا) شرط پر بکری وغیرہ کو پالنے کے لیے دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر نا جائز ہے تو اس کے جائز ہونے کے لیے کوئی حیلہ ہو تو تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ طریقہ درست نہیں ہے؛ البتہ نصف بکری زید بکر کو فروخت کر دے اور قیمت معاف کر دے تو وہ نصف کا شریک ہو جائے گا، نصف بکری اس کی ہوگی، اور دودھ، بکری، بچے سب نصفا نصفی ہوں گے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۶۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہوٹل کی شرکت کا ایک مسئلہ

سوال: زید اور عمر دو شریکوں نے مل کر اپنے اور دوسرے شریکوں کے پیسے سے تیس لاکھ میں ایک ہوٹل تیار کر کے ۱۴۰ میں سے ۴۰ حصہ نفع پر چلانا شروع کیا، ان دو چلانے والے شریکوں میں سے ایک کچھ ماہ ہوٹل چلانے میں شریک رہا، پھر وہ الگ ہو کر اپنا الگ کاروبار کرنے لگا، اور دوسرا چلانے والا شریک ہوٹل چلاتا رہا اور ۱۴۰ میں سے ۴۰ حصہ منافع لیتا رہا، پھر کچھ مدت کے بعد اس دوسرے چلانے والے شریک کی بھی اس

ہوٹل پر توجہ کم ہوگئی اور حاضری نہ دینے لگا تو سب شریکوں نے مل کر اس کو ہوٹل اجارہ پر دینے کے لیے تیار کیا، بالآخر وہ تیار ہوگیا اور ہوٹل بیس ہزار ماہانہ کرایہ پر دوسرے کو دے دی لیکن اس کرایہ میں سے چلانے والا شریک ۳۵۰۰ روپئے تنخواہ لیتا رہا حالانکہ دوسرے شرکاء اس پر رضامند نہیں تھے، پھر کچھ مدت کے بعد انھوں نے تنخواہ نہیں لی اب مدت اجارہ ختم ہوگئی ہے اور ہوٹل کو اڑتیس لاکھ میں فروخت کردیا ہے۔

(۱) اب سوال یہ ہے کہ ہوٹل چلانے والا جس نے کچھ مدت ہوٹل اجارہ پر دیدی تھی، کیا اس کو ہوٹل کی قیمت میں ہونے والے آٹھ لاکھ نفع میں سے چالیس حصہ نفع (ایک سو چالیس میں سے) لینے کا شرعاً حق ہے یا نہیں؟

(۲) ہوٹل کرایہ پر دینے کے بعد چلانے والے شریک نے ہر ماہ کچھ مدت تک جو تنخواہ وصول کی یہ تنخواہ لینا اس کا جائز ہے یا نہیں؟ عرفاً لوگ لیتے رہتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) ہوٹل چلانے والے شریک کو منافع میں ۱۴۰ حصوں میں سے ۴۰ حصے نفع زیادہ اس کے چلانے کی وجہ سے دیا جارہا تھا، اب جب کہ ہوٹل فروخت ہوا اور ہوٹل میں لگائی گئی رقم سے زیادہ رقم وصول ہونے کی وجہ سے آٹھ لاکھ روپیہ منافعہ ہوا ہے وہ چلانے کی وجہ سے نہیں ہوا ہے، اس چلانے والے شریک کو جو چالیس حصے نفع زیادہ تجویز کیا گیا تھا اس بنیاد پر اس رقم میں وہ زیادتی وصول نہیں کرسکتا؛ اس لیے کہ یہ رقم ہوٹل چلانے کے منافعہ کے طور پر نہیں حاصل ہوئی۔

(۲) جب ہوٹل کرایہ پر دے دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چلانے والے شریک نے کام بند کردیا گویا اب وہ ہوٹل چلا نہیں رہا ہے، جب یہ بات ہے تو چلانے کی

بنیاد پر نفع میں اس کا جو زیادہ حصہ رکھا گیا تھا اس کو پانے کا وہ حقدار نہیں، نہ ہی تنخواہ کا حقدار ہے؛ اس لیے اس کا تنخواہ لینا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ

شرکاء کی اجازت کے بغیر منافع کی رقم اپنے تصرف میں لانا درست نہیں

سوال: ہوٹل میں حاصل شدہ منافع جو ہزاروں کی رقم ہوتی ہے ذمہ دار شخص کے پاس رہتی ہے، وہ ذمہ دار اس کو فوراً تقسیم نہیں کرتا اور جب تک تقسیم نہیں کرتا تو اس رقم کو اپنے تصرف میں لاتا ہے، کبھی اس تصرف کی اجازت شرکاء سے لیتا ہے اور کبھی بلا اجازت کرتا ہے تو کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟

نوٹ: شرکاء کے درمیان پہلے سے تقسیم کا وقت مقرر ہوتا ہے اور تصرف کرنے والا (ذمہ دار) مقررہ وقت پر وہ رقم پیش بھی کر دیتا ہے، یعنی تقسیم سے پہلے یہ تصرف کرتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ذمہ دار یعنی ہوٹل چلانے والے کی حیثیت اجیر کی ہے یا مضارب کی، دونوں صورتوں میں وہ منافع والی رقم کو بلا اجازتِ شرکاء اپنے تصرف میں نہیں لاسکتا؛ اس لیے کہ وہ رقم اس کے پاس امانت ہے۔ کماھو مصرح فی کتب الحنفیة. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مشترکہ کاروبار سے بنائے ہوئے کارخانے، پلاٹس، زیورات کس کی ملک ہیں؟ شرکاء کی اجازت کے بغیر ہبہ

سوال: بکر کا اپنے بھائی سے ۱۹۸۲ء میں مشترکہ کاروبار کا معاہدہ ہوا تھا، ان دونوں کے مشترکہ کاروبار سے کاروبار کیا جائے گا، اور جب بھی تقسیم ہوگی ۹/ بھائیوں میں

مساوی طور سے تقسیم ہوگی، یعنی میرے دو بیٹے اور میرے بھائی کے ۷/ بیٹے، اس وقت میرے نصف حصے میں دو بیٹے، اور میرے بھائی کے نصف حصے میں ۷/ بیٹے، اس طرح تمام املاک ۹/ بھائیوں میں تقسیم ہوگی، حقیقۃً اس وقت میرا نقصان تھا پھر بھی میرے بھتیجوں کے کہنے پر میں نے اس معاہدے کو تسلیم کرلیا، مفتی اسمٰعیل نے اس بات کی تصدیق میرے دو بیٹوں کی موجودگی میں میری بیوی سے (جس وقت وہ انڈیا آئی تھی) کی تھی؛ لیکن اب میرے دو بھتیجے اس معاہدے سے انکار کررہے ہیں، اور مشترکہ کاروبار سے جو کمائی ہوئی اس سے ۱۰/ کارخانے اور دیگر پلاٹس خریدے، جو اپنی بیوی اور بیٹوں کے نام کرکے اسے اپنی ذاتی ملکیت بتارہے ہیں۔

نوٹ: ۱۹۸۲ء سے اس مشترکہ کاروبار میں میرے دو بیٹے بھی برابر کے شریک ہیں۔

(۱) مشترکہ کاروبار سے بنائے ہوئے تمام کارخانے، پلاٹس اور زیورات کس کے ہیں؟

(۲) کیا اکیلا فریق دوسرے فریق کی اجازت کے بغیر کوئی کارخانہ اپنے بیٹے کو ہبہ کرسکتا ہے جب کہ کاروبار مشترکہ ہو؟

(۳) کیا گمراہ کن احوال بیان کرکے نیز حقائق کی پردہ پوشی کرکے فتویٰ منگانا جائز ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب دیجیے۔

نوٹ: ابراھیم اور عبدالعزیز آپس میں متفق ہیں اس مضمون پر۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) مشترکہ کاروبار کی کمائی سے بنائے گئے کارخانے، پلاٹس اور زیورات اصل کاروبار کی طرح سب کی مشترکہ ملکیت سمجھے جائیں گے۔

(۲) مشترکہ چیز کے مالکین میں سے کوئی ایک وہ پوری چیز دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر ہبہ نہیں کرسکتا، البتہ اگر وہ قابلِ تقسیم ہے تو تقسیم کرکے اپنا حصہ الگ کروا کر بطورِ ہبہ قبضہ کے ساتھ دوسرے کو دے سکتا ہے۔

(۳) غلط حقائق پیش کرکے فتویٰ لینا جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

تجارت کو فروغ دینے کی ایک ناجائز اسکیم

سوال: ایک شخص اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے یہ صورت اختیار کرتا ہے، کہ ایک گھڑی کی قیمت سو روپیے ہے اور بازار میں بھی اسی قیمت پر ملتی ہے، اس کے واسطے پچاس ممبر بنائے گئے، دس دس روپے کی یہ اسکیم دس مہینہ چلائی جائے گی، پہلے مہینہ میں جس شخص کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا اس کو دس روپے میں گھڑی دے کر اس کا نام ممبری سے خارج کردیا جائے گا، اسی طرح نو ماہ تک جس کا نام آتا جائے گا اس کو گھڑی دے کر اس کا نام ممبری سے خارج کیا جاتا رہے گا، اور اس سے روپیے نہیں لیے جائیں گے، دسویں مہینہ اکتالیس اشخاص جو بچے ان کو ایک ایک گھڑی دے کر اسکیم ختم کردی جائے گی، اس صورت میں کسی کو دس روپیے میں کسی کو بیس روپے میں اور کسی کو چالیس روپے میں یہاں تک کہ کسی کو سو روپے میں گھڑی ملے گی؛ لیکن قرعہ اندازی ضروری ہوگی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا شرعاً یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم مفصل و مدلل جواب سے نوازیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں بیع صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ مجلسِ عقد میں ثمن کی تعیین نہیں

ہو پاتی۔ و جهالة الثمن تمنع صحة البيع. (بدائع الصنائع)

اسی لیے کوئی آدمی اس طرح کوئی چیز فروخت کرتا ہے کہ نقد لو تو اتنی قیمت، اور ادھار لو تو اتنی قیمت، یا ایک مہینہ کے وعدہ پر لو تو اتنی قیمت، اور دو مہینہ کے وعدہ پر لو تو اتنی قیمت، تو یہ بیع ناجائز ہے۔

رجل باع على أنه بالنقد كذا وبالنسيئة بكذا او إلى شهر بكذا أو إلى شهرين بكذا لم يجز، كذا في الخلاصة. (فتاویٰ عالمگیری ۳/۱۳۶)

البتہ اگر مجلس ہی میں یہ متعین ہو جائے کہ فلاں طریقہ پر لیتا ہوں اور متعاقدین اس پر راضی ہو جائیں تو جائز ہوگی۔

فاذا علم ورضى له جاز البيع لان المانع من الجواز هو الجهالة عند العقد وقد زالت فى المجلس. (بدائع الصنائع ۵/۱۵۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

چند شرائط پر ہوٹل چلانے دینے میں شرکت، مضاربت اور اجارہ کے امکانات

سوال: (۱) زید ایک زمین ایک ہزار روپئے میں خریدتا ہے، اس پر پانچ ہزار خرچ کر کے ایک ہوٹل تیار کرتا ہے اور بکر کو حسبِ ذیل شرائط پر چلانے کے لیے دیتا ہے:

شرط نمبر (۱): تم کو اس ہوٹل کے چلانے کے عوض ہوٹل کی ملک اور منافع میں ایک چوتھائی حصہ کا شریک بنایا جاتا ہے۔

شرط نمبر (۲): تمھارے حصہ کا نفع ہماری کل لاگت، یعنی زمین کی قیمت اور اوپر کی لاگت وصول ہونے کے بعد دیا جائے گا۔

شرط نمبر (۳): اس حصہ کے علاوہ تم کو ہر ماہ دوسو روپئے تنخواہ ملے گی جو ہماری رقم وصول ہونے کے بعد تم کو ملتی رہے گی۔

شرط نمبر (۴): اگر ہوٹل میں نقصان آیا تو اس نقصان میں بھی تم اپنے حصہ کے بقدر آج سے ہی شریک ہوں گے۔

(الف): سوال طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً درست ہے؟ بالفرض اگر صحیح نہیں تو کس علت کی بنیاد پر تا کہ اس علت کو دور کرنے کی کوشش کر کے صحیح کیا جا سکے۔

(ب): بکر کے لیے حصہ اور تنخواہ دونوں لینا صحیح ہے؟

(۲): زید نے عمارت کرایہ پر لے کر پانچ ہزار کی رقم لگا کر ایک ہوٹل بنایا اور بکر کو حسبِ ذیل شرائط پر چلانے کے لیے دیا:

شرط نمبر (۱): تم کو اس ہوٹل کے چلانے کے عوض ہوٹل کی ملک اور منافع میں ایک چوتھائی حصہ کا شریک بنایا جاتا ہے۔

شرط نمبر (۲): آج سے ہی تم ہوٹل کے نفع نقصان دونوں میں شریک ہو۔

شرط نمبر (۳): اس حصہ کے علاوہ تم کو ہر ماہ دوسو روپئے تنخواہ ملے گی جو ہماری رقم وصول ہونے کے بعد بھی تم کو ملتی رہے گی۔

شرط نمبر (۴): تمہارے حصہ کا نفع جس کے تم پہلے ہی روز سے شریک ہو، ہماری کل لاگت یعنی زمین کی قیمت اور اوپر کی لاگت وصول ہونے کے بعد تم کو دیا جائے گا۔

(الف): سوال طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً درست ہے؟ بالفرض اگر صحیح نہیں ہے تو کس علت کی بنیاد پر تا کہ اس علت کے دور کرنے کی کوشش کر کے صحیح کیا جا سکے۔

(ب): بکر کے لیے حصہ اور تنخواہ دونوں لینا صحیح ہے؟

(۳): ایک سات منزلہ عمارت ہے جس کی ہر منزل کا مالک الگ ہے؛ البتہ زمین تمام منزل والوں کی مشترک ہے جس کو آج کی اصطلاح میں پاٹنر شپ کہتے ہیں، زید

نے اس میں پورا گراؤنڈ فلور یعنی زمین والی عمارت پانچ ہزار میں خرید لی، اور اس پر پانچ ہزار روپئے خرچ کر کے ہوٹل تیار کیا، اور بکر کو حسبِ ذیل شرائط پر چلانے کے لیے دیتا ہے:

شرط نمبر (۱): تم کو اس ہوٹل چلانے کے عوض ہوٹل کی ملک اور منافع میں ایک چوتھائی حصہ کا شریک بنایا جاتا ہے۔

شرط نمبر (۲): تمہارے حصہ کا نفع ہماری کل لاگت یعنی زمین کی قیمت اور اوپر کی لاگت وصول ہونے کے بعد دیا جائے گا۔

شرط نمبر (۳): اس حصہ کے علاوہ تم کو ہر ماہ دوسو روپئے تنخواہ ملے گی جو ہماری رقم وصول ہونے کے بعد بھی تم کو ملتی رہے گی۔

شرط نمبر (۴): اگر ہوٹل میں نقصان آیا تو اس نقصان میں بھی تم اپنے حصہ کے بقدر آج سے ہی شریک ہوں گے۔

(الف): سوال طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً درست ہے؟ بالفرض اگر صحیح نہیں ہے تو کس علت کی بنیاد پر تاکہ اس علت کو دور کرنے کی کوشش کر کے صحیح کیا جا سکے۔

(ب): بکر کے لیے حصہ اور تنخواہ دونوں لینا صحیح ہے؟

دارالافتاء مدرسہ عربیہ دارالعلوم چھاپی، ضلع: بناس کانٹھا، شمالی گجرات

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورتِ مسئولہ میں اولاً یہ طے ہونا چاہیے کہ ہوٹل کے مالک زید نے ہوٹل چلانے والے بکر کے ساتھ جو معاملہ کیا ہے شرعاً اس کو کیا حیثیت دی جائے، اس نوع کے معاملات کو شرکت، مضاربت یا اجارہ میں سے کسی ایک صورت پر محمول کرنے کے امکانات پر غور کیا جا سکتا ہے، ہم ہر صورت پر الگ الگ کلام کریں گے۔

پہلی صورت شرکت کی ہے؛ چنانچہ اربابِ معاملہ بھی اس کو یہی عنوان دے رہے ہیں؛ لیکن شرعی حیثیت سے اس معاملہ کو شرکت قرار دینے میں کئی محذورات لازم آتے ہیں: شرکتِ عقود میں رأس المال کا از قبیلِ اثمان ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ شرکت کے شرائط جواز پر کلام کرتے ہوئے علامہ ابوبکر کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

منها: ان يكون رأس المال من الاثمان ا لمطلقة، وهي التي لا تتعين بالتعيين في المفاوضات على كل حال، وهي الدراهم والدنانير عنانا كانت الشركة او مفاوضة عند عامة العلماء، فلا تصح الشركة فى العروض. (بدائع الصنائع ٦/ ٥٩)

''درمختار'' میں ہے: (ولا تصح مفاوضة وعنان) ذكر فيهما المال والا فهما تقبل ووجوه (بغير النقدين والفلوس النافقة والتبر والنقرة) اي ذهب وفضة لم يضربا (ان جرى) مجرى النقود (التعامل بهما) والا فكعروض (وصحت بعرض) هو المتاع غير النقدين ويحرك. قاموس. (ان باع كل منهما نصف عرضه بنصف عرض الآخر ثم عقداها) مفاوضة او عنانا، وهذه حيلة لصحتها بالعروض وهذا ان تساويا قيمة وان تفاوتا باع صاحب الاقل بقدر ما تثبت به الشركة. ابن كمال. فقوله بنصف عرض الآخر اتفاقى. (درمختار)

(قوله بغير النقدين) فلا تصحان بالعرض ولا بالمكيل والموزون والعدد المتقارب قبل الخلط بجنسه، واما بعده فكذلك فى ظاهر الرواية فيكون المخلوط شركة ملك وهو قول الثانى، وقال محمد شركة عقد. واثر الخلاف يظهر فى استحقاق المشروط من الربح، واجمعوا انها عند اختلاف الجنس لا تنعقد. نهر. (شامی ٣/٣٧٢)

صورت مسئولہ میں ہوٹل کا مکان اور دیگر تمام ساز وسامان از قبیلِ اعیان ہے؛ اس لیے مالک کے ساتھ چلانے والے کا معاملہ شرکتِ عقد کا نہیں ہوتا؛ نیز ہوٹل چلانے والے کی طرف سے بطور رأس المال (اثمان کے علاوہ بھی) کوئی چیز پیش نہیں کی گئی کہ ہم بطورِ حیلہ بھی شرکت تجویز کرسکیں، پہلی شرط کے مطابق ہوٹل کے مالک کا صرف کہہ دینا کہ: اس ہوٹل کو چلانے کے عوض ہم ہوٹل کی ملک میں تمہیں شریک کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے بکر ہوٹل کی ملک میں شریک نہیں بن جاتا؛ اس لیے کہ ملک کے لیے سبب ملک کا ہونا ضروری ہے، یہاں سبب ملک کیا ہے؟ بیع تو ہے نہیں؛ اس لیے کہ بکر نے کوئی ثمن لینا اپنے ذمہ منظور نہیں کیا ہے اور ایجاب وقبول بھی پایا نہیں گیا، ہبہ بھی نہیں کہہ سکتے؛ اس لیے کہ اس صورت میں ہبۃ المشاع لازم آتا ہے جو درست نہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہوٹل چلانے کی محنت کا عوض ہے، تو گویا یہ اجرت ہوئی، تو اگر چہ ہوٹل کا ایک ربع اجرت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

کل مایصلح ثمنا اي بدلا فی البیع صلح اجرۃ لانھا ثمن المنفعۃ. (درمختار) (قولہ بدلا فی البیع) فدخل فیہ الاعیان فانھا تصلح بدلا فی المقایضۃ فتصلح اجرۃ. (شامی ۳/۵)

لیکن ہم نے اس معاملہ کو شرکت مانا ہے اجارہ نہیں، دوسری شرط میں ہوٹل چلانے والے کے حصۂ نفع کو زمین کی قیمت اور اوپر کی لاگت وصول ہونے کے بعد دینا قرار پایا ہے، اگر ہم اس کو شریک مانتے ہیں تو جب سے منافع شروع ہوں اسی وقت سے حصہ بھی ملنا چاہیے جیسا کہ چوتھی شرط میں نقصان میں اول روز سے شریک قرار دیا ہے۔ تیسری شرط میں اس کے لیے تنخواہ تجویز کی گئی ہے، یہ بھی عقد شرکت کے منافی شرط ہے۔

(وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لاحدهما) لقطع الشركة كما مر. (درمختار على هامش الشامى ۳/۳۷٦)

نیز بحیثیت شریک کے وہ بھی مالک ہے اور اس کے لیے تنخواہ تجویز کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی آدمی مستاجر بھی ہے، اور اجیر بھی، حالانکہ وہ جس چیز پر محنت کر رہا ہے اس میں اس کی بھی ملک ہے، تو اس کے لیے اجرت لینا جائز نہیں، ''ہدایہ'' میں ہے:

واذا كان الطعام بين رجلين فاستاجر احدهما صاحبه او حمار صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجر له...... ولان مامن جزء يحمله الا وهو شريك فيه فيكون عاملا لنفسه فلا يتحقق التسليم. (هدايه ۳/۳۰۷)

دوسری صورت مضاربت کی ہے تو اس میں بھی رأس المال کا از قبیل اثمان ہونا ضروری ہے جو صورت مسئولہ میں نہیں ہے۔

واما الذي يرجع الى رأس المال فانواع: (منها) ان يكون رأس المال من الدراهم أو الدنانير عند عامة العلماء فلاتجوز المضاربة بالعروض.

(بدائع الصنائع ٦/ ۸۲ كتاب المضاربة)

(وشرطها) امور سبعة: (كون رأس المال من الاثمان) كما مر فى الشركة. (درمختار) (قوله من الاثمان) اي الدراهم والدنانير، فلو من العروض فباعها مضاربة نقودا انقلبت مضاربة واستحق المشروط كما فى الجواهر.

(شامى ٤/ ٥٣٩)

البتہ اگر مالک نے چلانے والے سے یہ کہا کہ موجودہ سامان کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے تجارت کرو تو اس کو مضاربت پر محمول کرنا درست ہوگا؛ لیکن اس صورت میں

بھی ہوٹل کی ملک راس المال میں تو نہیں ہے؛ مگر منافع میں ایک چوتھائی کی شرکت کی شرط کی جاسکتی ہے، راس المال میں شرکت کو مشروط قرار دینے سے مضاربت فاسد ہوجاتی ہے۔

وفی المتن ایماء الی ان المشروط للمضارب انما یکون من الربح حتی لو شرط من راس المال او منه و من الربح فسدت كما فی الخزانة وعليه تعريف المضاربة. (تکملہ شامی ۲/۲۲۳)

اور جس وقت سے منافع کا تحقق ہوگا اسی وقت سے ایک چوتھائی اس کو ملے گا اور چوتھی شرط کے مطابق اس پر نقصان کی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے کہ عقدِ مضاربت میں نقصان اولاً منافع پر اور پھر راس المال پر عائد ہوتا ہے۔

''درمختار'' میں ہے: وماهلك من مال المضاربة يصرف الى الربح لانه بيع فان زاد الهالك على الربح لم يضمن ولو فاسدة من عمله لانه امين. (در مختار)

(قوله لانه امين) علة لعدم الضمان، ويقبل قوله فی الهلاك وان لم يعلم ذلك كما يقبل فی الوديعة. فتح. (تكملة الشامی ۲/۲۴۳)

نیز تیسری شرط کے مطابق چلانے والے کے لیے ماہانہ دوسو روپیہ کی تنخواہ تجویز کرنا درست نہیں ہے، اس کا حصہ منافع میں چوتھائی سے زیادہ رکھ سکتے ہیں۔

وفی البحر: الرابع: ان يكون الربح بينهما شائعا كالنصف والثلث لا سهما معينا يقطع الشركة، كمائة درهم او مع النصف عشرة. اه. ط. اي لاحتمال ان لا يحصل من الربح الا مقدار ما شرط له واذا انتفى الشركة فی الربح لا تتحقق المضاربة لانها جوزت بخلاف القياس بالنص بطريق الشركة فی الربح فيقتصر على مورد النص. (تكملة الشامی ۲/۲۲۲،۲۲۳)

تیسری صورت اجارہ کی ہے، صورتِ مسئولہ میں اس پر محمول کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے؛ اس لیے کہ اجارہ میں ایسی چیز کو اجرت کے طور پر مقرر کرنا جو اجیر کے عمل سے وجود میں آتی ہو درست نہیں ہے، قفیز طحان والی صورت ہو جاتی ہے۔

''ہدایہ'' میں ہے: (ومن دفع الی حائك غزلا لينسجه بالنصف فله اجر مثله وكذا اذا استاجر حمارا يحمل طعاما بقفيز منه فالاجارة فاسدة) لانه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير فى معنى قفيز الطحان، وقد نهى النبى ﷺ عنه وهو ان يستاجر ثورا ليطحن له حنطة بقفيز من دقيقه وهذا اصل كبير يعرف به فساد كثير من الاجارات لا سيما فى ديارنا، والمعنى فيه ان المستاجر عاجز عن تسليم الاجر وهو بعض المنسوج او المحمول اذ حصوله بفعل الاجير فلا يعد هو قادراً بقدرة غيره. (هدايه باب الاجارة الفاسدة ۳/۳۰۵، تكملة فتح القدير ۹/۱۰۸، ۱۰۹)

چونکہ صورتِ مسئولہ میں منافع جو چلانے والے کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں اس کے چوتھائی کو اجرت ٹھہرایا گیا ہے جو قفیز طحان کے حکم میں ہے؛ نیز اجارہ میں اجیر کو اجرت کا استحقاق حاصل ہونے کی بنیاد عمل و تسلیم نفس پر ہے، مالک کو اپنے ہوٹل میں نفع ہو یا نقصان اور ہوٹل میں تجارتی نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر نہیں ڈالی جا سکتی؛ اس لیے یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے دونوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اس معاملہ کو ختم کر کے اس سے باز آجائیں۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بکر کے لیے حصہ منافع اور تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ تو مندرجۂ بالا تفصیل سے یہ بھی واضح ہو چکا کہ جب یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہوا تو منافع میں حصہ لینے کی گنجائش نہیں رہی؛ اس لیے کہ منافع میں حصہ ملنا موقوف ہے

شرکت یا مضاربت کے صحیح ہونے پر، اور صورتِ مسئولہ میں دونوں میں سے کوئی صورت درست نہیں بنتی۔

چنانچہ شرکت کے متعلق درمختار میں ہے: (والربح فی الشرکة الفاسدة بقدر المال، ولا عبرة بشرط الفضل) فلو کل المال لاحدهما فللآخر اجر مثله کما لو دفع دابته لرجل لیؤجرها والاجر بینهما فالشرکة فاسدة والربح للمالك وللآخر اجر مثله. (درمختار)

(قوله والربح الخ) حاصل ان الشرکة الفاسدة اما بدون مال او به من الجانبین او من احدهما، فحکم الاولیٰ ان الربح فیها للعامل کما علمت، والثانیة بقدر المال ولم یذکر ان لاحدهم اجرا لانه لا اجر للشریك فی العمل بالمشترك کما ذکروه فی قفیز الطحان، والثالثة لرب المال وللآخر اجر مثله. (قوله فالشرکة فاسدة) لانه فی معنی بع منافع دابتی لیکون الاجر بیننا فیکون کله لصاحب الدابة لان العاقد عقد العقد علی ملك صاحبه بامره وللعاقد اجرة مثله لانه لم یرض ان یعمل مجانا. فتح. (شامی ۳/۳۸۳)

مضاربت کے متعلق درمختار میں اور تکملہ شامی میں ہے: (وکون الربح بینهما شائعا) فلو عین قدراً فسدت (وکون نصیب کل منهما معلوماً) عند العقد ومن شرطها کون نصیب المضارب من الربح حتی لو شرط له من راس المال او منه و من الربح فسدت. (درمختار)

(فلوعین قدراً فسدت) لقطعه الشرکة فی الربح واذا فسدت فله اجر مثله لا یجاوز عن المشروط عند ابی یوسف لرضاه به اذا کان المسمی

معلوماً، اما لو كان مجهولا كماهنا او لم يوجد ربح لا يقال رضى بالقدر المشروط زيادة عن حصته من الربح لانه لم يرض بها الا مع نصف الربح وهو معدوم فالمسمى غير معلوم فيجب اجر المثل بالغاً ما بلغ، وقد يجاب بان هذا العقد لما كان فاسدا كان ما سمى فيه محظورا فقطع النظر عما هو موجب المضاربة وعول على ماعين معه على انه اجر مثل فى اجارة لاموجب مضاربة. الى آخره (تكملة الشامى ۲/ ۲۲۳)

اس لیے صورتِ مسئولہ میں بکر ہر حال میں اجرت مثل کا حق دار ہے۔

(۲/۳): جواب نمبر (۱) میں جو تفصیل مذکور ہوئی ہے وہی حکم یہاں بھی ہے، عمارت کرایہ پر لی ہو یا سات منزلہ عمارت کا گراؤنڈ فلور خریدا ہو اس سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲/ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

ہوٹل تیار ہونے سے پہلے حصہ دار بنانا

سوال: (۴) زید نے ایک زمین ہوٹل کے لیے خرید کی یا کرایہ پر لی اور اپنے تخمینہ سے اس کو پچاس ہزار کی شمار کر کے اس میں حسبِ ذیل شرائط کے ساتھ حصہ دار بنائے:

شرط نمبر (۱): ہوٹل کا نظام میں خود سنبھالوں گا۔

شرط نمبر (۲): اس نظام کے سنبھالنے کے عوض ماہانہ دوسو روپیہ/۲۰۰ تنخواہ لوں گا۔

شرط نمبر (۳): تنخواہ کے علاوہ سنبھالنے کے عوض میں آج ہی سے اس کی ملک وکاروبار میں ایک چوتھائی نفع نقصان کا حصہ دار رہوں گا۔

شرط نمبر (۴): اس چوتھائی حصہ کے منافع پچاس ہزار لاگت وصول ہونے کے بعد لوں گا۔

نوٹ: پچاس ہزار تخمینہ سے کم میں ہوٹل تیار ہونے پر بقیہ رقم حصہ داروں کو حسبِ حصہ واپس کردی جاتی اور پچاس ہزار سے زائد لگنے پر حصہ داروں سے حسبِ حصہ مزید رقم لی جاتی ہے۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ (الف) اس طرح کاروبار کرنا صحیح ہے؟ بالفرض اگر صحیح نہیں ہے تو کس علت کی بنیاد پر؟ تاکہ اس علت کو دور کرنے کی کوشش کر کے صحیح کیا جاسکے۔

(ب): زید کے لیے تنخواہ اور حصہ دونوں بیک وقت لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۴) صورت مسئولہ میں ابھی تک ہوٹل تیار نہیں ہوا ہے، اس سے پہلے ہی حصہ دار بنائے جارہے ہیں، یعنی ان کو ہوٹل کا ایک مخصوص حصہ بیچ کر ملکیت میں شریک کیا جارہا ہے اس میں جہاں مبیع معدوم ہے دوسری طرف ثمن بھی مجہول ہے۔

''تنویر الابصار'' میں ہے: بطل بيع ما ليس بمال كالدم والميتة والى والبيع به والمعدوم كبيع حق التعلى. (تنوير الابصار)

آگے صاحبِ درمختار فرماتے ہیں: اى علو سقط لانه معدوم ومنه بيع اصله غائب كجزور ...... اوبعضه معدوم كورد وياسمين ورق فرصاد. (درمختار)

علامہ شامی فرماتے ہیں: (قوله كورد وياسمين) فانه يخرج بالتدريج. ط. (شامى ٤/ ١٣)

ظاہر ہے کہ جب کہ ابھی تک ہوٹل تیار ہوکر مکمل نہیں ہوا تو وہ بتدریج وجود میں آرہا ہے تو اس میں یہی علت پائی گئی؛ اس لیے یہ بیع معدوم ہونے کی وجہ سے باطل ہے،

اور بیع باطل کسی حال میں مفید ملک نہیں ہے۔

حکم الفاسد انه یفید الملك بالقبض والباطل لا یفیده اصلاً. (شامی ٤/١١)

جب حصہ داروں کی ملک ہی ثابت نہیں ہوئی تو آگے کی شرطوں پر تفصیلی کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی؛ نیز جواب ۱ر میں معاملہ کی اس نوعیت پر بھی کلام آچکا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

سوال: (۵) زید نے مع شرکاء رقم خرچ کرکے ایک ہوٹل تیار کیا اور بکر کو حسبِ ذیل شرائط پر چلانے کے لیے دیا:

شرط نمبر (۱): تم کو اس ہوٹل کے چلانے کے عوض ہوٹل کی ملک اور منافع میں ایک چوتھائی حصہ کا شریک بنایا جاتا ہے۔

شرط نمبر (۲): آج سے ہی تم ہوٹل کے نفع نقصان دونوں میں شریک ہو۔

شرط نمبر (۳): تمہارے حصہ کا نفع جس کے تم پہلے ہی روز سے شریک ہو ہماری کل لاگت، یعنی زمین کی قیمت اور اوپر کی لاگت وصول ہونے کے بعد تم کو دیا جائے گا۔

صورت مذکورہ میں بکر اس ہوٹل کو بجائے خود چلانے کے عمر کو ماہانہ تنخواہ اور سالانہ پانچ ہزار روپیہ کے معاوضہ میں چلانے پر دیتا ہے، اور نگرانی کرتا رہتا ہے، یہ سالانہ دی جانے والی رقم بکر اپنے جیب سے دیتا ہے اور کبھی اجتماعی منافع میں سے دیتا ہے اور اجتماعی منافع میں سے دینے کی صورت میں شرکاء کو بعض مرتبہ تو اطلاع ہوتی ہے اور شرکاء خاموش رہتے ہیں، کیوں کہ رقم والے حصہ دار بولنے سے ڈرتے ہیں، کہیں ہمارا حصہ نکال نہ دیا جائے، اور بعض مرتبہ بالکل ہی اطلاع نہیں ہوتی، اور زید اجتماعی منافع میں سے وہ رقم دیتا رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ: (الف) اس طرح معاملہ شرعاً درست ہے؟

(ب) بکر کا عمر کو اپنے جیب سے سالانہ رقم دے کر ہوٹل چلانے دینا صحیح ہے؟

(ج) بکر عمر کو شرکاء سے چھپا کر اجتماعی منافع میں سے سالانہ پانچ ہزار دیتا ہے جب کہ اس کا حصہ تو چلانے کی ذمہ داری کا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(د) بکر کا عمر کو شرکاء سے چھپا کر اجتماعی منافع میں سے سالانہ پانچ ہزار دینا کیسا ہے؟

(ھ) بکر عمر کو سالانہ رقم اجتماعی منافع میں سے اس طرح دیتا ہے، کہ شرکاء کو علم ہوتا ہے تو خاموش رہتے ہیں؛ لیکن دل سے ناراض رہتے ہیں، اس صورت میں بکر کا اس طرح کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۵) جیسا کہ جواب نمبر (۱) میں تفصیلی طور پر بتلایا گیا کہ زید اور بکر کے درمیان ہونے والا یہ معاملہ شرکت صحیحہ یا مضاربتِ صحیحہ یا اجارہ صحیحہ تینوں میں سے کسی پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ غیر درست اور فاسد ہے، معاملۂ فاسدہ میں شریک یا مضارب یا اجیر اگر کام کرتا ہے تو اجرت مثل کا حق دار ہوتا ہے مقررہ نفع یا تنخواہ کا نہیں۔ صورت مسئولہ میں بکر نے کوئی کام نہیں کیا ہے؛ اس لیے وہ اجرت مثل کا بھی حق دار نہیں، رہا عمر، تو اس کے ساتھ ہوٹل کے مالکوں نے کوئی معاملہ نہیں کیا ہے؛ اس لیے عمر کی اجرت کی ذمہ داری مالکین پر عائد نہیں ہوتی؛ البتہ وہ اپنی مقررہ اجرت بکر سے وصول کر لے اور بکر پر اس کی ادائیگی اپنی طرف سے ضروری ہے ہوٹل کے منافع سے دینا اس کے لیے جائز نہیں ہے اگر اس نے منافع ہوٹل میں سے دیا ہے تو ضامن ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہوٹل کا کنٹراکٹ

سوال: چار شرکاء نے ایک ہوٹل تیار کیا جس کو چاروں مل کر چلاتے ہیں یا کوئی

ایک چلاتا ہے، اور کچھ مدت کے بعد آپس میں جھگڑا ہوتا ہے تو سب مل کر طے کرتے ہیں کہ جو ماہانہ زیادہ رقم دے اس کو چلانے کے لیے کنٹراکٹ دیا جائے (کنٹراکٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ماہانہ طے شدہ منافع تمام شرکاء کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ اس کا) سوال یہ ہے کہ کسی ایک شریک کا دیگر شرکاء سے اس طرح کنٹراکٹ لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کنٹراکٹ کی مسئولہ صورت درست نہیں بلکہ اجارۂ فاسدہ ہے، اس صورت میں کنٹراکٹ لینے والا شریک منافع میں اپنے حصۂ ملک کے بقدر شریک وحقدار ہوگا؛ البتہ اگر ایسا کریں کہ چلانے کی وجہ سے اس کا حصۂ منافع شروع ہی سے زیادہ طے کر دیں مثلاً اس کی ملک تو ہوٹل میں چوتھائی ہے؛ لیکن اس کے لیے نفع میں تہائی تجویز کریں تو درست ہے۔

واذا كان الطعام بين رجلين فاستاجر احدهما صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجر له. الخ (هدايه ۳/۳۰۷)

(قوله و مع التفاضل فى المال دون الربح) اى بان يكون لاحدهما الف ولالآخر الفان مثلاً، واشترطا التساوى فى الربح وقوله وعكسه اى بان يتساوى المالان ويتفاضلا فى الربح لكن هذا مقيد بان يشترط الاكثر للعامل منهما او لاكثرهما عملاً، اما لو شرطاه للقاعد او لاقلهما عملاً فلا يجوز كما فى البحر عن الزيلعى و الكمال. قلت والظاهر ان هذا محمول على ما اذا كان العمل مشروطا على احدهما. (شامى ۳/۳۷۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲/ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

شرکاء میں سے کسی کا انتقال ہو تو بقیہ شرکاء کیا کریں؟

سوال: چار شرکاء میں سے ایک شریک کا انتقال ہو گیا اب......

(الف) اس کے حصہ کو وارثینِ مرحوم کی طرف کس طرح منتقل کیا جائے۔

(ب) اگر حیات شرکاء مرحوم کا حصہ شرکت سے نکالنا چاہتے ہیں تو شرعاً ایسا کر سکتے ہیں؟ اس کی شکل کیا ہو گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شرکاء میں سے ایک کے انتقال سے اس کے ساتھ جو شرکت عقد تھی وہ ختم ہو چکی، موجود شرکاء کی شرکت باقی ہے۔

(وتبطل الشركة) اى شركة (بموت احدهما) علم الآخر اولا لأنه عزل حكمي. (درمختار)

(قوله اى شركة العقد) اما شركة الملك فلا تبطل ...... فلو كانوا ثلاثة فمات احدهم حتى انفسخت فى حقه لا تنفسخ فى حق الباقين. (شامی ۳/۳۸٤)

جب مرنے والے شریک کے حق میں شرکت خود بخود ختم ہو چکی تو اب بقیہ شرکاء کے لیے ضروری ہو گیا کہ جب تک اس کا حصہ الگ نہ کر لیں اپنی تجارت آگے نہ بڑھائیں اس کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جو کتب فقہ میں کتاب القسمۃ میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہوٹل کنٹراکٹ پر دیتے وقت ڈپازٹ لی گئی اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: زید نے بکر کو اپنا ہوٹل کنٹراکٹ پر دیا اور بکر سے ڈپازٹ کی رقم پانچ ہزار وصول کی جو کنٹراکٹ پورا ہونے اور حساب کرنے کے وقت واپس کر دی جائے گی، سوال

طلب امر یہ ہے کہ:

(الف) زید کا کنٹراکٹ کی صورت میں بکر سے ڈپازٹ کی رقم لینا کیسا ہے؟

(ب) بکر کی اس رقم کی زید کے پاس کیا نوعیت ہوگی امانت، رہن یا اور کچھ؟

(ج) زید اس رقم کو اپنے کاروبار میں استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور استعمال کرنے کی صورت میں منافع کا مالک کون ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بکر جس کو زید نے ہوٹل کنٹراکٹ پر دیا ہے اگر اجنبی شخص ہے تو اس صورت میں:

(الف) ڈپازٹ کی رقم لینے کی گنجائش ہے۔

(ب) یہ رقم رہن سمجھی جائے گی۔

(ج) جب بحکمِ رہن ہے تو اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

ولو استأجر دارا او شيئا او اعطى بالاجر رهنا جاز. (عالمگیری ۵/۴۲۵)

چونکہ اجنبی کو ہوٹل کنٹراکٹ پر دینا بھی بحکمِ اجارہ ہے؛ اس لیے وہاں ڈپازٹ درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شرکاء کی اجازت سے اسٹاک کردہ خام مال کی زکوٰۃ ادا کرنا

سوال: ہوٹل کے کاروبار میں ہر وقت ہوٹل چلانے کے لیے دس ہزار روپیے کا خام مال، مثلاً: آٹا، تیل، شکر وغیرہ رکھنا پڑتا ہے جو حولانِ حول کے وقت بھی ہوتا ہے، تو کیا اس اسٹاک مال پر زکوٰۃ ہوگی؟ اگر واجب ہوگی تو اجتماعی منافع میں سے سب کی اجازت سے ادا کرنے پر ادا ہو جائے گی؟ یا ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

خام مال وہی ہے جو فروخت ہوتا ہے؛ اس لیے مال تجارت ہونے کی وجہ سے اس

پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؛ لیکن یہ حکم ہر اس شریک کے لیے ہے جو صاحبِ نصابِ شرعی ہو، جن شرکاء پر واجب ہے ان کی اجازت سے ان کی زکوٰۃ دیگر شریک نے ادا کر دی تو وہ درست ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۹/شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ

ہوٹل کے چلانے میں دوسرا کام نہ کرنے کی شرط

سوال: زید کو پانچواں حصہ منافع میں سے دے کر ہوٹل چلانے کی ذمہ داری اس شرط پر دی گئی کہ اس ہوٹل کے علاوہ اور دوسرے کسی کاروبار کی ذمہ داری تم نہیں لے سکتے؛ لیکن اس کے قبول کرنے کے باوجود وہ دوسری ذمہ داری لیتا ہے تو یہ کیسا ہے؟ آیا مذکورہ صورت میں زید اپنے پورے حصہ کا حق دار ہوگا؟

بعض مرتبہ مالک حضرات ذمہ دار کے ساتھ معاملہ کرتے وقت یہ شرط ذکر نہیں کرتے، کہ تم دوسری ذمہ داری نہیں لے سکتے، اور یہ ذمہ دار دوسری ذمہ داری لیتا ہے، تو شرعاً اس صورت میں ایسا کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور بعض مرتبہ ذمہ دار مالکوں سے واضح طور پر یہ بات کرتا ہے، کہ میں تمہارے ہوٹل چلانے کا ذمہ دار ہوں، چاہے میں اپنی ذات سے حاضر رہوں یا نہ رہوں، اس سے تم کو کوئی مطلب نہیں، اور پھر دوسری ذمہ داریاں لیتا ہے تو یہ کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید کو ہوٹل چلانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے، اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ فرنیچر اور مال وسامان واشیائے خوردنی وغیرہ کے ساتھ تیار کر کے اس کے حوالہ کیا گیا ہے، تو اس کا جواب تو تفصیل سے نمبر ۱ میں آچکا ہے [1]، اور اگر اس کا مطلب

[1] ص ۳۴۷ پر دیکھیے

یہ ہے کہ زید کو رقم دی گئی کہ وہ اس کے ذریعہ سے ہوٹل کا کاروبار کرے، اور جو منافع ہوں گے ان میں سے پانچواں حصہ زید کا ہے، تو یہ معاملہ مضاربت کا ہے، اس معاملۂ مضاربت میں مضارب پر ایک شرط عائد کی جارہی ہے، کہ وہ صرف ان حضرات کا کاروبار کرے، اور کوئی کاروبار اس زمانہ میں نہ کرے، تو اس سلسلہ میں کوئی صریح جزئیہ مجھے نہیں ملا؛ البتہ ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ایک اصول وضابطہ اس باب میں ذکر کیا گیا ہے، اس سے اس کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔

الباب السادس فيما يشترط على المضارب من الشروط: الاصل ان رب المال متى شرط على المضارب شرطا فى المضاربة ان كا ن شرطا لرب المال فيه فائدة، فانه يصح ويجب على المضارب مراعاته والوفاء به واذا لم يف به صار مخالفا وعاملا بغير امره، وان كان شرطا لا فائدة فيه لرب المال فانه لا يصح ويجعل كالمسكوت عنه كذا فى المحيط. ان خص له رب المال التصرف فى بلد بعينه او فى سلعة بعينها تتقيدبه ولم يجز له ان يتجاوز ذلك، وكذا ليس له ان يدفعه بضاعة الى من يخرجها من تلك البلدة، فان اخرج الى غير ذلك البلد فاشترىٰ ضمن وكان ذلك له وله ربحه وعليه وضيعته الخ .(فتاوىٰ عالمگیری ٤/ ٢٩٧)

''درمختار'' میں ہے: لان المضاربة تقبل التقييد المفيد ولو بعد العقد ما لم يصر المال عرضا لانه حينئذ لا يملك عزله فلا يملك تخصيصه كما سيجيء، قيدنا بالمفيد لان غير المفيد لايعتبر اصلا كنهيه عن بيع الحال، واما المفيد فى الجملة كسوق من مصر فان صرح بالنهي صح والا لا (فان فعل ضمن)

بالمخالفة (وكان ذلك الشراء له) (درمختار) (قوله الشراء له) وله ربحه وعليه خسرانه ولكن يتصدق بالربح عندهما وعند ابي يوسف يطيب له. (شامی ٤/ ٥٤٢)

صورتِ مسئولہ میں مالکین کی طرف سے لگائی گئی یہ شرط کہ ''اس کے ساتھ تم دوسرے کاروبار نہیں کر سکتے'' فی الجملہ مفید ہے؛ اس لیے اس صورت میں زید پر ضروری ہے کہ اس شرط کی پابندی کے ساتھ کاروبار کرے؛ لیکن اگر اس نے شرط کی پابندی نہیں کی تو اس کا حکم یہ ہے کہ زید اس رقم کا جو اس کو ہوٹل چلانے کے لیے دی گئی تھی ضامن ہے، چنانچہ وہ اتنی رقم مالکین کو ادا کرے، اور جو کچھ خریدا اور کاروبار کیا وہ سب زید کا ہے، اس میں نفع ہوا تو اس کا (سب کا) مالک بھی وہ ہے، اور نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے؛ البتہ اس کو چاہیے کہ اس منافع کو صدقہ کردے، یہ طرفین (امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ) کا مسلک ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کے لیے اس منافع سے انتفاع درست ہے، اگر مالکین نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تو اس صورت میں زید نے جس طرح ان حضرات کے ساتھ عقد مضاربت کیا ہے اسی طرح دیگر حضرات سے بھی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ دونوں کاروبار الگ الگ چلائے دونوں کو مخلوط نہیں کرسکتا، ہاں اگر دونوں عقد مضاربت کے مالکین حضرات نے اختیارِ کلی دیتے ہوئے اس کو اپنی صواب دید کے مطابق ہوٹل کا کاروبار چلانے کا مجاز بنادیا ہے، تو اس صورت میں مخلوط بھی کرسکتا ہے۔

ونوع لا يملكه بمطلق العقد ويملكه اذا قيل له اعمل برأيك، وهو ما يحتمل ان يلحق فيلحق به عند وجوه الدلالة، وذلك مثل دفع المال مضاربة او شركة الى غيره وخلط مال المضاربة بماله او بمال غيره. (عالمگیری ٤/ ٢٩٢، شامی ٤/ ٥٤١)

ہوٹل چلانے کا یہ معاملہ اگر بطریق مضاربت ہے، تو یہ صورت جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

بلیک (سیاہ) رقم کو سفید بنانے کی صورتوں کا حکم

سوال: آج کل سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کے لیے عام طور پر بڑے تاجر کاروبار کے منافع میں بہت تھوڑا سا حصہ پکے حساب میں ظاہر کرتے ہیں، اور زیادہ تر حصہ چھپاتے ہیں، تاکہ سرکار کو ٹیکس کم ادا کرنا پڑے، اس طرح کے چھپائے ہوئے حصے کو آج کل کی اصطلاح میں بلیک (سیاہ) رقم کہتے ہیں، جس کو دوسرے لفظوں میں غیر قانونی بھی کہہ سکتے ہیں، اور پکے حساب میں ظاہر کی ہوئی رقم کو وہائیٹ (سفید) رقم کہا جاتا ہے، اس طرح کی سیاہ رقم کو سفید رقم بنانے کی کچھ صورتیں بھی ہیں، جن کو کاروباری حضرات جانتے ہیں، ان میں سے ایک شکل بینک سے لون لینے کی ہے، جس میں سود بھی دینا پڑتا ہے؛ لیکن دِقّت کم ہوتی ہے، اور دیگر صورتوں میں بھی فی صد کچھ رقم تو دینی پڑتی ہے؛ لیکن دِقّت زیادہ ہوتی ہے۔

بینک سے لینے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ، مثلاً ایک لاکھ روپیے کا کاروبار کرنا ہے، اس کے پاس اتنی بلکہ اس سے زائد رقم موجود بھی ہے؛ لیکن سب قانونی نہیں ہے؛ اس لیے اس کو ظاہر نہیں کر سکتا؛ لہذا بینک سے رقم سود پر لیتا ہے، جس کو پھر وہ مع سود ادا کر دیتا ہے۔

اور بینک کے علاوہ قانونی بنانے کی شکل یہ ہے، کہ مثلاً ایک تاجر کے پاس سفید رقم کافی مقدار میں موجود ہے، اس سے قرض لیا جائے؛ لیکن اس صورت میں اس تاجر کو حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے؛ اس لیے یہ تاجر بھی اپنے مقروض سے فی صد کچھ رقم (سود) لیتا ہے، اور بعض بڑے تاجر تو اس کو مستقل کاروبار کے طور پر ہی کرتے ہیں۔

اب سوال طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں قسموں کی شکلوں میں سے شرعاً جائز کون

سی شکل ہے؟ بالفرض اگر دونوں کا حکم ایک ہی ہے تو بہتر کون سی شکل ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سیاہ رقم کو سفید بنانے کے لیے بینک سے یا کسی بڑے تاجر سے رقم قرض لینے کی صورت میں سود دینا پڑتا ہے، تو ٹیکس میں چوری کر کے جو رقم بچائی تھی وہ اس راہ سے گئی، فرق صرف اتنا ہے کہ سود والی صورت اپنی پسند فرمودہ اور اختیار کردہ ہے گویا اپنی مرضی سے سود دینے کے لیے آمادہ ہوا، اور ٹیکس والی صورت اضطراری یعنی غیر اختیاری ہے جس کی وجہ سے اس کا وبال خود پر نہیں پڑتا ہے، تو پھر رقم کو سیاہ اور سفید بنانے کا مکر کرنے کے بجائے شروع ہی سے سفید بنانے کی صورت کیوں نہ اختیار کی جائے؛ اس لیے آپ نے سفید بنانے کی جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں دونوں ہی ناجائز ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہوٹل میں بیع مرابحہ وتولیہ کی شکل میں شرکت

سوال: زید ایک ہوٹل دس ہزار روپیے میں خریدتا ہے اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے، تو یہ کہہ کر شریک کرتا ہے کہ:

(الف) میں نے یہ ہوٹل دس ہزار میں خریدا ہے؛ لیکن اس کو پندرہ ہزار کا قرار دے کر حصہ دار بنانا چاہتا ہوں، گویا اس ہوٹل کے سو حصے کرتا ہے تو ایک حصہ ایک سو پچاس (۱۵۰) کا پڑتا ہے، جو شخص جتنے چاہے حصے لے سکتا ہے۔

(ب) زید یہ نہیں کہتا کہ ہوٹل اس کو کتنے میں پڑا ہے، صرف یہ کہتا ہے کہ ایک حصہ ایک سو پچاس (۱۵۰) کا ہے، اور ایسے سو حصے ہیں حالاں کہ زید کو ایک حصہ سو میں پڑا ہے۔

(ج) زید کو یہ ہوٹل دس ہزار میں پڑا ہے؛ لیکن غلط بیانی سے کام لے کر یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ ہوٹل پندرہ ہزار میں پڑا ہے، اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں صورتوں کا شرعاً جو حکم ہو بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف): یہ بیع مرابحہ ہے جو جائز ہے۔ وشرعاً: بیع مالملکه بما قام علیه وبفضل. (تنویر الابصارمتن در مختار علی هامش رد المحتار ٤/ ١٧٠، ١٧١)

(ب): یہ بھی جائز ہے اس کو فقہاء کی اصطلاح میں بیع مساومہ کہتے ہیں۔ (قوله ولم یذکر المساومة) هی البیع بأي ثمن کان من غیر نظر الی الثمن الاول وهی المعتادة. (شامی ٤/ ١٧٠)

وان اعتبر من حیث تعلقه بالثمن او بمقدار فهو اربعة ایضا. لانه ان کان بمثل الثمن الاول مع زیادة فمرابحة، او بدون زیادة فتولیة، او انقص من الثمن فوضیعة، او بدون زیادة ولا نقص فمساومة، وزاد فی البحر خامسا وهو الاشتراك ای ان یشرك غیره فیما اشتراه ای بان یبیعه نصفه مثلاً، وترکه الشارح لانه غیر خارج عن الاربعة. (شامی ٤/ ٣) قوله (قوله بدون زیادة ولا نقص فمساومة) ای بدون نظر لزیادة ولانقص لمایأتی ان المساومة هی البیع بأي ثمن کان من غیر نظر الی الثمن ا لاول. (تقریرات الرافعي علی الشامي ٢/ ١١٠)

(ج) اس طرح کرنا جائز نہیں ہے، اب اگر اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا کہ مجھے جتنے میں پڑا ہے، اس حساب سے میں شریک کرتا ہوں، تو یہ بیع تولیہ ہوگی جس کا حکم یہ ہے کہ اس میں خیانت ثابت ہو جانے پر مشتری (خریدنے والا) اس مقدار خیانت کو ثمن میں سے کاٹ لے گا، اور اس نے صرف اتنا کہا کہ یہ ہوٹل مجھے پندرہ ہزار میں پڑا ہے، (حالانکہ دس ہزار میں پڑا تھا) اور میں اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن ساتھ میں یہ جملہ ”جتنے

میں مجھے پڑا اسی حساب سے شریک کرتا ہوں'' نہیں کہا ہے تو اس صورت میں مشتری (خریدار) کو جب خیانت کا علم ہو اس کو اختیار ہے کہ اس بیع کو فسخ کر دے، البتہ قیمت کم نہیں کر سکتا یعنی مقدار خیانت کو ثمن میں سے کاٹ نہیں سکتا۔

وان خان فی المرابحة فهو بالخيار ان شاء اخذ بكل الثمن وان شاء ترك، وان خان فی التولية حطها من الثمن. (عالمگیری ۱۶۲/۳)

(فان ظهر خيانته فی مرابحة باقراره او برهان) على ذلك او(بنكوله عن اليمين (اخذه) المشتري (بكل ثمنه او رده) لفوات الرضاء، (وله الحط) قدر الخيانة (فی التولية) لتحقق التولية. (درمختار علی هامش الشامی ۱۷۴/۴)

وقوله وحط اي اسقط قدر الخيانة من المسمیٰ وفی السراج الوهاج، وصورة الخيانة فی التولية اذا اشتری ثوبا بتسعة وقبضه ثم قال لآخر اشتريته بعشرة ووليتك بما اشتريته فاطلع على ذلك. اه. .... وقدمنا انه اذا اشتریٰ متاعاً و رقمه باكثر من ثمنه وباعه مرابحة على الرقم فانه يجوز وقيده فی المحيط بما اذا كان عند البائع أن المشتري يعلم أن الرقم غير الثمن، فاما اذا كان المشتری يعلم ان الرقم والثمن سواء فانه يكون خيانة وله الخيار. كذا فی المحيط. (البحر الرائق ۱۲۰/۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۴/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

منافع والی رقم میں تصرف کرنے میں شرکاء کی اجازت میں تفصیل اور اس میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: زید ایک مشترک ہوٹل کا ذمہ دار ہے، سالانہ اس کو پچیس ہزار کی رقم منافع

میں حاصل ہوتی ہے، جس میں وہ صرف بیس ہزار کی رقم اپنے تصرف میں لاتا ہے، بعض مرتبہ ذمہ دار شرکاء کو اس کی اطلاع کرتا ہے اور بعض مرتبہ بلا اطلاع ہی ایسا کرتا ہے، نیز اطلاع دینے پر شرکاء بعض مرتبہ دل سے اجازت دیتے ہیں اور بعض مرتبہ مصلحۃً دل نہ چاہتے ہوئے اجازت دیتے ہیں یا محض خاموشی سے کام لیتے ہیں، ان تمام صورتوں کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز ان سب صورتوں میں اس رقم کی زکوۃ کس پر واجب ہوگی؟ اور کس طرح ادا کی جائے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر شرکاء کی اجازت سے تصرف کیا ہے تو درست، اور اس سے حاصل شدہ منافع بھی حلال ہیں، ورنہ نہیں۔

(فان فعل ضمن) بالمخالفة (وكان ذلك الشراء له). (قوله الشراء له) وله ربحه وعليه خسرانه ولكن يتصدق بالربح عندهما وعند ابى يوسف يطيب له اصله المودع اذا تصرف فيها وربح. اتقانی. (شامی ٤/ ٥٤٢)

جو اجازت دل سے نہیں دی گئی ہے وہ معتبر نہیں ہے۔ قال رسول الله ﷺ الا لاتظلموا الالايحل مال امرء الابطيب نفس منه . (مشکوٰۃ ٢٥٥) جب دل سے نہ دی گئی اجازت کا یہ حال ہے، تو خاموشی کی صورت میں کیسے جائز ہوگا۔

رہی زکوۃ تو وہ بقدر حصص نفع ہر ایک شریک پر واجب ہوگی، بشرطیکہ دیگر شرائط اس میں موجود ہوں۔

فتجب زكاتها اذا تم نصابا وحال الحول لكن لا فوراً بل عند قبض اربعين درهما من الدين القوي كقرض. (درمختار)

جب وہ رقم ان کے پاس آجاوے اس وقت زکوٰۃ ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال: ہوٹل کا ذمہ دار شخص ہوٹل میں مہمانوں کو مفت کھانا کھلاتا ہے اور چندہ والوں کو للہ کے مد سے چندہ دیتا ہے، مذکورہ چیزیں کبھی شرکاء کی اجازت سے دیتا ہے اور کبھی بلا اجازت، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شرکاء کی اجازت سے ہے تو درست ہے، اور اگر بلا اجازت ہے تو وہ خود ذمہ دار ہے یعنی اس پر ضمان واجب ہے۔

والاصل ان التصرفات فی المضاربة ثلاثة اقسام: قسم هو من باب المضاربة وتوابعها فيملكه من غيران يقول له اعمل ما بدا لك كالتوكيل بالبيع والشراء. الخ. (شامی ٤/ ٥٤١) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۹/ محرام الحرام ۱۴۰۹ھ

شریک چور کو اس کے حصہ سے زائد رقم دے کر علیحدہ کرنے کی صورت میں زائد رقم کا شرکاء میں سے کون ذمہ دار ہوگا؟

سوال: (۱) زید اور عمر دونوں نے مل کر ایک دکان خریدی، اور اس میں تقریباً پندرہ شرکاء کو کم وبیش حصوں کے ساتھ شریک کیا، پھر سب نے مل کر زید کو ذمہ دار بنا دیا۔

اب کچھ عرصہ کے بعد عمر چوری کرنے میں پکڑا گیا، زید نے اپنے شرکاء میں جو زیادہ حصوں کے مالک تھے، ان سے مشورہ لے کر (معمولاً اس سے پہلے بھی دکان کے متعلق اہم کام میں جن سے مشورہ کیا کرتا تھا) عمر کو نکال دیا، اب عمر یہ کہتا ہے کہ میرے حصہ کی رقم پانچ لاکھ روپئے ہیں، اب آپ مجھے ساڑے سات لاکھ (ڈھائی لاکھ زیادہ) دو گے تو ہی

میں نکلوں گا، ورنہ میں نہیں نکلوں گا اس لیے کہ میں نے بھی دکان میں محنت کی ہے، اب عمر کے نہ نکلنے پر اور زیادہ چوری اور خسارے کا پختہ یقین ہے، تو زید نے زیادہ رقم مشورہ سے دے کر اسے نکال دیا (اس لیے کہ عمر نے دکان جمانے میں کافی محنت بھی کی تھی)۔

اب سوال یہ ہے کہ از روئے شرع زیادہ دی ہوئی رقم کے نقصان پر تمام شرکاء حصہ دار ہوں گے یا نہیں؟ زیادہ شرکاء کا کہنا ہے کہ اچھا ہوا نکال دیا، جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ نقصان ہمیں نہیں ملنا چاہیے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورت مسؤلہ میں اگر مستقبل میں عمر کی خیانت کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا غالب گمان، بلکہ یقین ہو، اور قانونی اعتبار سے عمر کو شرکت سے الگ کرنا اس کی رضا مندی کے بغیر ممکن نہیں، اور عمر نے علیحدگی کے لیے اپنی رضا مندی کو مزید ڈھائی لاکھ وصول کرنے پر موقوف رکھا ہے، اس لیے بدرجۂ مجبوری دکان کو مستقبل میں پیش آنے والے نقصان سے بچانے کے لیے زید نے عمر کو ڈھائی لاکھ روپئے مزید دے کر اس کو الگ کیا ہے، تو یہ رقم تمام شرکاء پر بقدر حصص تقسیم ہوگی گویا کہ یہ تمام نقصان تمام کو بھگتنا ہوگا؛ البتہ عمر کے حق میں یہ رقم لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

درمختار میں ہے: وفي الإختيار دفع المضارب شيئا للعاشر ليكف عنه ضمن، لانه ليس من امور التجارة لكن صرح فى مجمع الفتاوى بعدم الضمان فى زماننا، قال الوصى لانهمايقصدان الاصلاح. (درمختار)

علامہ شامیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قوله: لكن صرح فى مجمع الفتاوى) نقل فى المنح عنه مانصه، قال الشيخ الامام الاجل وكان

شيخنا يقول: الجواب في زماننا بخلاف هذا ولاضمان على المضارب فيما يعطى من مال المضاربة لسلطان طمع فيه وقصدأخذه بطريق الغصب، وكذا الوصى اذا صانع فى مال اليتيم لأنهمايقصد ان الاصلاح بهذه المصانعة، فلو لم يفعل أخذ المصانع جميع المال فدفع البعض لإحرازمابقى من جملة الحفظ في زماننا، والامين فيمايرجع الى الحفظ لايكون ضامنا فأما فى زمانهم فكانت القوة لسلاطين العدل. انتهى. مختصرا. ويؤخذمن هذا انه اذا دفع من مال نفسه يكون متبرعاً فيضيع عليه مادفع الا اذا أشهد عند الدفع انه يرجع ويحرر، قال الرحمتى لايضمن فى زماننا لغلبة أهل الظلم والرشوة اذا كانت لدفع الضرر عن نفسه، وعن رب المال كانت جائزة للدافع ماذونا فيها عادة من المالك وان حرمت على الآخذ.انتهى. (قوله لانهمايقصدان الاصلاح) أى فى هذه الرشوة فدفع البعض لاحرازمابقى من جملة الحفظ والأمين فيما يرجع للحفظ لايكون ضامنا.منح.(تكملة رد المحتارمع الدر المختار ۲/ ۲۵۳،۲۵٤)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. أملاہ:العبداحمدعفی عنہ خانپوری

۶/صفرالمظفر ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ　　　الجواب صحیح:عبدالقیوم راجکوٹی

مضارب کومعاملۂ مضاربت سےمعزول کرکےملازم بنانا

سوال:(۲) صورت مسئولہ میں ایک بات اور پوچھنی ہے، وہ یہ ہے کہ: زید کاروبار میں پہلے مضارب تھا، جب چوری کاواقعہ ہوا،اس وقت سب شرکاء نےمل کرا سے ملازم بنادیا تھا،تواس صورت میں شرعاً کوئی فرق ہوگا؟

(۳) سب شرکاء نے مل کر زید کو مضارب بنایا تھا اب کاروبار چالو ہونے کی ہی حالت میں سب نے مل کر زبانی طور پر زید کو مضاربت سے ختم کر کے ملازم بنادیا، تو اس طریقہ سے مضاربت ختم ہوسکتی ہے؟ اب اگر ختم نہیں ہوئی تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲) کاروبار کو مستقبل میں پیش آنے والے نقصان سے بچانے کے لیے زید نے عمر کو جو رقم دی، وہ تمام شرکاء کو بقدر حصص تقسیم ہونے کی بنیاد مضارب کی امین والی حیثیت ہے، جیسا کہ پہلے دیئے گئے جواب میں منقول عبارتوں میں اس کی صراحت ہے، زید کو اگر بحیثیت ملازم کاروبار کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اس صورت میں بھی اس کی حیثیت اجیر خاص ہونے کی وجہ سے امین ہی کی ہے، اس لیے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

(۳) اگر ارباب اموال مضارب کو دوران مضاربت معزول کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں؛ لیکن جب تک مضارب کو اپنے معزول ہونے کا علم نہیں ہوگا، وہاں تک وہ مضارب ہی رہے گا، اور اس کا عمل مضاربت میں شمار ہوگا۔

وان عـزل رب المال ولم يعلم بعزله حتى اشترى وباع فتصرفه جائز،وان علم بعزله والمال عروض فله ان يبيعها ولايمنعه العزل من ذلك. (هدايه ۳/۲۴۹،۲۵۰)

لیکن اب کاروبار چالو نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ مضاربت کا حساب کر کے اسے اس طرح ختم کیا جائے گا کہ مضاربت کے تمام سامان کو بیچ کر سرمایہ نقد کی صورت میں لایا جائے گا، مضاربت کے جو قرضے اور وصول کرنے کی رقوم لوگوں کے ذمہ ہیں وہ وصول کیے جائیں گے، اور یہ کام مضارب کرے گا۔

واذا افتـرقـا وفى المال ديون وقدربح المضارب فيه، أجبره الحاكم

علی اقتضاء الدیون. (هدایه ۳/ ۲۵۰)

نیز مضارب اور ارباب اموال نے کاروبار کے دوران جو نفع علی الحساب وصول کیا تھا، اسے بھی شمار کیا جائے گا، اور جب کل سرمایہ حاصل ہو جائے گا، تو اس میں سے ارباب اموال کا رأس المال الگ کیا جائے گا، بقیہ رقم نفع کہلائے گی، اور یہ نفع مضارب اور ارباب اموال میں مقرر شرط کے مطابق تقسیم ہوگا، اگر کچھ بھی رقم باقی نہ بچی تو مضارب کو کچھ نہ ملے گا، اور اگر رأس المال کی رقم بھی پوری نہ ہوئی، تو کاروبار کے دوران دونوں نے جو علی الحساب نفع وصول کیا تھا، وہ واپس لے کر رأس المال میں ملایا جائے گا، اور اگر رأس المال کی مقدار مکمل ہو کر کچھ رقم باقی بچ گئی، تو اس کو نفع قرار دے کر حسب شرط تقسیم کر لیا جائے گا، ورنہ مضارب کو کچھ نہیں ملے گا۔

وماهلك من مال المضاربة فهومن الربح دون رأس المال، فان زاد الهالك على الربح فلاضمان على المضارب، وان كانايقتسمان الربح والمضاربة بحالها ثم هلك المال بعضه أوكله ترادا الربح حتى يستوفى رب المال رأس المال، واذااستوفى رأس المال فان فضل شئى كان بينهما، وان نقص فلاضمان على المضارب لمابينا. (هدایه ۳/ ۲۵۰،۲۵۱)

اور جب تک کہ یہ پورا عمل مکمل نہ ہو، وہاں تک اس کاروبار کے حق میں حکماً عقد مضاربت باقی رہے گا، اس لیے کاروبار کو چالو رکھتے ہوئے اس کو ملازم بنا دینا درست نہیں، بلکہ جس روز اس کی مضاربت ختم کی گئی اور اس کو باخبر بھی کر دیا گیا اسی وقت سے چالو کاروبار کو سمیٹنا ضروری ہے؛ تاکہ ختم شدہ مضاربت کا حساب کتاب درست ہو۔

وان علم بعزله والمال عروض فله ان يبيعها و لا يمنعه العزل من ذلك

.... وعلى هذا موت رب المال في بيع العروض ونحوها. (هدايه ۳/ ۲۵۰)

اور حاشیہ ہدایہ میں ہے: قوله وعلى هذا اشارة الى قوله لايمنعه العزل من ذلك يعني لاينعزل المضارب بالعزل الحكمي اذا كان المال عروضابل يبيعها بعدم العزل كمالاينعزل بالعزل القصدي في تلك الصورة، لان عدم عمل العزل فيهالئلا يلزم ابطال حق المضارب ولاتفاوت في ذلك بين ذينك العزلين. (حاشية ۳/ ۲۵۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

یکم جمادی الاُخریٰ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

بھینس کی چَرائی کے عقدِ اجارہ میں بھینس دبلی ہوگئی تو کیا اجرت میں کمی کی جاسکتی ہے؟

سوال: سالویز فارم کے ذمہ دار نے زید کو بھینس ماہانہ دوسو روپیہ کے عوض میں پرورش کے لیے دی، کچھ ماہ کے بعد زید نے بھینس کو مالک سالویز فارم کو واپس کی، مالک سالویز فارم نے دیکھا کہ بھینس دبلی اور کمزور ہوگئی ہے، تو وہ زید کو ماہانہ دوسو روپیہ اجرت کے بجائے ماہانہ ایک سو روپیہ اجرت دیتا ہے، تو کیا شرعاً دبلا ہونے کی وجہ سے اجرت میں کمی کرنا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقد اجارہ بھینس کی چرائی اور پرورش وغیرہ پر ہوا تھا (جو اجیر کی اختیاری چیز ہے) تو اس میں بھینس کا موٹا پن یا دبلا پن داخل نہیں ہے؛ اس لیے سالویز فارم والے کے لیے جائز نہیں ہے کہ اجرت میں کمی کرے اور اگر بوقتِ عقد شرط لگائی تھی، کہ بھینس کو

موٹا کر کے واپس کرنا ہوگا، تو ظاہر ہے کہ یہ اجیر کا اختیاری فعل نہیں ہے؛ اس لیے یہ عقد ہی فاسد ہوگا۔ کما هو مقتضى شرائط الاجارة.

''بدائع الصنائع'' میں ہے: ومنها ان يكون مقدور الاستيفاء حقيقة او شرعاً لان العقد لا يكون وسيلة الى المعقود بدونه. (۱۸۷/٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۵/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

بھینس مرنے کی وجہ سے اجرت پر اثر

سوال: سالویز فارم کے مالک نے زید کو بھینس پرورش کے لیے ماہانہ ۲۰۰ روپیہ کے عوض میں دی، بھینس زید کے وہاں مرگئی، تو سالویز فارم کا مالک کہتا ہے کہ تیری بے پرواہی کی وجہ سے مرگئی، یہ کہہ کر اجرت کم کردیتا ہے، اور بعض مرتبہ بالکل نہیں دیتا تو بھینس کے مرنے کی وجہ سے اجرت کا کم کرنا یا بالکل نہ دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

جب بھینس پرورش کرنے والے کے پاس مرگئی، تو اب اجرت ساقط ہوگئی؛ اس لیے سالویز فارم والے کا اجرت بالکل نہ دینا درست ہے، اور کچھ دے دیتا ہے تو یہ اس کا احسان ہے۔

فهلكه قبل تسليمه يسقط الاجر، وكذا كل من لعمله اثر ومالا اثر له كجمال له الاجر كما فرغ وان لم يسلم. بحر. (درمختار) (قوله وكذا كل من لعمله اثر) اي في انه لو هلك في يده لا اجر له. (شامی ۱۰/٥) ان المدار فى وجوب الاجر على الفراغ منه لا على التسليم الا انه مع هذا يشترط لاستحقاقه

فیما اذا کان للعمل اثر عدم هلاك العين قبله حتى لو هلكت قبله سقط بخلاف مالم يكن له اثر الخ (تقريرات الرافعي ۲/۲۵۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بھینس کے گابھن ہونے نہ ہونے میں اجرت کا فرق

سوال: (۱) بمبئی سے بھینس عام طور پر گابھن ہوکر سالویز فارم کے مالک کے پاس آتی ہیں، بعض مرتبہ کسی بھینس کے بارے میں شک ہوتا ہے کہ گابھن ہے یانہیں؟ تو مالک سالویز فارم پرورش کرنے والے کو ایسی بھینس یہ کہہ کر دیتا ہے، کہ تم لے جاؤ اگر بھینس گابھن نکلی، تو ماہانہ ۱۰۰ روپیہ کے حساب سے اجرت دیں گے، اور اگر تمہارے یہاں آکر بھینس گابھن ہوئی، تو بچہ جننے پر بھینس کی پوری قیمت کا ثلث تم کو دیں گے، تو کیا پرورش کے لیے اس طرح شرعاً اجرت طے کرنا صحیح ہے یانہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورت مسئولہ میں جہالتِ اجر کی وجہ سے یہ اجارہ فاسد ہے۔

وشرطها ان تكون الاجر والمنفعة معلومتين. (تبيين الحقائق ۵/۱۰۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال: (۲) جو بھینس خالی (گابھن نہ ہو) ہوتی ہے، ان کو پرورش کے لیے دینے کی ایک شکل یہ ہوتی ہے، کہ اس بھینس کی پرورش کرو، اور جب گابھن ہوکر بچہ دے گی، تو اس بھینس کی پوری قیمت طرفین کی رضامندی سے طے کر کے کبھی ایک ثلث، کبھی دوثلث اور کبھی نصف قیمت، پرورش کرنے والے کو پرورش کے عوض میں دی جاتی ہے، بعض مرتبہ اس بھینس کو پرورش کرنے والا ہی قیمۃً رکھ لیتا ہے اور سالویز فارم کے ذمہ دار کو قیمت دے دیتا ہے، تو اس طرح معاملہ اور خرید وفروخت کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲) یہ اجارہ بھی فاسد ہے۔ کما مر. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۰/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

جمعہ کی اذان کے بعد بیع کا حکم

سوال: زید کی جس شہر میں ہوٹل ہے، اس شہر میں دو مختلف مسجدوں میں، مختلف اوقات میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، زید نے جمعہ کے وقت کاروبار بند کرنے کے بجائے ہوٹل کے آدھے ملازمین کو ایک مسجد میں جہاں ایک بجے جمعہ کی نماز ہوتی ہے نماز پڑھنے کے لیے بھیج دیا، اور جب وہ نماز پڑھ کر آئے تو کاروبار میں لگ گئے، اور بقیہ ملازمین کو دوسری مسجد میں جہاں دو بجے نماز جمعہ ہوتی ہے نماز پڑھنے کے لیے بھیج دیا تو کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟

دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(الف): نمازِ جمعہ کے وقت کاروبار کو جاری رکھتے ہوئے ہر ایک آدمی نمازِ جمعہ ادا کر لے یہ شرعاً درست ہے؟

(ب): اگر نمازِ جمعہ کے وقت کاروبار کو بند کرنا ضروری ہے، تو جس شہر میں مختلف مسجدوں میں مختلف اوقات میں اذانِ جمعہ ہوتی ہے، تو کونسی مسجد کی اذان کے وقت کاروبار بند کرنا ضروری ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جمعہ کی اذانِ اول کے بعد بیع وشرا (خرید وفروخت) مکروہ تحریمی ہے، ایسی بیع سے توبہ اور اس کا فسخ دیانۃً واجب ہے قضاءً نہیں، بیع فاسد قضاءً بھی واجب الفسخ ہوتی

ہے۔(احسن الفتاویٰ ۴/۱۱۴) اس لیے............

(الف) نمازِ جمعہ کے وقت کاروبار کو جاری رکھتے ہوئے ہر ایک کا جمعہ پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ کاروبار کا بند رکھنا ضروری ہے۔

(ب) اس سے متعلق صریح جزئیہ اس لیے نہیں ملتا کہ پہلے زمانہ میں پورے شہر میں صرف ایک ہی جگہ جمعہ ہوتا تھا لہذا اس کو عام نمازوں کی اذان پر قیاس کیا جائیگا، عام اذان کی اجابت باللسان میں اذان اول کا اعتبار ہے، اور اجابت بالقدم میں اذانِ محلّہ کا اعتبار ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وجوب سعی الی الجمعہ و کراہیتِ بیع میں مسجد محلّہ کی اذان معتبر ہے۔(احسن الفتاویٰ ۴/ ۱۱۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ماہِ رمضان میں دن کے وقت ہندو محلّہ میں ہوٹل کھلا رکھنا

سوال: زید کی ہوٹل ہندو محلّہ میں ہے اور ہوٹل کے گاہک اکثر ہندوں ہیں تو ماہ رمضان میں دن میں ہوٹل کا کھلا رکھنا اور گاہکوں کو کھلانا پلانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ماہِ رمضان المبارک کے احترام کے خاطر دن کے وقت کھانے پینے کی ہوٹل بند رکھنا ضروری ہے، کھانے پینے والے خواہ کسی بھی مذہب کے ہوں۔(فتاوی رحیمیہ ۵/ ۱۹۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۱۷/ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

قرض پر نفع

سوال: زید کا بمبئی میں بھینسوں کا اصطبل ہے اور اس کو پانچ نئی بھینسیں خریدنی ہیں، اور اس کے پاس نقد پیسہ نہیں ہے؛ اس لیے اس نے عمر کو کہا، کہ تیرے پاس پیسے ہیں،

تو مجھ کو ۲۵۰۰ روپیہ دے؛ تاکہ میں بھینس خریدوں اور یہ رقم ایک سال میں واپس کروں گا اور فی بھینس ایک ہزار روپیہ منافع دوں گا، سال پورا ہونے پر زید عمر کو اس کی رقم اور منافع دیتا ہے، تو شرعاً اس طرح قرض کا معاملہ کرنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ صریح سود ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بھینس کی بیع پر نفع

سوال: زید کا بمبئی میں بھینسوں کا اصطبل ہے اور اس کو پانچ نئی بھینسیں خریدنی ہیں اور اس کے پاس نقد رقم نہیں ہے؛ اس لیے اس نے عمر کو کہا کہ مجھ کو پانچ بھینسوں کی ضرورت ہے، تو تو میرے ساتھ چل اور پانچ بھینس اپنے پیسوں سے خرید کر مجھے دے، اور زید نے کہا کہ تیری یہ رقم اور فی بھینس ۱۰۰۰ روپیہ منافع ایک سال میں دوں گا، تو کیا شرعاً اس طرح معاملہ کرنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر عمر نے اپنی رقم سے بھینس خریدی، اس کے بعد اس نے ہر بھینس پر ایک ہزار منافع لے کر زید کے ہاتھ ادھار ایک سال کے وعدہ سے فروخت کی، تو درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳۰/صفر ۱۴۰۹ھ

جفتی کرانے کی اجرت

سوال: ایک شخص بھینسا (کٹرا) رکھتا ہے، اور بھینس کو جفتی کرانے کے عوض میں دو کلو تیل یا دس انڈے اس بھینسے کو کھلانے کے لیے لیتا ہے، یا ان کی قیمت لیتا ہے، تو کیا

اس طرح جفتی کرانے کے عوض میں بھینسے کے لیے مذکورہ اشیاء لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ جائز نہیں ہے۔

(لا تصح الاجارة لعسب التيس) وهونزوه على الاناث (درمختار) (قوله لا تصح الاجارة لعسب التيس) لانه عمل لا يقدر عليه وهو الاحبال. (شامی ۳۸/۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: ایک بستی میں صرف ایک ہندو ہی کی ملکیت میں بھینسا ہے اور وہ اجرت جفتی لیتا ہے، اور ہمیں مجبوراً دینا پڑتا ہے تو دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر دوسری جگہ بھینس لے جانا ممکن ہو تو اس ہندو سے معاملہ نہ کرے، اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو اس ہندو سے اجارہ کا معاملہ نہ کرے؛ بلکہ بغیر عقد اجارہ اس کے احسان کے عوض خود بھی احسان کا کوئی سلوک بلا تعیین کر دے، اس سلسلہ میں دیگر حضرات علماء سے استفسار کر لیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بھینسوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: (۱) زید صاحب نصاب ہے اور اس کا بمبئی میں ایک بھینسوں کا اصطبل ہے، جس میں ۱۰۰ بھینسیں ہیں جن کا دودھ بیچتا ہے، اور بھینسوں کو تجارت کی نیت سے نہیں خریدا اور وہ بھینسیں سائمہ بھی نہیں ہیں؛ بلکہ انہیں گھاس دانہ خرید کر کھلایا جاتا ہے؛ تو کیا حولان حول پر ان بھینسوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا اس کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) سائمہ نہ ہونے کی وجہ سے بھینسوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

وشرطه اي شرط افتراض ادائها حولان حول وهو فى ملكه، وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعينهما للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكوٰة كيفما امسكهما ولو للنفقة او (السوم) لقيدها الآتى. (درمختار على هامش الشامى ۱۱/۲)

ان بھینسوں سے حاصل شدہ منافع، رقم کی صورت میں موجود ہے، اور اس پر سال گزر جائے تو دیگر شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۷/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

سوال (۲) بھینسوں پر زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں جب کہ بعض بھینسوں پر حولان حول ہوا ہے، اور بعض بھینسوں پر نہیں ہوا ہے، تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیا شکل ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲) سوال نمبر...... میں دریافت کردہ صورت پر بھینسوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

سوال: بھینسوں کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں جب کہ کل منافع سال بھر کا ایک لاکھ ہوا ہے؛ مگر بعض رقم پر حولان حول ہوا ہے اور بعض پر نہیں ہوا ہے؛ اس لیے کہ ہر ماہ کچھ کچھ نفع ہوتا رہتا ہے، تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

منافع کی مقدار نصاب تک پہنچنے سے سال کی ابتداء شمار ہوگی، اس کے بعد اس

کی جنس کا جتنا اضافہ ہوا ہے، اس کو بھی اصل نصاب کے ساتھ ملا لیا جاوے گا، اور سال پورا ہونے پر سب مال (اصل نصاب اور بعد کا اضافہ) پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(والمستفاد) ولو بهبة او ارث (وسط الحول يضم الى نصاب من جنسه) فيز كيه بحول الاصل. (درمختار) (قوله الى نصاب) قيد به لانه لو كان النصاب ناقصا وكمل بالمستفاد فان الحول ينعقد عليه عند الكمال الخ (شامی ۲/ ۲۵)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۷/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

گوبر آلود تھن سے دوہا ہوا دودھ پاک ہے یا ناپاک؟

سوال: (۱) بمبئی میں جو بھینسوں کے اصطبل ہیں، اکثر بھینسوں کے اصطبل میں جو دودھ دوہا جاتا ہے، اس کے اندر یہ ہوتا ہے کہ بھینس کا تھن گوبر آلود ہوتا ہے، اور نوکر اسی حالت میں دوہتا ہے، اور گوبر کے ذرات دودھ میں گرتے ہیں اور وہ دودھ دکانوں میں سپلائی کیا جاتا ہے، تو شرعاً یہ دودھ پاک ہے یا ناپاک؟

ناپاک پانی سے دھوئے ہوئے برتن اور اس کے دودھ کا حکم

سوال: (۲) بھینسوں کے اصطبل میں دودھ کے برتنوں کو اس حوض کے پانی سے دھویا جاتا ہے، جس حوض سے بھینسیں نہلائیں جاتی ہیں، اور اس حوض سے بھینس پانی بھی پیتی ہے، اور اس حوض میں غیر مسلم ملازمین اپنے کپڑے وغیرہ صاف کرتے ہیں، اور بھینسوں کو جب حوض پر نہلایا جاتا ہے اس وقت ناپاک قطرات بھی اس میں گرتے ہیں، اور وہ حوض نہ دہ در دہ (دس بائی دس) ہے اور نہ اس کا پانی جاری ہے تو ایسے حوض سے دھوئے ہوئے برتنوں میں دودھ رکھنے سے شرعاً دودھ پاک رہے گا یا ناپاک؟

کین کا ڈھکن ناپاک پانی سے دھوکر کین پر رکھا اس کے قطرات دودھ میں گرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۳) دودھ کے برتن (کین) میں دودھ بھرنے کے بعد گھاس کا ڈھکن بنا کر مذکورہ حوض میں دھوکر برتن کے منہ پر رکھا جاتا ہے، اور اس گھاس کے پانی کے قطرات اس دودھ میں گرتے رہتے ہیں، تو شرعاً یہ دودھ پاک ہے یا ناپاک؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): صورتِ مسئولہ میں دودھ ناپاک ہے، مالکین کو چاہیے کہ دودھ دوہنے والے ملازمین کو تاکید کردیں کہ تھن کو پاک پانی سے دھوکر دودھ دوہ لیا کریں۔

(وروث وخثی) افاد بهما نجاسة خرء كل حيوان غير الطيور. (درمختار)

(قوله افاد بهما نجاسة خرء كل حيوان) اراد بالنجاسة المغلظة، لان الكلام فيها ولانصراف الاطلاق اليها كماياتی الخ. (شامی ۱/ ۲۳٤)ويستدل عليه ايضا بمسالة المنغمس فی البئر لطلب الدلو او للتبرد فان الفقهاء شرطوا فيها ان يكون مستنجيا بالماء ولا نجس عليه. (انظر للتفصيل الدرالمختار مع الشامی ۱/۱٤۸)

(۲) ظاہر ہے مسئولہ حوض کے پانی سے دھویا ہوا ناپاک برتن پاک تو کیا ہوتا، بلکہ پاک برتن ہوگا وہ بھی ناپاک ہو جائے گا، اور جو دودھ اس میں ڈالا جائے گا، وہ بھی ناپاک ہوجائے گا۔ کما هو ظاهر.

(۳) یہ بھی ناپاک ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۷/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

کوّے کے جھوٹے کا حکم

سوال: دودھ کے برتن میں دودھ رکھنے کے بعد کوے نے جھوٹا کیا تو شرعاً اس دودھ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو کوا عامۃً ہماری بستیوں میں پایا جاتا ہے، وہ دانہ غلہ بھی کھاتا ہے اور یہی اس کی غالب غذا ہے، اور کبھی غلاظت بھی کھالیتا ہے، پس اس کا حکم فقہاء کے نزدیک وہی ہے جو مرغی کا حکم ہے، کہ اس کی غالب غذا غلہ ودانہ ہے، اور کبھی غلاظت بھی کھالیتی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/۱۴۰) نجاست کھانے والی مرغی میں یہ تفصیل ہے کہ اس کی چونچ کی طہارت کا یقین ہے تو پانی پاک ہے، اور اگر چونچ کی نجاست کا یقین ہو تو پانی ناپاک ہے، اور اگر کسی امر کا یقین نہیں تو مکروہ تنزیہی ہے۔

واما المخلاة فلعابها طاهر فسورها كذلك؛ لكن لما كانت تأكل العذرة كره سورها ولم يحكم بنجاسته للشك حتى لو علمت النجاسة في فمها تنجس، ولو علمت الطهارة انتفت الكراهة. (شامی ۱/۱٦٤)

واما سور دجاجة المخلاة فلم ار من ذكر خلافا في المراد من الكراهة بل ظاهر كلامهم انها كراهة التنزيه بلا خلاف لانها لا تتحامى النجاسة. (۱/۱٦٥) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بھینس کے بچہ کو دودھ سے روکا اور مر گیا تو گنہ گار ہوگا

سوال: اصطبل میں جو بھینس بچہ جنتی ہے اس کو پورا دودھ نہیں پلایا جاتا (کہ جس سے اس کی زندگی باقی رہے) بلکہ بچہ کو دودھ پینے کے لیے چھوڑا جاتا ہے، اور جب بھینس

کے تھن میں دودھ اتر آتا ہے تو فوراً بچہ کو تھن سے ہٹایا جاتا ہے، اور بچہ کو دودھ کا پورا خوراک نہ ملنے کی وجہ سے مرجاتا ہے، تو کیا اس صورت میں مالکِ اصطبل گنہ گار ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر بچہ کی خوراک کے لیے دوسری کوئی چیز بھی تجویز نہیں کرتا ہے، یا کرتا ہے؛ لیکن بچہ بغیر دودھ کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے، تو دونوں صورتوں میں مالک گنہ گار ہوگا۔

ویومر اما بالبیع اما بالانفاق علی بھائمہ دیانۃ لا قضاء علی ظاھر المذھب للنھی عن تعذیب الحیوان واضاعۃ المال، وعن الثانی یجبر، ورجحه الطحاوی والکمال وبه قالت الائمۃ الثلاثۃ. (درمختار علی ھامش الشامی ۷۴۸/۲)

ویستحب ان لا یاخذ لبنھا الا ما فضل من ولدھا مادام لا یاکل غیرہ. (عالم گیری ۵۷۳/۱)

''بہشتی زیور'' میں حیوانات کے حقوق کے ذیل میں ہے: ''جو جانور اپنے کام میں ہیں ان کے کھانے پینے وراحت رسانی وخدمت کا پورے طور پر اہتمام کرے، ان کی قوت سے زیادہ ان سے کام نہ لے، ان کو حد سے زیادہ نہ مارے'' (بہشتی زیور اختری حصہ چہارم ۴۷)

عن عمرؓ وابي ھریرۃؓ قالا: قال رسول اللّٰہ ﷺ: عذبت امرأۃ فی ھرۃ امسکتھا حتی ماتت من الجوع فلم تکن تطعمھا ولا ترسلھا فتاکل من خشاش الارض. متفق علیه. (مشکوۃ شریف ۱۶۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

انجکشن لگا کر دودھ دوہنا

سوال: اصطبل میں بعض مرتبہ جب بھینسوں کو دوہنے کے لیے بیٹھتے ہیں، تو تھنوں میں دودھ نہیں لاتی، تب انجکشن لگا کر دودھ دوہا جاتا ہے تو کیا یہ صحیح ہے؟ کیوں کہ

اگر دوہا نہ جائے اور یونہی چھوڑ دیا جائے، تو بھینس کے تھن اور بھینس کے خراب ہونے کا خطرہ ہے جس کی وجہ سے مالک اصطبل کا نقصان ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔(کما یفهم من الفتاوی المحمودیه ۲۱۸/٦)

یکره استقصاء فی حلب البهیمة اذا کان مضرا بها لقلة العلف ویکره ترك الحلب ایضاً. (فتاویٰ عالمگیری ۵۷۳/۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۷/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

دودھ کی کمی بیشی پر دائر ثمن والی بیع فاسد ہے

سوال: زید نے اس شرط پر بھینس خریدی کہ اگر بارہ لیٹر دودھ دے گی، تو سات ہزار قیمت دوں گا، اور اگر اس سے کم دودھ دے گی، تو جتنا دودھ کم ہوگا اس کے اعتبار سے قیمت کم کر کے ادا کروں گا، تو کیا اس شرط کے ساتھ بھینس کا خریدنا از روئے شرع صحیح ہے؟

نوٹ: یہ اختیار پندرہ دن کا ہے اور اس سے کم و بیش بھی رہتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں ہوئی بیع شرعاً فاسد ہے۔

(بخلاف شرائه شاة علی انها حامل او تحلب کذا رطلا) او یخبز کذا صاعا او یکتب کذا قدراً فسد؛ لانه شرط فاسد لا وصف (درمختار) (قوله فسد) ای البیع (قوله لانه شرط فاسد) لانه شرط زیادة مجهولة لعدم العلم بها. فتح. ای لان ما فی البطن والضرع لا تعلم حقیقته. (شامی ٦٦/٤) ولو باع شاة علی انها

تحلب كذا وكذا فالبيع فاسد باتفاق الروايات الخ (واقعات المفتين ٩٩)

بائع ومشتری دونوں میں سے ہر ایک پر واجب ہے کہ اس بیع کو فسخ کردیں، اب اگر مشتری نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا ہے، تو ظاہر ہے، اور اگر وہ مبیع پر قبضہ کر چکا ہے اور اس کے قبضہ کے درمیان مبیع میں کوئی ایسا تغیر واقع نہیں ہوا جو فسخ سے مانع ہو، تو اس صورت میں بھی فسخ ضروری ہے۔

(ويجب على كل واحد منهما فسخه قبل القبض...... (او بعده مادام) المبيع بحاله. جوهره. (درمختار) (قوله مادام المبيع بحاله) متعلق بقوله وعلى كل واحد منهما فسخه، واحترز به عما اذا عرض عليه ماتعذر به رده مما يمنع الفسخ كما يأتى بيانه. (شامى ٤/ ١٤٠)

فسخ کے بعد بائع کے لیے ضروری ہے کہ جو رقم اس نے قیمت کے طور پر وصول کی تھی، وہ مشتری کو لوٹا دے، اور جب تک وہ اس قیمت کو نہیں لوٹائے گا وہاں تک مشتری اس مبیع کو روک سکتا ہے، اور یہ روکے رکھنا بحکم رہن ہوگا۔

(و)بعد الفسخ (لايأخذه) بائعه (حتى يرد ثمنه) المنقود. (درمختار) (قوله حتى يرد ثمنه) اى ما قبضه البائع من ثمن او قيمة كما فى الفتح. (قوله المنقود) لان المبيع مقابل به فيصير محبوسا به كالرهن. فتح. والمراد بالمنقود المقبوض احترازا عن الدين. (شامى ٤/ ١٤٣)

اس درمیان جو دودھ مشتری کے یہاں نکلا اگر وہ خود بخود ہلاک ہوا تھا تو وہ اس کا ضامن نہیں، اگر اس کے تصرف سے ہلاک ہوا تھا تو ضامن ہوگا۔

فلو منفصلة كولد او متولدة كسمن فله الفسخ ويضمنها باستهلاكها. (درمختار)

وکذامنفصلة متولدة كالولد والعقر والارش ولو هلكت هذه الزوائد في يد المشتری لايضمنها، وان استهلكها ضمن. (شامی ۱٤٧/٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

گابھن بنانے کی شرط پر بیع

سوال: زید نے ایک بھینسا اس شرط پر بیچا، کہ اس کو لے جاؤ اس کو دو تین ماہ تم رکھو، اور دیکھو کہ اس سے بھینسیں برابر گابھن ہوتی ہوں، تو اس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ، ورنہ مجھے واپس کردینا، تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں مل سکی؛ البتہ مختلف عباراتِ فقہیہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ صورتِ مسئولہ میں بھی بیع فاسد ہے، جواب نمبر ۱۰ میں منقول پہلی عبارت جس میں ہے: فسد لانه شرط فاسد لا وصف. (درمختار) (قوله لانه شرط فاسد) لانه شرط زيادة مجهولة لعد م العلم بها اى لان مافى البطن والضرع لا تعلم حقيقته. (شامی ٦٦/٤)

اور دوسری عبارت جس میں آگے چل کر ہے: فيكون اشتراط اللبن المحلوب ...... مجهول على خطر الوجود فاشتراطه يوجب غدرا فى العقد فيوجب الفساد. (واقعات المفتيين ۹۹)

اور "مبسوط" میں ہے۔ وكذلك ان شرط انها تحلب كذا فالبيع فاسد لانه لا يدرى لعل الشرط باطل يعني ان اشتراط مقدار من المبيع ليس فى وسع البائع ايجاده ولا طريق الى معرفته فكان شرطا باطلا فيفسد به العقد. (۲۰/۱۳)

اجرت عسب التیس کے مسئلہ میں فقہاء جو تعلیل کرتے ہیں وہاں بھی عدم

قدرت علی التسلیم کا ذکر فرماتے ہیں، مبسوط میں ہے۔ واذا استاجر فحلا ...... لم یجز للاثر الذي جاء به النهي عن رسول الله ﷺ عن التيس، ولان المقصود الماء ولا قيمة له وصاحب الفحل يلتزم ايفاء ما لا يقدر عليه. (۴۱/۱۶)

''درمختار'' و''شامی'' میں ہے۔ لا تصح الاجارة لعسب التيس، وهو نزوه على الاناث. (درمختار) (قوله لا تصح الاجارة لعسب التيس) لانه لا يقدر عليه وهو الاحبال. (شامی ۳۸/۵)

چونکہ یہاں بھی گابھن بنانے کی شرط لگائی گئی ہے، جو بائع کے اختیار میں نہیں ہے؛ اس لیے شرط فاسد ہے، اس کو وصف مرغوب قرار دے کر بیع کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

گابھن بھینسوں کی مشروط بیع

سوال: گابھن بھینسوں کا اس شرط پر خریدنا بیچنا، کہ تھن اور دل کا عیب نہ ہو، تو طے شدہ پوری قیمت دی جائے گی، اور اگر عیب نکل آیا، تو قیمت میں کمی کردی جائے گی، اور بعض مرتبہ واپس کردینے کی شرط بھی کی جاتی ہے، تو کیا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مبیع میں اگر کوئی عیب ہے، تو خریدار کو خیار عیب حاصل ہے، چاہے بوقت عقد مشتری نے اپنے لیے خیار عیب کی شرط لگائی ہو، یا اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہو۔ عیب ہر اس چیز کو کہیں گے، جس کی وجہ سے تاجروں کے نزدیک اس مبیع کی قیمت میں کمی و نقصان آتا ہو۔

ان خيار العيب يثبت بلا شرط ولا يتوقت، ولا يمنع وقوع الملك للمشترى. (شامی ۷۹/۴) (ومن وجد (بمشريه ما ينقص الثمن) ولو يسيراً.

جوهره (عند التجار) المراد بهم ارباب المعرفة بكل تجارة وصنعة قاله المصنف (اخذه بكل الثمن او رده)(درمختار مع الشامی ۸۰/۴)

صورتِ مسئولہ میں دل کے عیوب کا ذکر ہے، اگر بھینس کے تاجروں کے یہاں عیب شمار کیے جاتے ہیں، تو اب خریدار کو خیارِ عیب حاصل ہے؛ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ عیب بائع کے یہاں سے آیا ہو، مشتری کے پاس آکر پیدا نہ ہوا ہو۔

لا بد للمسئلة من قيود الاول ان يكون العيب عند البائع. (بحر الرائق ۳۹/۶)

اس لیے مذکورہ عیوب معلوم ہونے پر خریدار بھینس کو واپس کر سکتا ہے چاہے بوقت بیع ایسی شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو؛ اس لیے واپسی والی شرط کے باوجود بیع درست ہوگی اور بصورتِ ظہورِ عیب واپس کرنا بھی درست ہوگا؛ البتہ مشتری قیمت میں کمی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا یعنی اگر رکھنا ہے تو پوری قیمت ادا کرے یا پھر واپس کر دے۔

اخذه بكل الثمن او رده. (درمختار)

ہاں اگر مشتری کے پاس آکر اس بھینس میں زیادتِ متصلہ غیر متولدہ یا منفصلہ متولدہ (مثلاً بچہ، دودھ وغیرہ) پیدا ہوئی تو اس صورت میں جانور واپس کرنے کے بجائے اس عیب کی وجہ سے قیمت میں جتنی کمی تاجروں کے عرف میں آتی ہو اتنی مقدار (قیمت میں سے) واپس لے (اگر قیمت ادا کر چکا ہے) یا کم ادا کرے (اگر ادائیگی باقی ہے)۔

حدث عيب آخر عند المشترى رجع بنقصانه وله الرد برضا البائع.

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ۸۸/۴، ۸۹) الا لمانع عيب او زيادة (درمختار علی هامش الشامی ۹۰/۴) وحاصله انه يمتنع الرد فی موضعين فی المتصلة الغير المتولدة مطلقا، وفی المنفصلة المتولدة لو بعد القبض كما فی البزازية. (شامی ۹۰/۴)

جس صورت میں قیمت میں کمی کرنے کا اختیار مشتری کو نہیں (بلکہ یا تو پوری قیمت دے کر رکھ لے یا مبیع واپس کردے) اس صورت میں اگر بائع کچھ رقم دے کر صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا تا کہ مشتری واپس نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وجد المشتری بمشریه عیبا واراد الرد به فاصطلحا علی ان یدفع البائع الدراهم الی المشتری ولا یرد علیه جاز ویجعل حطا من الثمن. (درمختار)
(قوله الدراهم) الاولی دراهم بالتنکیر. (شامی ۱۰۹/۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۸/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

افیون کے ذریعہ بھینس کا علاج کرنا

سوال: بعض بھینسوں کے دل میں بیماری ہوتی ہے، (یعنی رحم دانی اور اس کے ملحق حصہ کو باہر نکال دیتی ہے) تو اس صورت میں افیون فرج داخل میں رکھا جاتا ہے، جس کے نشہ کی وجہ سے یہ بیماری ختم ہو جاتی ہے، اور بعض بیماریوں میں افیون کھلایا جاتا ہے جب کہ دوسری دوائیاں بھی موجود ہیں، تو کیا اس طرح افیون سے علاج کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فرج میں افیون رکھ کر علاج درست ہے، اور کھلانے کی صورت میں اگر اتنی مقدار ہے جو نشہ آور ہے، تو دیگر دوائیوں کی موجودگی میں اس سے احتراز کرنا چاہیے، (ماخوذ از کفایت المفتی ۱۱۵/۹)

وهكذا یقول فی غیره من الاشیاء الجامدة المضرة فی العقل او غیره یحرم تناول القدر المضر منها دون القلیل النافع لان حرمتها لیست لعینها بل لضررها، وفی اول طلاق البحر: من غاب عقله بالبنج والافیون یقع طلاقه اذا

استعـمـله للهو، وادخال الافات، قصداً لكونه معصيةً، وان كان للتداوى فلا لـعدمها كذا فى فتح القدير وهو صريح فى حرمة البنج والافيون لا للدواء وفى البـزازية والتعليل ينادى بحرمته لا للدواء.اه. كلام البحر وجعل فى النهر هذا التفصيل هو الحق. (شامى ۳۲۵/۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

انجکشن لگا کر گابھن کرنا

سوال: بعض مرتبہ بھینس گابھن نہیں ہوتی تو انجکشن لگا کر اسے گابھن ہونے پر آمادہ کیا جاتا ہے، اور گابھن بھی ہو جاتی ہے تو کیا اس طرح گابھن ہونے پر آمادہ کرنا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

غیر فطری طریقہ ہے جو کراہت سے خالی نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۴/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

حکومتی ٹیکس سے بچنے کے لیے کمائی چھپانا

سوال: زید کی ہوٹل کی سالانہ آمدنی پچیس ہزار ہے؛ لیکن گورنمنٹ کو صرف دس ہزار انکم بتاتا ہے، اور دس ہزار ہی کا انکم ٹیکس بھرتا ہے، تو یہ کمائی کا چھپانا اور ٹیکس کم ادا کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی طرف سے عائد کیے جانے والے ناجائز ٹیکس سے بچنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنا جس میں ذلت ورسوائی کا اندیشہ نہ ہو، درست اور جائز ہے؛ البتہ اگر اس تدبیر میں ذلیل اور بے عزت ہونے کا اندیشہ ہے، تو درست نہیں؛ اس لیے کہ خود کو ذلیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

ہوٹل کے بیمہ کرانے کی گنجائش

سوال: ملک کے عمومی حالات کے پیشِ نظر جب کہ اکثریت غیروں کی ہے اور تعصب کی بنیاد پر فسادات کے دوران ملکیت کو نقصان پہنچاتے ہیں، ہوٹل کا، کسی ملکیت کا بیمہ اتروانا شرعاً کیسا ہے؟ جب کہ بیمہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ شر پسند عناصر بیمہ بھری ہوئی ملکیت کو نقصان نہیں پہنچاتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی، اور یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں، بیمہ بھی ممنوع ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہوسکتی ہو، یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۴۰)

یہ معاملہ سود اور قمار سے مرکب ہے، بایں وجہ اس میں سود اور قمار دونوں قسم کے گناہ ہوتے ہیں، اور گناہ بھی بڑے سنگین ہیں، جن کو حلال سمجھنا کفر ہے؛ مگر سوال میں جن خطرات کی نشان دہی کی گئی ہے وہ بھی واقعہ ہے، اور بیمہ کرا لینے کی صورت میں فسادیوں کی نظرِ بد سے دکان وغیرہ کی بہ ظنِ غالب حفاظت ہوجاتی ہے؛ اس لیے قانون فقہی "الضرر یزال" کے پیشِ نظر خطرہ کی چیزوں کا بیمہ کرا لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی ہے اس سے زیادہ جو رقم ہے، وہ غرباء اور محتاجوں میں بلانیت ثواب تقسیم کردی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لی جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۱۳۳ والتفصیل فیہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اپنا حق حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا

سوال: ہوٹل کے سرکاری کام اکثر و بیشتر بغیر رشوت کے نہیں ہوتے جب کہ

سرکاری عہدہ داران اکثر غیر ہوتے ہیں، اور متعصب بھی ہوتے ہیں، بغیر رشوت کے وقت پر کام نہیں ہوتا، اور بہت پریشان ہونا پڑتا ہے، ایسی مجبوری کی حالت میں رشوت دے کر کام کروانا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ لا باس بالرشوة اذا خاف على دينه. (درمختار) (قوله اذا خاف على دينه) عبارة المجتبىٰ لمن خاف وفيه ايضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعنى فى حق الدافع. (شامی ۵/ ۳۰۰)

البتہ یہ یاد رہے کہ یہ اجازت صرف اس صورت میں ہے کہ جب کہ قانونی طور پر وہ ہمارا حق ہے، اور یہ سرکاری کارندہ ہمارے لیے اس حق کی وصولیابی میں مانع بن رہا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۲۱/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

ہوٹل کے مشترک منافع سے بخشش دینا

سوال: زید کو شرکاء نے اپنا ہوٹل اس طرح چلانے کے لیے دیا کہ تم کو منافع میں سے چلانے کا خمس، یعنی پانچواں حصہ دیں گے، زید نے اس ہوٹل کو چلانے کے لیے بکر کو ملازم رکھا، بکر اپنی نگرانی میں ہوٹل چلاتا ہے، اور زید کا اس کی ذمہ داری میں ہاتھ بٹاتا ہے، بکر کی ماہانہ تنخواہ جس کی مقدار اس قسم کے ملازمین کے عام معیار کی ہے؛ لیکن زید بکر کو سالانہ اس کی حسن کارکردگی کے انعام کے عنوان سے ہوٹل کے مشترک منافع سے ایک رقم بخشش کرتا ہے جب کہ عام طور پر زید کے مانند ذمہ داری لینے والے لوگ انعامی رقم

مشترک منافع کی رقم سے نہیں دیا کرتے، بلکہ اپنی ذاتی منافع کی رقم سے دیتے ہیں، جس کی اطلاع بعض مرتبہ شرکاء کو زید کرتا ہے، اور بعض مرتبہ اطلاع بھی نہیں کرتا، اطلاع کرنے کی صورت میں بعض مرتبہ شرکاء رضامند ہوتے ہیں، اور بعض مرتبہ مجبوری کے درجہ میں رضامند ہونا پڑتا ہے، ان صورتوں میں زید کا مشترک منافع میں سے بخشش دینا کیسا ہے؟ بالخصوص شرکاء کی عدمِ رضامندی کی صورت میں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر زید کو مالکین نے بطورِ عقدِ مضاربت ہوٹل کا کاروبار سپرد کیا ہے تو اس صورت میں زید اس کاروبار کے لیے کسی کو ملازم رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔

ویملك (ای المضارب) الایداع والرهن والارتهان والاجارة والاستیجار (درمختار) (قوله الاستیجار) ای استیجار العمال والاعمال والمنازل لحفظ الاموال والسفن والدواب. (شامی ٥٤١/٤)

البتہ اس صورت میں زید ملازم کو اس کے کام کی وہ اجرت جو عموماً اس قسم کے ملازمین کو دی جاتی ہے، دے سکتا ہے، اس سے زائد رقم جو انعام کے نام سے دی جاتی ہے، مالِ مضاربت میں سے نہیں دے سکتا، اسی طرح مشترکہ منافع میں سے بھی بلا اجازت و رضامندی شرکاء نہیں دے سکتا، اگر دیا تو وہ خود اس کا ضامن ہے، شرکاء کی وہ اجازت جو بلا رضامندی دل ہو وہ معتبر نہیں ہے لقوله علیه السلام: لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفسه. (مسند للامام احمد) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

مرحوم شریک کے حصے میں تصرف کرنا

سوال: ایک مشترک ہوٹل کا ذمہ دار زید ہے، جس کے اصل شرکاء میں سے بعض

کا انتقال ہونے کی وجہ سے نابالغ اولاد حصہ دار ہوئے ہیں، زید ہوٹل میں سے مہمانوں کو کھلاتا ہے، للہ چندہ دیتا ہے، نفلی قربانی کرتا ہے، تو زید کے لیے شرعاً یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس شریک کا انتقال ہو گیا اس کی شرکت موت کی وجہ سے ختم ہو چکی۔

(وتبطل الشركة) اى شركة عقد (بموت احدهما) علم الآخر او لا.

(درمختار) (قوله اى شركة العقد) اما شركة الملك فلا تبطل، وقول الدرر وتبطل الشركة مطلقاً فالاطلاق فيه بالنظر للمفاوضة والعنان. ط. قلت: والمراد ان شركة الملك لا تبطل اى لا يبطل الاشتراك فيها بل يبقى المال مشتركا بين الحى وورثة الميت كما كان والا فلا، يخفى ان شركة الميت مع الحى بطلت بموته. تامل. (شامى ۳/۳۸٤)

اب جو تصرفات زید نے کیے ہیں اس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

شرکت سے علاحدگی اور سامان کی قیمت کم لگانے کا حکم

سوال: چند احباب نے مل کر اجتماعی طور پر پچیس ہزار کی لاگت سے ایک ہوٹل تیار کیا، جس میں کم وبیش حصہ کے حصہ دار، شرکاء پچیس ہزار کے اعتبار سے اپنا رأس المال ڈال کر حصہ دار بنے، اب ہوٹل چلنے لگا اور اس کا ویلیو پچاس ہزار کا ہو گیا، اب دو تین شرکاء مل کر کسی ایک شریک کا حصہ نکال رہے ہیں، اور اس کو اصلی رقم پچیس ہزار کے اعتبار سے رقم لوٹا رہے ہیں جب کہ اس وقت اس ہوٹل کا بازاری ویلیو پچاس ہزار ہے یہ شریک نکلنے پر راضی نہیں ہے؛ لیکن مجبوراً اصل رأس المال لینا پڑ رہا ہے:

(الف) اس حصہ دار کی طرف سے دیگر شرکاء کو کسی قسم کی تکلیف اور شکایت بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں باقی شرکاء کے لیے اس کا حصہ نکال دینا کیسا ہے؟

(ب) بعض مرتبہ ایسی صورت میں ذمہ دار لوگ ہوٹل کا ویلیو لگاتے ہیں اور اس کے اعتبار سے اس کو اس کا حصہ دیتے ہیں؛ لیکن یہ لوگ بازاری ویلیو کے مقابلہ میں بہت کم ویلیو کرتے ہیں، مثلاً: چالیس ہزار بازاری ویلیو کے ہوٹل کا صرف تیس ہزار ویلیو لگاتے ہیں، تو یہ درست ہے یا نہیں؟

(ج) بعض مرتبہ یہ ذمہ دار حضرات صحیح صحیح بازاری ویلیو ہی لگاتے ہیں، اور اس شریک کا جو حصہ آتا ہے، پورا پورا حصہ اس کو دے دیتے ہیں؛ لیکن اس حصہ دار کی عدمِ رضامندی کے باوجود جبراً اس کو الگ کرتے ہیں تو یہ کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مشترکہ کاروبار کے شرکاء میں سے کوئی ایک یا متعدد عقدِ شرکت کو ختم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ (وتبطل ایضاً) بفسخِ احدھما ولو المال عروضاً۔ (درمختار)

(الف) عقدِ شرکت کو فسخ کرنے کے لیے تکلیف وشکایت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

(ب، ج) البتہ یہ خیال رہے کہ جس وقت کسی ایک شریک کے ساتھ عقدِ شرکت کو فسخ کیا گیا، اس وقت جب مالِ شرکت بشکل عروض ہوتا، تو اس الگ کیے جانے والے شریک کا حصہ اس مال میں ہے؛ اس لیے اصل تو یہی ہے کہ اس مال کو تقسیم کرکے اس کا حصہ اس کے حوالہ کیا جائے؛ البتہ اگر وہ اپنے حصہ کی قیمت لینے پر راضی ہو، تو قیمت بھی دی جاسکتی ہے، اور چونکہ اپنے حصہ کے مال کا وہ مالک ہے؛ اس لیے قیمت وہی دینا ہوگی جس کا وہ مطالبہ کرے، ذمہ دار حضرات کی بات اس شریک پر لازم نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے

کہ درحقیقت اس کے قیمت لگانے کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنا حصہ دیگر شرکاء کو فروخت کررہا ہے، اور بیع میں بائع کی رضامندی شرط ہے، اگر وہ راضی نہیں ہے تو دیگر شرکاء کی ملکیت اس کے حصہ پر ثابت نہ ہوگی، اور اس حصہ کا نفع ان کے لیے حلال وطیب نہ رہے گا۔

(قوله لكنه يتصدق الخ) والظاهر انه يقال مثل ذلك فيما اذا تصرف احدهما بالمال فى صور بطلان الشركة المارة فان الربح يكون للعامل ويتصدق بما ربح من مال الآخر. (شامی ۳/ ۳۸۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۰/ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

اصطبل کے ایک شریک کا اپنے بیٹے کو اجیر رکھنا

سوال: (۱) زید اور بکر دونوں نے بھینسوں کا اصطبل خریدا ہے، زید کا لڑکا بمبئی میں اصطبل کا کاروبار سنبھالتا ہے، اور زید کا لڑکا اپنے باپ سے الگ نہیں ہے، کھانا وغیرہ سب ساتھ میں ہے، تو زید کے لڑکے کو کاروبار سنبھالنے کی وجہ سے ماہانہ پندرہ سو روپیہ تنخواہ دی جاتی ہے، تو زید کے لڑکے کے لیے ماہانہ تنخواہ لینی جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ یہ تنخواہ کی رقم زید ہی کے پاس آتی ہے اور وہی اس کو استعمال کرتا ہے۔

ایضاً

سوال: (۲) زید اور بکر دونوں نے شرکت میں ایک اصطبل خریدا اور زید کا لڑکا اصطبل کے کاروبار کو سنبھالتا ہے، جس کے عوض ماہانہ ۱۵۰۰/ روپئے تنخواہ دی جاتی ہے، اور وہ اپنے باپ سے الگ رہتا ہے، اور اسی تنخواہ سے اپنا گذران چلاتا ہے، تو اس صورت میں زید کے لڑکے کا تنخواہ لینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱،۲): یہ اجارہ درست اور جائز ہے۔

وان استاجر الرجل ابنه ليخدمه في بيته لم يجز ولا اجر عليه، لان خدمة الاب مستحق على الابن دينا وهو مطالب به عرفاً فلا يأخذ عليه اجراً ويعد من العقوق ان يأخذ الولد الاجر على خدمة ابيه والعقوق حرام، وكذلك ان استأجرته الام لان خدمتها اوجب عليه فانها احوج الى ذلك واشفق عليه وان احدهما استأجره ليرعيه عنهما او يعمل غير الخدمة جاز فان ذلك غير مستحق عليه ولا هو مطلوب في العرف. (مبسوط ۵٦/۱٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

باپ کی ماتحتی میں اولاد کی کمائی ہوئی ملکیت باپ کی شمار ہوگی

سوال: زید اور بکر دو بھائی ہیں، زید کو ایک لڑکا ہے اور بکر کو دو لڑکے ہیں، زید اور بکر نے اپنی کمائی سے جگہ خرید کر اس کے کچھ حصہ پر گھر بنانا شروع کیا، گھر کی تعمیر میں جو خرچ ہوا اس میں زید اور بکر کے بیٹوں نے بھی خرچ کیا، اور گھر بنانے میں جو قرض ہوا تھا اسے بھی زید اور بکر کے بیٹوں نے ادا کیا، زید اور بکر اب الگ ہونا چاہتے ہیں؛ لہٰذا بکر کہتا ہے کہ گھر پانچوں کی کمائی سے مکمل ہوا؛ اس لیے گھر کے پانچ حصے ہونے چاہئیں، اور زمین میری اور زید کی خریدی ہوئی ہے؛ اس لیے زمین کے دو حصے ہونے چاہئیں، تو کیا بکر کا یہ فیصلہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کاروبار میں تو اصل شرکت زید اور بکر دونوں بھائیوں کی ہے، زید کا لڑکا اپنے باپ زید کا معین و مددگار رہے اور بکر کے دونوں لڑکے اپنے باپ بکر کے معین و مددگار ہیں، اور اولاد کی باپ کی ماتحتی میں کی ہوئی کمائی باپ ہی کی شمار ہوتی ہے؛ اس لیے مکان کی تقسیم

دو حصوں پر ہوگی، ایک زید کا اور دوسرا بکر کا ہوگا۔

واجاب الخير الرملی عن سوال آخر بقوله: حيث كا ن من جملة عياله والمعينين له فی امور ه واحواله، فجميع ماحصله بكده وتعبه فهو ملك خاص لابيه لاشیء له فيه، حيث لم يكن له مال ولواجتمع له بالكسب جملة اموال لانه فی ذلك لابيه معين الخ (تنقيح الفتاوی الحامدية ۲/ ۱۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　۲۵/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

شریک یا اس کے بیٹے کا اجیر بننا

سوال: (۳) زید، عمر اور بکر تینوں بھینسوں کے ایک اصطبل میں شریک ہیں، بکر بمبئی میں کاروبار سنبھالتا ہے، اور عمر گجرات میں سالویز فارم، یعنی جو بھینس دودھ دینا بند کر دیتی ہے اور گابھن ہوتی ہے، تو ایسی بھینسوں کو بمبئی سے گجرات لایا جاتا ہے، ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، اور ان کو کھلایا پلایا جاتا ہے، اور جب بچہ جنتی ہیں اور جب دودھ دینا شروع کر دیتی ہیں تو واپس بمبئی میں بھیج دی جاتی ہیں، جن کو سنبھال کر تیار کرتے ہیں اور جب تیار ہو جاتی ہیں، تو عمر لڑکوں کے ذریعہ بمبئی روانہ کرتا ہے، اور اس سالویز فارم کے سنبھالنے کا ماہانہ پانچ ہزار روپیہ تنخواہ لیتا ہے، تو اپنے کاروبار سے عمر کا تنخواہ لینا شرعاً کیسا ہے؟ اگر صورتِ مسئولہ میں عمر خود تو سالویز فارم نہیں سنبھالتا ہے بلکہ اس کا لڑکا سنبھالتا ہے، تو عمر کے لڑکے کے لیے تنخواہ لینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

(۳) عمر کے لیے یہ تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

ولو استاجره لحمل طعام مشترك بينهما فلا اجر له لانه لا يعمل شيئا لشريكه الا ويقع بعضه لنفسه فلا يستحق الاجر. (درمختار مع الشامی ٥/ ٤١، ٤٢)

لانه فی هذه المسئلة شريك وليس للشريك اجر على عمله فی المشترك.

(تنقيح الفتاویٰ الحامدية ٢/ ١١٩)

اگر عمر کا لڑکا یہ کام عقد اجارہ سے کرے گا تو اس کے لیے تنخواہ لینا درست اور جائز ہے۔ (كما مر فی الجواب السابق) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۰/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

اجیر کا تنخواہ دے کر دوسرے سے کام کرانا

سوال: بمبئی سے جو بھینس سالویز ہونے کے لیے گجرات میں آتی ہے، تو سالویز فارم سنبھالنے والا آدمی بھینس کو پرورش کے لیے، کسی دوسرے آدمی کو ماہانہ سو روپئے اجرت پر دیتا ہے، اور جب تیار ہو جاتی ہے، تو بمبئی بھیج دیتا ہے تو اس طرح پرورش کے لیے دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر بھینس کے مالک نے یہ شرط لگائی کہ سالویز فارم والا خود ہی بھینس کو چرائے اور پرورش کرے تو اس صورت وہ دوسرے کو سپرد نہیں کر سکتا، اور اگر ایسی کوئی شرط نہیں لگائی ہے، تو وہ دوسرے کے ذریعہ بھی کام لے سکتا ہے۔

(واذا شرط على الصانع ان يعمل بنفسه ليس له ان يستعمل غيره) لان المعقود عليه العمل فی محل بعينه فيستحق عينه كالمنفعة فی محل

بعينه (وان اطلق له العمل فله ان يستاجر من يعمله) لان المستحق عمل فی ذمته ويمكن ايفاء ه بنفسه وبالاستعانة بغيره بمنزلة ايفاء الدين. (هدايه كتاب الاجارة باب الاجر متى يستحق)

واذا شرط على الصانع ان يعمل بنفسه نقل عن حميد الدين الضرير رحمه الله هو مثل ان يقول ان تعمل بنفسك او بيدك مثلاً.(شرح العناية على هامش الفتح ۹/ ۷۸)

(واذا شرط عمله بنفسه) بان يقول له اعمل بنفسك او بيدك (لا يستعمل غيره الا الظئر فلها استعمال غيرها) بشرط وغيره. خلاصة (وان اطلق كان له) اى للاجير ان يستاجر غيره. (درمختار على هامش الشامى ۵/ ۱۲)

(قوله وان اطلق) بأن لم يقيده بيده قال خط هذا الثوب لی او اصبغه بدرهم مثلاً لانه بالاطلاق رضی بوجود عمل غيره. قهستاني. (شامی ۵/۱۳)فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

اجرت کا کچھ حصہ بچا کر رکھنا اور دوسروں سے کام لینا

سوال: بمبئی میں بھینسوں کا مالک گجرات میں سالویز فارم والے پر بھینس بھیجتا ہے، اور دونوں میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ سالویز فارم والا خود یا کسی دوسرے کے پرورش کے لیے ماہانہ فی بھینس ۱۵۰/ روپیہ دیوے، اب مالک سالویز فارم فی بھینس کی پرورش کی اجرت ماہانہ ۱۰۰/ روپیہ کے حساب سے دوسروں کو دیتا ہے، اور بقیہ ۵۰/ روپیہ خود لے لیتا ہے، اور بمبئی کے مالکِ بھینس کو اس بات کا علم نہیں ہوتا؛ حالانکہ مالک سالویز فارم کو مالکِ بھینسوں کی جانب سے بھینسوں کو مختلف جگہوں پر پرورش کے لیے بھیجنا اور وقتاً فوقتاً ان کی نگرانی کرنا، اور بھینسوں کو تیار ہونے کے بعد جمع کر کے بمبئی بھیجنا وغیرہ، کی محنت

کے صلہ میں الگ سے فی بھینس پر اجرت دیدی جاتی ہے، تو اس طرح سالویز فارم والے کا ۵۰/ روپیہ فی بھینس مالکِ بھینس کی لاعلمی میں لینا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بھینس کا مالک سالویز فارم والے کے ساتھ جو معاملہ کر رہا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت تو یہ ہے کہ بھینس کی پرورش کی ذمہ داری اور اس کام کو انجام دینے کا معاملہ وہ براہِ راست سالویز فارم والے کے ساتھ کرے اور یہ کام خود اسی کو اپنے ہاتھ سے انجام دینا ہے ایسی کوئی شرط نہ لگائے تو اس صورت میں سالویز فارم والے کو اختیار ہے چاہے وہ خود یہ کام کرے یا دوسرے سے کرائے، (جیسا کہ جوابِ سابق میں گزر چکا) اب وہ خود یہ کام انجام دے رہا ہے تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے؛ لیکن اگر وہ اس کام کی انجام دہی کے لیے دوسرے آدمی سے معاملہ کرتا ہے اور اس کی اجرت جو طے کرتا ہے وہ اس اجرت سے کم ہے جو سالویز فارم والے کو دی جا رہی ہے اور بقیہ رقم وہ خود لے لیتا ہے جس کا اصل مالک کو علم بھی نہیں ہے، تو اگر سالویز فارم والے نے دوسرے آدمی کو اجرت اپنی رقم سے ادا کی ہے اور مالک کے پاس سے آئی ہوئی پوری رقم خود رکھ لی یا بھینس کی پرورش کے کام میں تھوڑا بہت اس نے بھی حصہ لیا، (مثلاً دو چار یوم خود یہ کام کیا پھر دوسرے کو سپرد کیا) تو یہ زیادتی (مثلاً صورتِ مسئولہ میں پچاس روپیہ) اس کے لیے حلال ہے، ورنہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس زیادتی کو صدقہ کرے۔ کما یدل علیه هذه المسئلة:

ولو دفع الی اسکاف ادیماً لیقطع له خفا ویخرز ہ بأربعة دراهم فدفعه الی آخر بدرهمین ان اعطاه واداه من عنده او عمل بعض الاعمال طابت له الزیادة والا یتصدق بها کذا فی التتارخانیة. (فتاویٰ عالمگیری ۴/ ۵۲۰)

دوسری صورت یہ ہے کہ بھینس کے مالک نے سالویز فارم والے کو اس کا وکیل بنایا کہ تم بھینس کی پرورش کا کام دوسرے آدمی سے اتنی مقدار اجرت میں کراؤ، اور اس نے اس سے کم میں وہ کام کرایا، (مثلاً صورت مسئولہ میں ڈیڑھ سو میں کرانے کے بجائے سو میں کرایا) تو اس صورت میں سالویز فارم والے کے لیے ضروری ہے کہ بھینس کے مالک سے وہی کم مقدار جس میں اس نے دوسرے سے کام کرایا ہے وصول کرے، اور کام کرنے والے کو ادا کرے، (مثلاً صورتِ مسئولہ میں صرف سو روپئے) مؤکل (مالکِ بھینس) کی مقرر کردہ پوری مقدار وصول کر کے زیادتی اپنے پاس رکھ لینا حرام و ناجائز ہے۔

الوكيل بالاستيجار يملك الاستئجار بالدراهم والدنانير والمكيل والموزون اذا كان بغير عينه، ولا يملك الاستئجار بعرض بعينه ولا بمكيل او موزون بعينه. كذا في المحيط. ولو آجرها باكثر مما سمى له من الدراهم جاز، وكذلك الوكيل بالاستئجار مدة معلومة بدراهم مسماة اذا استأجرها بأقل من ذلك. كذا في المبسوط. (عالمگیری ۳/ ۶۰۲)

الوكيل اذا خالف ان خلافا الى خير في الجنس كبع بألف درهم، فباعه بألف ومأة نفذ. (درمختار على هامش الشامي ٤/ ٤٥٢) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

مبیع پر قبضہ کیے بغیر بیع کرنا

سوال: زید ایک بڑا تاجر ہے، جس سے عمر نے ایک ٹن اناج خرید کیا، اور دس فیصد نفع لے کر بکر کو اس طرح بیچ دیا کہ زید سے کہا میں نے تم سے جو ایک ٹن اناج خریدا ہے وہ بکر کو پہنچا دو، چنانچہ زید نے وہ مال بکر کو پہنچا دیا، عمر نے نہ تو اس مال کا قبضہ لیا نہ وزن کیا ہے، شرعاً یہ بیع درست ہے؟

نوٹ: عمر اگر مال کو تولے اور قبضہ لے تو مزدوری کے اخراجات اتنے کافی ہوتے ہیں کہ بازار میں وہ پورا نفع لے کر تو کیا، کم نفع پر بھی تجارت نہیں کر سکتا ہے، کیوں کہ عام تاجر اسی طرح بغیر تولے اور بغیر قبضہ لیے بیچتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع درست نہیں۔ فلا یصح اتفاقا ککتابة و اجارة و بیع منقول قبل قبضه ولو من بائعه كما سيجئ. (درمختار)

ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لانه عليه الصلوة والسلام نهى عن بيع مالم يقبض الخ (هدايه)

اناج کے سلسلہ میں یہ مسئلہ مجمع علیہ ہے۔ (تکملہ فتح الملہم ۳۵۰/۱) **فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔**

دلال کی اجرت

سوال: آج کل عام طور پر منڈیوں پر، غیروں کے قبضہ و تسلط کی وجہ سے کاروبار میں شرعی اصول کی رعایت نہیں رکھی جاتی، اور عموم کی وجہ سے کوئی ان اصول کی رعایت کرنا چاہے تب بھی نہیں کر سکتا، اور تمام کاروباری بھی اس کے عادی ہو جانے کی وجہ سے منازعت بھی نہیں پائی جاتی، مثلاً: ہم چھوٹے تجار کو جب بھی کوئی مال، اناج، کپڑا وغیرہ لینا ہو تو دلال کو آرڈر دینا ہوتا ہے، دلال اصل بڑے تاجر کو آرڈر دیتا ہے، وہ بڑا تاجر دلال کے آرڈر کے مطابق ہم کو مال روانہ کر دیتا ہے، اور دلال کا کمیشن اس پر لگ جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ دلال کا اس طرح بے دیکھے، بے تولے اور بغیر قبضہ کے مال روانہ کر دینا ایسے ہی ہمارا اس سے اس طرح خریدنا جب کہ بڑا تاجر ہم کو براہِ راست نہیں دیتا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دلال بائع و مشتری کے درمیان معاملہ کرا دیتا ہے اور اپنے کام کی اجرت بصورتِ کمیشن وصول کرتا ہے، یہ درست ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۴/۱۷۰، شامی ۵/۴۴)

جو مال خریدا جاتا ہے اس کا نمونہ دیکھا جاتا ہے، اس کی قیمت بھی متعین ہوتی ہے اور مقدار بھی، گویا معاملہ بڑے تاجر اور چھوٹے تاجر کے درمیان ہوا، دلال نے دونوں کے درمیان رابطہ کا کام دیا؛ اس لیے یہ معاملہ درست ہے؛ البتہ خریدا ہوا مال نمونہ کے مطابق نہ ہو یا اس میں کوئی عیب ہو، تو مشتری کو خیار رویت یا خیار عیب حاصل ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مبیع تَولوانے کی اجرت بائع کے ذمہ ہے

سوال: تجارت میں بعض زیادہ وزنی اشیاء کا بذریعۂ مزدور تول کیا جاتا ہے جس کی مزدوری یعنی مزدور کی اجرت مشتری سے لی جاتی ہے، اور کبھی تاجر ایسی اشیاء کو اپنے ملازم سے تلوا کر مشتری سے مزدوری وصول کر کے خود لے لیتا ہے، شرعاً یہ دونوں صورتیں صحیح ہیں جب کہ عرفاً مشتری کو مجبوراً یہ مزدوری دینا ہی پڑتی ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مبیع کو تَولوانے کی اجرت بائع کے ذمہ ہے۔

(واجرة كيل ووزن وعد وذرع على البائع) لانه من تما م التسليم. (درمختار) (قوله لانه من تمام التسليم) اذ لا يتحقق تسليم المبيع الا بكيله ووزنه ونحوه. ومعلوم ان الحاجة الى هذا اذا باع مكايلة او موازنة و نحوه اذ لا يحتاج الى ذلك فى المجازفة. الخ (شامى ٤/ ٤٦)

بائع کا یہ اجرت مشتری سے وصول کرنا ظلم ہے اور وہ گنہ گار ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

دال کی بوری کے ساتھ بیع کرنا

سوال: بعض مرتبہ مبیع پیک ہوکر آتی ہے اور ظرف بھی معتد بہ وزن کا ہوتا ہے، مثلاً دال جس بوری میں آتی ہے وہ ایک کیلو کے لگ بھگ وزن کی بوری ہوتی ہے؛ لیکن عام طور پر بوری کا وزن وضع نہیں کیا جاتا، بلکہ مبیع کے وزن کے ساتھ بوری کا وزن بھی اسی بھاؤ میں شامل کرلیا جاتا ہے، مثلاً: انچاس کیلو دال ہے اور ایک کیلو بوری ہے تو پچاس کیلو کی دال کی بوری شمار ہوکر پورے پچاس کیلو دال کی قیمت وصول کی جاتی ہے؛ کیونکہ گاہک عام طور پر بوری کی قیمت الگ سے دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، مذکورہ حال میں اس طرح کی بیع درست ہے، بڑی منڈی سے پچاس کیلو دال کی بوری آئی ہے جس میں انچاس کیلو دال اور ایک کیلو بوری کا وزن ہوا ہے تو زید تاجر کے لیے بازار کے عام عرف کے مطابق پچاس کیلو دال کے حساب سے اس بوری کا بیچنا درست ہے یا نہیں بصورتِ عدمِ جواز شرعاً کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟ انچاس کیلو دال اور ایک کیلو کی بوری ہے، بوری کی قیمت پانچ روپئے اور دال کی قیمت سات روپئے اگر پچاس کیلو کی قیمت لے کر گاہک کو دیتے ہیں تو وہ بخوشی لیتا ہے؛ لیکن اگر انچاس کیلو دال کی قیمت لے کر بوری کی قیمت الگ مانگتے ہیں تو گاہک ناراض ہوتا ہے، اور چلا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں شرعاً کیسا کرنا چاہیے، کیا پچاس کی قیمت لے سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر سودا کرتے وقت یہ کہا گیا کہ: پچاس کیلو دال اتنی قیمت کے عوض آپ کے ہاتھ فروخت کی جارہی ہے، تو اس صورت میں ضروری ہے کہ بائع پورے پچاس کیلو دال مشتری کے حوالہ کرے، اور اگر بوری بائع کی ہے تو اس کی قیمت الگ وصول کرسکتا ہے، ہاں اگر یہ کہہ کر فروخت کیا کہ بوری کے ساتھ اس کا وزن پچاس کیلو ہے، جس کی مجموعی قیمت یہ ہے، تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح مشتری بھی بعد میں فروخت کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

وصح بيع الطعام كيلا وجزافا. (تنویر الابصار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ٹرانسپورٹ کے ذریعہ مبیع روانہ کی اور ضائع ہوگئی تو ذمہ دار کون؟

سوال: تاجر نے مشتری کی طلب پر بذریعۂ ٹرانسپورٹ مال روانہ کیا راستہ میں مال ضائع ہوگیا، تو اس نقصان کو تاجر برداشت کرے گا یا مشتری؟ بالفرض اگر آج کے عرف میں تاجر کے ذمہ نقصان آتا ہو تو مشتری کے لیے تاجر سے اس نقصان کا وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

جو مال ڈاک یا ریل وغیرہ (مثلاً ٹرانسپورٹ) کے ذریعہ سے روانہ کیا جائے وہ اس کے قبضہ میں سمجھا جائے گا جس نے یہ حکم دیا ہو، پس اگر خریدار نے لکھا کہ فلاں مال ریل یا ڈاک (یا ٹرانسپورٹ) میں بھیج دو اور ضائع ہوگیا تو بائع ذمہ دار نہیں، اس نے گویا مشتری کے وکیل (یعنی ڈاک یا ریل یا ٹرانسپورٹ) کے حوالہ کردیا، اور اگر اس کا یہ حکم نہ تھا بائع نے خود بھیجا، تو نہ روانگی تسلیمِ مبیع ہے، نہ مشتری ذمہ دار۔ (عطر ہدایہ ۱۰۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

مبیع کی قیمت ادا کرنے کے وقت زیادتی کا مطالبہ

سوال: کپڑے کی منڈی میں خود منڈی والوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں، چونکہ علی العموم کاروباری غیر مسلم ہوتے ہیں؛ اس لیے لامحالہ اصول بھی انھیں کے مزاج کے ہوتے ہیں، جو بسا اوقات ہماری شریعت کے مخالف ہوتے ہیں؛ لیکن اگر ہم ان کی رعایت نہ رکھیں، تو ہم کو منڈی سے نکال باہر کیا جائے گا، اور منڈی میں ہم سے کوئی معاملہ نہ کرے گا، مثلاً: جب ہم مال خریدتے ہیں تو قیمت ادا کرنے میں ایک ماہ کی مہلت ملتی ہے، ایک ماہ تک ادا کر دیں تو کوئی سود نہیں لگایا جاتا؛ لیکن اگر بالفرض کسی بھی وجہ سے خواہ کیسی ہی شدید مجبوری ہو کچھ دن مہینہ کے اوپر گزر گئے تو سود لیتے ہیں، سود نہ دینے پر دوسری بار ہم سے کوئی تاجر معاملہ کرنے پر تیار نہیں ہوتا، تو اس طرح کی شرائط کے ساتھ ان مجبوری کی مذکورہ صورتوں میں ہم بیع و تجارت کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر عقدِ بیع میں ایسی شرط رکھی گئی ہے، تو یہ معاملہ یقیناً سودی ہوگا، اور اگر عقد میں ایسی شرط نہیں تو معاملہ درست ہے، اور اس کے بعد اگر وہ زائد وصول کرتا ہے تو یہ ظلم ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیع مجازفۃً کی ایک صورت

سوال: زید نے منڈی سے پچاس کیلو دال کی ایک بوری خریدی جس میں دال تو انچاس کیلو ہی تھی، ایک کیلو وزن تو بورئیے کا تھا؛ لیکن منڈی والے سے وہ پچاس کیلو کی قیمت سے خریدی، اب زید کے لیے اسی طرح پچاس کیلو بتا کر کسی کو بیچنا درست ہے یا نہیں؟

نوٹ: حقیقۃً بوری کا وزن کیلو سے کم و بیش ہوتا ہے؛ لیکن عرف میں وہ کیلو ہی

شمار کرتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر بوری کا مجموعی وزن پچاس کیلو ہے اور یہ کہہ کر بیچتا ہے کہ بوری کے ساتھ پچاس کیلو وزن ہے تو درست ہے، مناسب یہ ہے کہ بوری کی طرف اشارہ کر کے بتلا دے کہ یہ بوری اس قیمت میں بیچی؛ تا کہ یہ بیع مجازفۃً ہو کر بلا تردد درست ہو جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: زید نے منڈی سے پچاس کیلو دال کی ایک بوری خریدی، اور انچاس کیلو دال کی قیمت اور الگ سے بوری کی قیمت دی، اب زید کے لیے مشتری کو اسی طرح دال اور بوری کی قیمت الگ الگ کر کے بیچنا ضروری ہے یا مع بوری کے پچاس کیلو کہہ کر بیچنا بھی درست ہے؟

نوٹ: حقیقۃً بوری کا وزن کیلو سے کم و بیش ہوتا ہے؛ لیکن عرف میں وہ کیلو ہی شمار کرتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وزن کا تذکرہ نہ کیا جائے پوری بوری کا سودا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ بوری کی طرف اشارہ ضرور ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

وزن کیے بغیر مبیع کا استعمال

سوال: زید تاجر ہے، مسلم گاہک (مشتری) فون سے یا زبانی کہہ جاتا ہے کہ فلاں فلاں اشیاء اتنی اتنی مقدار میں مجھے چاہیے، تم تیار رکھو یا کسی کے ساتھ بھیج دو، زید نے اس کے حکم کے مطابق وہ چیزیں تیار کر کے گاہک کے گھر بھیج دی یا گاہک خود آ کر لے گیا،

گاہک نے نہ تو چیزیں دیکھیں، نہ اپنے سامنے وزن کرایا تو اس مشتری کے لیے وزن کیے بغیر ان اشیاء کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس صورت میں تجربہ یہ ہے کہ مشتری اور بائع کے درمیان کوئی منازعت نہیں ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست نہیں ہے۔ اشتریٰ مکیلاً بشرط الکیل حرم ای کرہ تحریماً بیعه واکله حتی یکیله، وقد صرحوا بفساده وبأنه لا یقال لآکله انه اکل حراماً لعدم التلازم کما بسطه الکمال لکونه اکل ملکه، ومثله الموزون والمعدود بشرط الوزن والعدد لاحتمال الزیادة وهی للبائع. (درمختار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقد ثمن کی صورت میں کمیشن

سوال: تاجر زید نے بڑی منڈی سے کرانہ کی تجارت کا مال خریدا، فروخت کرنے والا غیر مسلم ہے، اس نے زید سے کہا کہ اشیاء کی قیمت یہ ہے؛ لیکن اگر نقد رقم دو تو فیصد دو روپیہ کمیشن دیا جائے گا، زید کے لیے اس طرح کی بیع درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ وفی البزازیة: باعه علی ان یهبه من الثمن کذا لا یصح. ولو علی ان یحط من ثمنه کذا جاز للحوق الحط باصل العقد دون الهبة. (درمختار) (قوله للحوق الحط باصل العقد) کأنه باعه ابتداء بالقدر الباقی بعد الحط. ط. اي بخلاف الهبة فکان شرطا لا یقتضیه العقد وفیه نفع لاحدهما. (شامی ٤/ ١٨٨) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

تھیلی اور کاغذ مبیع میں شامل ہے

سوال: پرچورن تاجر عام طور پر اشیاء پلاسٹک کی تھیلی یا کاغذ میں لپیٹ دیتے ہیں، اور اشیاء کا وزن کرنے میں اس تھیلی یا کاغذ کو شامل کر لیتے ہیں، حالانکہ تھیلی اور کاغذ کی قیمت ان اشیاء سے کم وبیش ہوتی ہے، اور خریدار اس کو دیکھتا بھی ہے، اور کچھ کہتا بھی نہیں ہے؛ بالفرض اگر تھیلی یا کاغذ کو وزن میں شامل نہ کرے تو گاہک اس کی قیمت دینے تیار نہیں ہوتے اور نہ چیز کی قیمت ہی بڑھا سکتے ہیں، کیوں کہ اس صورت میں گاہک کم قیمت والوں کے یہاں چلے جاتے ہیں، ایسی صورت میں تھیلی اور کاغذ کو فروخت کردہ اشیاء کے ساتھ وزن میں شامل کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عرف کی وجہ سے یہی سمجھا جائے گا کہ اس مبیع موزون کا وزن مع ظرف اتنا ہوگا؛ اس لیے درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقد اور ادھار خریداروں میں فرق کرنا

سوال: تاجر اپنے نقد اور ادھار خریداروں کو خوب جانتا ہے؛ اس لیے جب کوئی نقد خریدنے والا تاجر سے اشیاء کی قیمت معلوم کرتا ہے تو اس کو کم دام بتاتا ہے، اور جب ادھار خریدنے والا بھاؤ معلوم کرتا ہے تو اس کو زیادہ بھاؤ بتاتا ہے، جس کو خریدار قبول کرتا ہے، اس طرح کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۲/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

''زائد بھاؤ'' کا عرف

سوال: زید اپنے ان گاہکوں کو جو ادھار مال خریدتے ہیں، پہچانتا ہے؛ اس لیے جب بھی وہ اشیاء کی قیمت معلوم کرتے ہیں، کچھ زیادہ قیمت بتاتا ہے، وہ گاہک اس کو قبول بھی کرتے ہیں؛ لیکن بعض مرتبہ گاہک چند چیزوں کا آرڈر دے کر چلا جاتا ہے، بھاؤ معلوم نہیں کرتا، دوبارہ آنے پر ان سب اشیاء کی قیمت مجموعی اسی زائد بھاؤ کے حساب سے گاہک کے ذمہ لکھ دیتا ہے، وہ اپنی اشیاء لے کر چل دیتا ہے تو اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس زائد بھاؤ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اگر مراد سابقہ بھاؤ ہے جو اس نے پہلے بتلایا تھا اور عرفِ تجار میں یہ طریقہ رائج و معتبر ہے تو معاملہ درست ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کار ڈرائیور کا تاجر سے پارٹس خریدنا اور کار کے مالک کا قیمت ادا کرنا

سوال: زید ٹریکٹر وغیرہ کے پارٹس (پرزوں) کا تاجر ہے عمر اس سے کہتا ہے کہ میری موٹر فلاں نمبر کی بکر ڈرائیور چلاتا ہے اگر کبھی وہ پارٹس وغیرہ لینے آئے تو دے دینا قیمت میں ادا کروں گا، اتفاق سے چند دن کے بعد عمر کی موٹر خراب ہوئی بکر ڈرائیور اس کو میکینک کے پاس لے گیا، میکینک نے کہا فلاں فلاں اشیاء کی ضرورت ہے، بکر زید کی دوکان سے وہ اشیاء خرید لایا، عمر نے چند روز کے بعد زید سے معلوم کیا کہ بکر کتنی قیمت کا سامان لے گیا، زید نے بتایا کہ ایک ہزار ایک روپیہ کا، عمر نے وہ قیمت ادا کر دی، سوال یہ ہے کہ اس طرح معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب بکر وہ اشیاء لینے آوے اس وقت اس کو ان اشیاء کی قیمت بتلا دے تو کوئی

حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۲/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

کھیت کی حفاظت کا کرایہ اسی کھیت کے غلہ سے

سوال: کھیتی کی پرندوں وغیرہ سے حفاظت کے لیے ایک شخص اجرت پر رکھا جاتا ہے اور اس کی اجرت اسی فصل کا ایک حصہ مثلاً عشر، نصف عشر وغیرہ طے کیا جاتا ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ اجارۂ فاسدہ ہے، اگر محافظ نے اپنا کام انجام دے دیا تو وہ اجرتِ مثل کا حق دار ہوگا جو مقرر حصۂ فصل سے زیادہ نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

قرض دینے کی وجہ سے اجرت کم طے کرنا

سوال: کھیتی کے سلسلہ کے کاموں کے لیے ایک شخص کو سال بھر کے لیے اجرت پر رکھا جاتا ہے، اس کے مانگنے پر کچھ رقم اس کو پیشگی بطورِ قرض دی گئی، اور؛ اس لیے اس کی اجرت کم طے کی گئی اس طرح قرض دینے کی وجہ سے کم اجرت متعین کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرض کی بنیاد پر اجرت میں کمی رکھنا درست نہیں ہے۔ ''کل قرض جر نفعاً فهو حرام'' کا مصداق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

مزدور کو قرض نہ دینا اور اجرت طے کرنا

سوال: کھیتی کے سلسلہ کے کاموں کے لیے ایک شخص کو سال بھر کے لیے مزدور

طے کیا گیا، مزدور نے کچھ رقم بطورِ قرض پیشگی مانگی، جو مالک نے نہیں دی؛ لیکن اس کی اجرت جتنی ہونی چاہیے تھی پوری پوری طے کی، اس میں شرعاً کچھ حرج تو نہیں ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کوئی حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۲/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

گڑ سے چائے بنائی اور پھٹ گئی تو یہ گڑ میں عیب ہے؟

سوال: زید نے گڑ خریدا اور گھر جا کر چائے بنائی تو پھٹ گئی تو گاہک کو اس گڑ کے واپس کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عیب وہ بات ہے جس کی وجہ سے مال فروخت شدہ کی قیمت تاجروں اور جاننے والوں کے نزدیک کم ہو جائے۔

من وجد بمشريه ما ينقص الثمن ولو يسيرا. جوهره. عند التجار المراد بهم: ارباب المعرفة بكل تجارة وصنعة الخ (درمختار) (قوله بكل تجارة) الاولى من كل تجارة. قال ح: يعني انه يعتبر فى كل تجارة اهلها وفى كل صنعة اهلها. (شامى ٤/٨٠)

صورتِ مسئولہ میں بھی اگر چائے کے گڑ میں یہ بات عیب شمار ہوتی ہے اور یہ عیب گڑ میں پہلے سے ہے یعنی بائع کی ملکیت ہی میں پیدا ہوا تھا تو خریدار کو خیارِ عیب حاصل ہے بشرطیکہ بائع نے بوقتِ عقد اس کو بیان نہ کیا ہو اور نہ ہی اس نے تمام عیوب سے براءت کی شرط کی ہو۔ (كما هو فى كتب الفقه في باب خيار العيب) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خیارِ عیب کب ساقط ہوجاتا ہے؟

سوال: بلا عیب اور عیب کی وجہ سے بیع کے فسخ کرنے کا اختیار کب تک ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بوقتِ عقد یا قبضۂ مبیع عیب پر خریدار کو واقفیت ہو، یا عقد و قبضہ کے بعد خریدار عیب پر راضی ہوجائے، یا بائع نے ہر عیب سے براءت ظاہر کردی تھی، یا صلح کرلی تھی، یا کسی معین عیب کے متعلق خریدار نے یہ اقرار کرلیا کہ یہ عیب موجود نہیں ہے، تو ان تمام صورتوں میں خیارِ عیب ساقط ہوجاوے گا۔

قال فی البحر والی هنا ظهر ان خيار العيب يسقط بالعلم به وقت البيع او وقت القبض او الرضا به بعدهما او اشتراط البراءة من كل عيب الخ (شامی ۴/ ۱۱۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیع وفا کی ایک صورت

سوال: زید نے اپنی کھیتی کی پیداوار رائی یا بازار سے خرید کردہ رائی بھاؤ بڑھنے پر بیچنے کے لیے رکھی تھی، اسی اثناء میں بکر کو کسی وجہ سے نقد رقم کی ضرورت ہوئی، بے سودی قرض ملا نہیں؛ اس لیے اس نے زید سے رائی ایک سال کے بعد قیمت ادا کرنے کے وعدہ سے بازار کے عام بھاؤ اَسّی روپیہ بیس کلو کے بجائے ایک سو روپیہ بیس کلو کے حساب سے خریدی اور بازار میں جاکر عام بھاؤ ۸۰/ روپئے بیس کلو سے بیچ آیا، کیا زید کے لیے صورتِ مذکورہ میں زیادہ بھاؤ سے بیچنا اور بکر کے لیے اس طرح زیادہ بھاؤ میں لے کر کم بھاؤ میں بیچنا تاکہ نقد رقم حاصل ہوجائے درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے؛ لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ (شامی ۴/ ۳۱۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ   یکم ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مبیع کم قیمت پر بائع ہی کو بیچنا

سوال: زید نے اپنی کھیت کی یا خرید کی ہوئی رائی اپنے پاس رکھی تھی تا کہ بھاؤ بڑھنے پر اسی کو بیچے، اس اثناء میں بکر کو کسی وجہ سے نقد رقم کی ضرورت ہوئی بلا سود کے قرض نہ ملنے پر اس نے زید سے وہ رائی بازار کے عام بھاؤ اَسّی روپئے بیس کلو کے بجائے بڑھا کر ایک سو روپئے بیس کلو کے حساب سے ایک سال کے بعد رقم ادا کرنے کے وعدہ سے خرید لی، پھر وہی رائی اسی زید کو اَسّی روپئے بیس کلو کے حساب سے نقد قیمت میں بیچ دی اور نقد رقم کر لی، زید اور بکر دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس طرح معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ درست نہیں۔

سئل فيما اذا باع زيد جاريته من عمرو بيعا باتا شرعيا بثمن قدره ثلث مأة قرش حال فی الذمة، ثم بعد ماتسلمها عمرو ومضی شهران طالب زيد عمراً بالثمن، فباعه الجارية سليمة بمأتين وخمسين قرشا ودفع عمرو لزيد خمسين قرشا بقية الثمن الذي اشتراها به من زيد فكيف الحكم؟

(الجواب): حيث باعها من البائع بأقل مما اشتریٰ قبل نقد الثمن والثمن متحد يكون البيع الثانی فاسداً، ولزيد مطالبة عمرو ببقية الثمن الاول.

والله أعلم. الخ (تنقيح الفتاوى الحامدية ١/ ٢٥٧)

لو باع شیئا وقبضه المشتری ولم یقبض البائع الثمن فاشتراه باقل من الثمن الاول لا یجوز. الخ (شامی ۴/ ۱۲۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقد رقم حاصل کرنے کے لیے بیع

سوال: بکر کو ایک رقم کی ضرورت تھی، زید نے اس سے کہا میں نقد رقم تو تجھ کو نہیں دے سکتا؛ البتہ غلہ ادھار دے سکتا ہوں جسے تو بیچ کر نقد رقم بنا سکتا ہے؛ چنانچہ بکر نے اتفاق کر لیا اور زید نے عمر سے اَسّی فی من کے حساب سے غلہ لا کر بکر کو ایک سال کے وعدہ سے ایک سو روپئے من کے حساب سے بیچ دیا، جس کو بکر نے خرید کر بازار میں اَسّی روپئے من کے حساب سے بیچ کر نقد رقم بنالی، کیا زید کا صورت مذکورہ میں اس طرح بیع کرنا شرعاً درست ہے یا اس میں کوئی حرج ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے بشرطیکہ زید کا تاجر سے گٹھ جوڑ نہ ہو، اور بکر بعد میں اُسی تاجر سے نہ بیچے۔ (کما یفهم من الشامیة ۴/ ۳۱۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک تاجر سے سامان خرید کر دوسرے تاجر سے بل لینا

سوال: زید تاجر نے ایک دوسرے تاجر سے دس ہزار کی رقم کا سامان خریدا؛ لیکن اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے اس تاجر نے زید کو بل نہیں دیا، زید کو سرکار میں حساب پیش کرنے کے لیے بل کی ضرورت ہے اس نے بکر نامی تاجر کے پاس جا کر کہا کہ میں نے اس طرح دس ہزار کا مال فلاں تاجر سے خریدا ہے؛ لیکن اس نے بل نہیں دیا تو کیا تم مجھے بل دے سکتے ہو؟ بکر نے کہا ضرور؛ لیکن فی صد پانچ روپئے اس بل دینے کے عوض دینے ہوں گے، سوال یہ ہے کہ زید کے لیے اس طرح عوض دے کر بل لینا اور بکر کے لیے بغیر مال کے

صرف بل دینے کے عوض بل کی رقم کا پانچ فیصد یا کم وبیش فیصد لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست نہیں ہے، فریب اور دھوکہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کی تدبیر کا حکم

سوال: حکومت تاجروں سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کرنے کے لیے تاجروں کے حساب کتاب کو باقاعدہ دیکھتی ہے، تاجر لوگ ان ٹیکسوں سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے ہیں، شرعاً اس طرح سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کے لیے تدبیریں کرنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کے ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کے لیے کوئی جائز تدبیر اختیار کرنا درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: سرکاری ٹیکسوں سے بچنے یا ان کی مقدار کم کرنے کے لیے ایک تدبیر تجاریہ بھی کرتے ہیں، کہ نفع کی رقم کو دوسرے کی بتاتے ہیں اور اس دوسرے کو اس بات پر رضامند کر لیتے ہیں کہ ہم تمہاری طرف سے اتنی رقم اپنے یہاں جمع کر لیں گے اس کو حوالہ لینا کہتے ہیں، اور دوسرے کے اس فعل کو حوالہ دینا کہتے ہیں، حوالہ دینے والا اس حوالہ دینے کے عوض کچھ رقم بھی حوالہ لینے والے سے مانگتا ہے، تو کیا اس طرح حوالہ دینے پر رقم لینا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسئولہ حوالہ دینے پر رقم لینا اس طرح کہ مشروط ہو درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کوٹیشن دینا

سوال: حکومت چھوٹے صنعت کاروں اور دست کاروں کے لیے سلائی مشین جیسی مشینوں وغیرہ کے لیے رقم دیتی ہے؛ لیکن اس رقم لینے کے لیے رقم حاصل کرنے والے کو دوکان دار سے لے کر بھاؤ بل پیش کرنا پڑتا ہے، جتنا بھاؤ اس بھاؤ بل میں لکھا ہوتا ہے اتنی رقم ملتی ہے اس بھاؤ کو کوٹیشن کہتے ہیں، اس کوٹیشن سے حکومت بذریعہ بینک لون دیتی ہے تو اس کوٹیشن کا دینا زید تاجر کے لیے درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس صنعت کار یا دست کار نے دوکان سے مال خریدا ہے، اور دوکان دار نے اس کا بل دیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر بھاؤ بل کا کچھ اور مطلب ہے تو اس کی وضاحت کی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

جعلی چیک حاصل کر کے حکومت سے روپئے وصول کرنا

سوال: حکومت چھوٹے صنعت کاروں کو مشین وغیرہ لینے کے لیے رقم دیتی ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مدد چاہنے والے کو پہلے تاجر سے بھاؤ بل لے کر پیش کرنا ہوتا ہے، اس پر حکومت بینک کے ذریعہ چیک دلواتی ہے، بعض لوگ اس ترکیب سے اس چیک کو حکومت سے حاصل کرتے ہیں؛ لیکن مشین نہیں خریدتے بلکہ تاجر کو وہ چیک دے کر نقد رقم لے لیتے ہیں، تاجر بھی فیصد کچھ کم کر کے نقد رقم دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ مدد خواہ کے لیے اس طرح سے مشین لینے کے لیے، لیے ہوئے چیک سے بجائے مشین کے رقم لینا صحیح ہے؟ نیز تاجر کا بغیر مال بیچے ہوئے چیک کو لے کر نقد روپیہ دینے کے عوض کمیشن کی رقم لینا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس میں فریب و کذب دونوں موجود ہیں، جو ناجائز اور حرام ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اینٹ کی بیع استصناع

سوال: زید اینٹ بنانے اور فروخت کرنے کا کاروبار کرتا ہے، ابھی اس کے پاس اینٹیں نہیں ہیں؛ لیکن بکر اس کے پاس آتا ہے اور دس ہزار اینٹیں خریدنا چاہتا ہے، زید نے کہا دو کلو وزن کی تیار اینٹ تین سو روپئے ہزار کے حساب سے بھٹہ پکنے پر تمھارے گھر پہنچادوں گا، اس کی قیمت ابھی مجھے دیدو، بکر نے قیمت دیدی اور معاملہ کرلیا سوال یہ ہے کہ نہ مبیع موجود ہے، نہ مبیع کے سپرد کرنے کا متعین وقت طے ہوا ہے، اور نہ مبیع کا نمونہ ہی موجود ہے، ایسی صورت میں اس بیع کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز آج کل اس میں ابتلائے عام ہے؛ اس لیے ناجائز ہونے کی صورت میں جواز کی آسان صورت کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع درحقیقت استصناع ہے جو درست ہے، اس میں یہ ضروری ہے کہ جس چیز کے بنانے کا آرڈر دیا جارہا ہے اس کی جنس، نوع، مقدار، اور وصف معلوم ہونے کے ساتھ لوگوں میں اس چیز کو آرڈر دے کر بنوانے کا عرف ہو۔ (انظر لتفصیل احکامه البدائع الصنائع ۵/ ۲،۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک تاجر کا دوسرے تاجر سے کھاد خرید کر گاہک کو دینا

سوال: زید اور بکر ایک غیر مسلم تاجر سے ولایتی کھاد خریدنے کے لیے گئے، اور اس سے بھاؤ مقرر کر کے خریدا، اس کے بعد تاجر نے کہا کہ مال اس وقت میرے پاس اسٹاک میں نہیں ہے، لو یہ رقم اور فلاں دوکان سے میری طرف سے خرید لو، ان دونوں سے

تاجر نے جس بھاؤ میں فروخت کیا تھا اس کے مقابلہ میں اس دوسرے تاجر کا بھاؤ کم ہے سوال یہ ہے کہ زید اور بکر کے لیے اس طرح خریدنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ معاملہ درست نہیں بلکہ بیع باطل ہے۔

''درمختار'' میں ہے:(وبیع مالیس فی ملکه) لبطلان بیع المعدوم الخ (قوله لبطلان بیع المعدوم) اذ من شرط المعقود علیه ان یکون موجوداً مالاً متقوماً مملوکاً فی نفسه وان یکون ملك البائع فیما یبیعه لنفسه. (شامی ۱۱۸/٤)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۴/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مبیع پر ملکیت سے پہلے بیع باطل ہے

سوال: زید اور بکر نے ایک غیر مسلم تاجر سے ولایتی کھاد مقررہ بھاؤ میں ادھار خریدا؛ لیکن تاجر کے پاس اسٹاک میں مال موجود نہیں تھا؛ اس لیے زید کو رقم دے کر کہا تم میری طرف سے وکیل ہو، فلاں دوکان سے کھاد خرید کر بکر کو دیدو، اور بکر کو رقم دے کر کہا کہ تم میری طرف سے وکیل ہو فلاں دوکان سے خرید کر زید کو دیدو، اس دوکان کا بھاؤ اس سے کم تھا جو زید و بکر سے غیر مسلم تاجر نے کہا تھا سوال یہ ہے کہ شرعاً یہ صورت زید و بکر کے لیے درست ہے، بالفرض اس غیر مسلم تاجر کی جگہ کوئی مسلمان ہو تو اس کے لیے بھی ایسا کرنے کا شرعاً جواز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس وقت سودا ہوا اس وقت مبیع بائع کی ملک میں نہیں تھی، اور یہ بیع سلم بھی نہیں

ہے؛اس لیے صورتِ مسئولہ میں بیع باطل ہے۔

(وبيع ماليس فى ملكه) لبطلان بيع المعدوم. (درمختار) (قوله وبيع ماليس فى ملكه) فيه انه يشمل بيع ملك الغير بوكالة او بدونها مع ان الاول صحيح نافذ والثانى صحيح موقوف وقد يجاب بان المراد بيع ما يملكه قبل ملكه له ثم رأيته كذلك فى الفتح فى اول فصل بيع الفضولى، وذكر ان سبب النهى فى الحديث ذلك. (قوله لبطلان بيع المعدوم) اذ من شرط المعقود عليه ان يكون موجوداً مالاً متقوماً مملوكاً فى نفسه وان يكون ملك البائع فيما يبيعه لنفسه. وان يكون مقدور التسليم.منح.(شامی ۱۱۸/۴)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ:العبداحمدعفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ عفی عنہ ۳/ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

شرکاء کا منافع سے دوسری دوکان خریدنا

سوال: چند شرکاء نے مل کر ایک دوکان شروع کی اس میں جو منافع حاصل ہوئے ہیں وہ ایک ذمہ دار کے پاس جمع رہتے ہیں،سال دوسال کے بعد وہ ذمہ دار اپنے شرکاء سے کہتا ہے کہ دولاکھ روپئے کی رقم منافع سے جمع ہوئی ہے،میراارادہ ہے کہ اس سے ہم دوسری دوکان خرید لیں،اس پر سب رضامند ہوگئے،اور جس شریک کا جتنا حصہ پہلی دوکان میں تھا اسی حساب سے دوسری دوکان میں بھی حصہ رکھ کر دوسری دوکان خرید لی، شرعاً یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

یہ صورت شرعاً درست ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

منافع سے خریدی گئی دوکان کے منافع میں کمی وبیشی

سوال: چند شرکاء کی ایک دوکان ہے، اس میں حاصل شدہ نفع کی رقم ذمہ دار کے پاس جمع رہتی ہے، کچھ مدت کے بعد وہ ذمہ دار کہتا ہے کہ اپنی دوکان میں اتنا نفع ہوا ہے جس کی اتنی رقم میرے پاس جمع ہے، میری رائے ہے کہ اس سے ہم دوسری دوکان خرید لیں؛ لیکن حصے پہلی دوکان کی طرح نہ رہیں گے، بلکہ کم وبیش ہوں گے، اور رقم سب اس میں لگ جائے گی کچھ واپس نہ ملے گی، سوال یہ ہے کہ جب منافع کی جو رقم اس نئی دوکان کے خریدنے میں صرف کی جارہی ہے، اس میں ہر حصہ دار کا متعین حصہ ہے، تو اس دوسری دوکان میں حصہ میں کم وبیش کرنا درست ہے، بعض شرکاء ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں، جو دل سے اس بات پر رضامند نہیں ہوتے؛ لیکن ڈرتے ہیں کہ اگر اس ذمہ دار کی مرضی کے خلاف کچھ کہا تو ہم کو شریک نہ کیا جائے گا؛ اس لیے مصلحۃً خاموش رہتے ہیں، یا صراحۃً دل کی بات کے خلاف اپنی خوشی ظاہر کرتے ہیں، لہذا اس طرح کی شرکت سے نئی دوکان خریدنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حصے کم وبیش ہونے کا مطلب اگر یہ ہے کہ ملکیت میں تو حصے بقدرِ مال ہوں؛ لیکن منافع میں کم وبیش ہوں، تو اگر تمام شرکاء پر عمل کی شرط رکھی گئی ہے، یا جس کے لیے منافع میں زیادہ حصہ تجویز کیا گیا ہے اس پر عمل کی شرط رکھی گئی ہے، تو درست ہے، اور اگر وہ شخص جس کا منافع میں زیادہ حصہ تجویز کیا گیا ہے، اس پر کوئی عمل شرط نہیں کیا گیا، یا اس کا مشروط عمل، دیگر شریک کے مقابلہ میں کم ہے، تو یہ درست نہیں ہے۔

(قوله و مع التفاضل فی المال دون الربح) ای بان یکون لاحدهما الف وللآخر الفان مثلاً، واشترطا التساوی فی الربح وقوله وعکسه ای بان

یتساوی المالان ویتفاضلا فی الربح لکن ھذا مقید بان یشترط الاکثر للعامل منھما او لاکثرھما عملاً اما لو شرطاہ للقاعد او لاقلھما عملاً فلا یجوز کما فی البحر عن الزیلعی و الکمال. قلت والظاھر ان ھذا محمول علی ما اذا کان العمل مشروطا علی احدھما. (شامی ۳/۳۷۳والتفصیل فیه) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

گاہک سے مقدمہ کا خرچہ وصول کرنا

سوال: کوئی گاہک تاجر کو بقایا قرضہ اداء نہیں کرتا، اس تاجر نے کورٹ میں مقدمہ دائر کردیا، اور مقدمہ میں فیصلہ یہ ہوا کہ قرض دار قرضہ کی رقم، مع سود اور مقدمہ کے خرچ کے، ادا کردے، تو سود تو خیر لینے کا کوئی سوال نہیں ہوتا؛ مگر سوال یہ ہے کہ گاہک کی بدمعاملگی اور خلاف عہدی کی وجہ سے تاجر کو مقدمہ میں خرچ کرنا پڑا اور تکلیف اٹھانی پڑی تو مقدمہ کا خرچ گاہک سے وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لیے بجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑیں، تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ لینا، بہت سے علماء کے نزدیک (ومنھم مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۱۲۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۹/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

سودی قرض لینے والے کے ساتھ عقدِ شرکت

سوال: دو آدمیوں نے مشترکہ کاروبار کیا، جن میں سے ایک حصہ دار نے اپنی

حلال کمائی لگائی، اور دوسرے نے بینک سے سود پر رقم لے کر کاروبار میں لگائی، اس حصہ دار میں شریک اول کے لیے جس نے اپنی حلال کمائی کاروبار میں لگائی، کمائی درست ہے یا نہیں؟ نیز اس طرح کے شریک کے ساتھ شریکِ اول کے لیے حصہ داری کرنا درست ہے یا نہیں جب کہ دونوں مسلم ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس نے اپنی حلال کمائی کاروبار میں لگائی، اس کے لیے اپنے حصہ کے منافع درست ہیں؛ لیکن اس قسم کی شرکت سے احترازلازم ہے۔ کما یفهم من الدرالمختار وحاشية رد المحتار للعلامة الشامی تحت قول الدر (و) انما (طاب للبائع ماربح) فی الثمن...... الی ان قال ......الحرمة تتعدد مع العلم بها. الخ (الدر المختار علی هامش الشامی ٤/١٤٤، ١٤٦) وتحت قوله: والبيوع الفاسدة فكلها من الربا، فيجب رد عين الربا لو قائما (٤/١٩٦، ١٩٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: زید کا ایک دوست غیر مسلم مسمیٰ رمیش ہے، زید اپنے دوست رمیش کے ساتھ شرکت میں کاروبار کرنا چاہتا ہے؛ لیکن رمیش کے پاس رقم نہیں ہے؛ اس لیے وہ بینک سے سودی قرض پر رقم لاکر لگاتا ہے، زید کے لیے یہ حصہ داری جائز ہے، یعنی غیر مسلم سود پر رقم لاکر مسلمان کے ساتھ شرکت میں کاروبار کرنا چاہے تو زید مسلم کے لیے یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کا بھی وہی حکم ہے؛ البتہ اس میں شناعت کم ہوگی۔ لان مسئلة خطاب الكفار بفروع الشريعة مختلف فيه. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مشترک رقم سے چندہ دینا درست نہیں ہے

سوال: زید کا کاروبار ایک غیر مسلم ہندو کے ساتھ شرکت میں ہے، دونوں اپنے مذہب کے لیے چندہ لینے آنے والوں کو مشترک رقم میں سے ایک دوسرے کی رضامندی کی وجہ سے چندہ دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس طرح مسلمان کا اپنی کمائی غیروں کے مذہب میں استعمال کے لیے دینا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست نہیں، دونوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حساب میں سے دیں۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۱۲۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

ثمن کی ادائیگی کا وقت مقرر کیے بغیر بیع

سوال: ادھار کاروبار کیا اور ادائیگی کی کوئی مدت مقرر نہیں کی، بغیر مدت کی تعیین کے اس طرح کا معاملہ کرنا، جب کہ باہم تنازع بھی نہیں ہے شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع شرعاً درست نہیں۔ اعلم ان البیع باجل مجھول لا یجوز اجماعاً الخ (شامی ٤/١٣٤) بعض متعاقدین کے مابین تنازع کا نہ ہونا علت کے منافی نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کپڑے کے تھانوں پر میٹر کی لکھی ہوئی مقدار میں کمی بیشی کے ساتھ بیع کا حکم

سوال: کپڑے کا تاجر میلہ یا منڈی سے جو کپڑا خرید کر لاتا ہے وہ تھانوں کی

شکل میں ہوتا ہے، اور تھانوں پر میٹر کی مقدار لکھی ہوتی ہے؛ لیکن چونکہ وہ مشین کے ذریعہ سے کھینچ کر ناپا ہوتا ہے؛ اس لیے بعض کپڑے جب کھول کر دوبارہ ناپے جاتے ہیں تو لکھی ہوئی مقدار سے کم مقدار ہوتے ہیں؛ نیز منڈی کے عرف کے مطابق پیک مال کو کھولنا اور دوبارہ نپوانا منڈی والے برداشت نہیں کرتے، تو مذکورہ تفصیل کے مطابق پیک آئے ہوئے مال کو اسی طرح پیک اتنی ہی مقدار تسلیم کر کے جو اس پر لکھی ہوئی ہے، اسی مقدار کی قیمت میں بیع کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے، اور اگر خریدار یہ جانتے ہوئے کہ اس میں بیان کردہ مقدار سے کم ہے مال پر قبضہ کرے تو خیار فسخ بھی نہیں ہے، ورنہ خیار فسخ ہے۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ اردو ۵۸)

کپڑے کا رنگ کچا ہونا عیب ہے یا نہیں؟

سوال: کسی تاجر نے گاہک کو ایک رنگین کپڑا فروخت کیا، رنگ کی پائیداری یا عدمِ پائیداری کی کوئی بات تاجر وگاہک کے درمیان میں نہیں ہوئی؛ لیکن گاہک وہ کپڑا دھونے کے بعد واپس لایا کہ اس کا رنگ کچا ہے چلا جاتا ہے، آیا گاہک کو ایسی صورت میں کپڑا واپس کرنے کا حق ہے، اور تاجر کے لیے واپس لینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ چیز تجار کے عرف میں عیب سمجھی جاتی ہے تو خریدار کو دھونے سے پہلے واپس کرنے کا حق ہے، اور دھونے کے بعد واپس تو نہیں کرسکتا؛ البتہ عیب کا نقصان وصول کرسکتا ہے۔ (باب خیار العیب شامی ٤) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

باہم تعاون کی ایک اسکیم

سوال: (الف) آج کل کاروبار کی نوعیت کچھ اس قسم کی بن گئی ہے، کہ معمولی رقم سے کوئی کاروبار کرنا محال سا ہوگیا ہے؛ اس لیے کم آمدنی والے لوگوں کے کاروبار کے لیے معتد بہ رقم فراہم کرنے کے لیے کہ جس میں سود بھی نہ ہو، اور کسی ایک صاحبِ مال پر قرض کا بوجھ بھی نہ ڈالنا پڑے حسبِ ذیل صورت اختیار کی جاتی ہے جس کو ہماری عرف میں سوسائٹی کہتے ہیں، جس کا خلاصہ تو یہ ہے کہ ایک سو افراد پہلے ہر ماہ دس ہزار روپئے جمع کرتے ہیں، اور وہی رقم قرعہ اندازی سے ہر ایک ممبر کو باری باری سے ملتی رہتی ہے، اسی طرح دوسری بار پانچ پانچ ہزار روپئے کی رقم ہر ایک کو ملتی ہے؛ الغرض ہر ممبر بالاقساط پندرہ ہزار روپئے جمع کرتا ہے اور وہی پندرہ ہزار روپئے دو قسطوں میں پاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سو افراد مل کر باہم یہ طے کرتے ہیں کہ ہر فرد ہر ماہ کی ۲۰/ تاریخ تک ایک سو روپئے معین اشخاص کے پاس جمع کروائے گا اور اس رقم کی ۲۵/ تاریخ کو قرعہ اندازی سے جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اس کو دے دی جائے گی، جس کے نام پہلی ہی مرتبہ قرعہ اندازی میں قرعہ نکل آیا وہ اب ہر ماہ ایک سو روپئے تو حسبِ سابق جمع کرے گا ہی؛ لیکن مزید ڈھائی سو روپئے بھی ہر ماہ بطور ادائیگی قرض جمع کرائے گا، یہ مزید ڈھائی سو روپئے کی رقم اس کو رقم لینے کے وقت سے چالیس ماہ تک جمع کرانی ہوتی ہے، اور ماہانہ ایک سو روپئے والی رقم مجموعی ۵۰ ماہ تک، اس طرح ایک سو روپئے ماہانہ کے حساب سے پچاس ماہ کے پانچ ہزار، اور ہر ماہ ڈھائی سو کے حساب سے چالیس ماہ کے دس ہزار روپئے ہر فرد کے جمع ہوتے ہیں، پچاس ماہ کے ختم ہونے تک ہر ایک کو ایک بار دس ہزار روپئے یک مشت ضرور مل جاتے ہیں اس کے بعد پانچ پانچ ہزار روپئے اسی طرح قرعہ اندازی سے ملتے رہتے

ہیں شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟

(ب) ۲۰ تاریخ جو رقم جمع کرنے کی معینہ تاریخ ہے رقم جمع کرنے میں اس تاریخ سے تاخیر پر یومیہ دس روپئے جرمانہ لیا جاتا ہے جس کو سوسائٹی کی ضروریات مثلاً رسیدوں کی طباعت وغیرہ میں صرف کیا جاتا ہے یہ جرمانہ لینا شرعاً کیسا ہے، اور اس کا یہ مصرف شرعاً صحیح ہے یا غلط؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) یہ آپسی تعاون کی ایک صورت ہے جس میں کوئی بات خلاف شرع معلوم نہیں ہوتی۔

(ب) مالی جرمانہ لینا درست نہیں ہے، جن سے لیا ہے ان کو لوٹا دیا جائے سوسائٹی کی ضروریات کے لیے بھی سب مل کر رقم نکالیں۔ فقط

نوٹ: قرض کی ادائیگی کے لیے ڈھائی سو روپیہ کی جو قسط مقرر کی گئی ہے اس میں آخری یعنی چالیسویں قسط بجائے ڈھائی سو روپئے کے ڈیڑھ سو کی رکھی جائے؛ اس لیے کہ دس ہزار میں ایک سو روپئے خود اس کے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ غفرلہ ۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

شیئرز کے مسائل

کمپنی کے شیئرز خریدنا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین، شرعِ متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں جسے شیئر مارکیٹ کا کاروبار کہا جاتا ہے، اور جس کا طریقہ مندرجۂ ذیل ہے:

کوئی بھی کاروبار کرنے کے لیے بائع ومشتری، خرید وفروخت کرنے والے کو نفع ونقصان دونوں کا ذمہ دار بننا پڑتا ہے، بعینہ یہی صورت شیئرز ''حصص'' کے خرید وفروخت کرنے والے کی ہوتی ہے، کسی بھی کمپنی کا شیئر دار جس طرح نفع حاصل کرتا ہے ویسے ہی کبھی نقصان بھی برداشت کرتا ہے، ہم یہاں آگے چل کر شیئر کی شکلوں سے بھی آگاہ کریں گے، یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیئر مارکیٹ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) پرائمری مارکیٹ۔ (۲) سکنڈری مارکیٹ۔

(۱) پرائمری مارکیٹ وہ ہے جس میں نئی کمپنیاں اور موجودہ کمپنیاں عوام کو براہِ راست شیئر الاٹ کرتی ہیں۔

(۲) سکنڈری مارکیٹ یعنی ساتھ ہی موجودہ کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت اسٹاک اکسچینج (جو ایک مرکز ہے اس) کی معرفت سے کیا جاسکتا ہے۔

شیئر مارکیٹ میں ایک فریق پیسہ لگاتا ہے تو دوسرے فریق کی محنت ہوتی ہے، اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق آپس میں تقسیم کرتے ہیں، اور اگر نقصان ہوتا ہے تو دونوں برداشت کرتے ہیں۔

شیئرز کے کاروبار بڑے اعلیٰ پیمانہ کے ہوتے ہیں، ان کے بڑے منصوبے

ہوتے ہیں، کسی بھی بڑے پروجیکٹ کو چلانے کے لیے سب سے پہلے بڑی رقومات کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے لیے زیادہ معاونین کی ضرورت ہے جو عقلی و مالی طور پر اس کے ممد ومعاون ہوں۔ مثال کے طور پر پانچ آدمی مل کر ایک پروجیکٹ چلانے کے لیے آگے بڑھے آپس میں صلاح ومشورہ کیا کہ ہمیں ایک ٹیپ رکارڈ بنانے کا کارخانہ ڈالنا چاہیے، حساب کیا تو اس میں کل صرفہ ۱۰/ کروڑ لگ رہا ہے جو ایک بڑی رقم ہے ان لوگوں نے بڑی جدوجہد کی، دوستوں سے، احباب سے، کچھ ادھر ادھر سے کر کرا کر بڑی مشکل سے ایک کروڑ روپیے جمع کر پائے کمپنی کھولنے میں سامان تیار کرنے میں ۱۰/ کروڑ کی لاگت لگ رہی ہے، ابھی نو کروڑ اور چاہیے کیوں کہ ایک کروڑ سے تو ان کی کمپنی نہیں چلے گی، پروجیکٹ تیار نہیں ہو پائیں گے، اب یہ پانچ آدمی جو بورڈ آف ڈائریکٹر کہلائیں گے جو اس کمپنی کے بانی کہلائیں گے یہ لوگ حکومت کی اجازت سے بنی اقتصادی تنظیمیں ہیں، جیسے: آئی ڈی بی آئی، آئی سی آئی سی آئی، آئی سی ایف سی، ایس سی آئی، سی آئی، ان کے پاس پہنچیں گے اور ان سے رابطہ قائم کریں گے ان سے کہیں گے کہ صاحب ہم ایک پروجیکٹ چلانا چاہتے ہیں ہمیں نو کروڑ روپیوں کی ضرورت ہے ہم ایک ٹیپ رکارڈ بنانے کی کمپنی ڈالنا چاہتے ہیں اس میں آپ ہماری مدد کیجیے یا تو نو کروڑ ہمیں قرض دیں یا آپ بھی کمپنی میں ہمارے ساتھ حصہ دار بن جائیں نفع ونقصان دونوں میں شریک رہیں، اگر نفع ہوگا تو نفع میں شرکت آپ کی ہوگی، اگر خدانخواستہ نقصان ہوا تو ہمارے ساتھ ساتھ آپ کو نقصان برداشت کرنا پڑے گا، یہ بات فائننس کمپنیوں سے ہوگی جو حکومت کی اجازت سے عمل میں آئی ہیں۔ اب وہ اقتصادی تنظیم ان پانچ آدمیوں کے حالات کا تنقیدی جائزہ لے گی کہ یہ لوگ اتنا بڑا پروجیکٹ چلانا چاہتے ہیں، ان میں اس کی صلاحیت ہے بھی کہ

نہیں؟ یہ آگے چل کر اپنے مہم میں کامیاب ہو بھی سکتے ہیں کہ نہیں؟ ان کے ماضی میں کیا حالات رہے ہیں، مستقبل میں کامیابی کے آثار ہیں بھی کہ نہیں؟ ان ساری باتوں کا جائزہ لیں گے موازنہ کریں گے اگر وہ مطمئن ہو گئے، تب پیسے دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے، یا تو قرض کی شکل میں دیں یا ان لوگوں سے شیئر خریدیں؛ لیکن وہ قرض دیں یا شیئر خریدیں وہ نو کروڑ روپے نہیں دیں گے، بہت زیادہ سے زیادہ تعاون کر سکتے ہیں تو چار کروڑ روپے دینے کو تیار ہوں گے، یا دو کروڑ قرض دیں اور دو کروڑ کا شیئر خرید لیں یا بہت کریں گے تو تین کروڑ قرض دیدیں، ایک کروڑ کا شیئر خرید لیں، یہ ناممکن بات ہے کہ پورا کا پورا نو کروڑ قرض دے دیں، اس طرح سے کر کے پانچ کروڑ جمع ہو گئے ایک کروڑ ڈائرکٹروں کے پاس سے اور چار کروڑ کمپنیوں سے، اب بھی پانچ کروڑ کی مزید ضرورت ہے کیوں کہ یہ جمع شدہ رقم اس پروجیکٹ کی بنیادی چیزوں میں ہی صرف ہو جائے گی، کچھ تعمیر میں خرچ ہو جائے گی اور کچھ مشینوں اور اس کے پارٹس خریدنے میں صرف ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ پیسہ ان سب چیزوں میں صرف کر دیا جاتا ہے تب بھی یہ لوگ اصل مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ ٹیپ رکارڈ تیار کرنے کے لیے کچے مال کی ضرورت ہے اس میں اور ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جس کے نہ ہونے سے یہ ٹیپ رکارڈ کلی طور پر تیار نہ ہو سکے گا، اب ان سے جو انتظام ہونا تھا وہ ہو گیا، جو مدد ملنی تھی مل گئی پھر بھی ان کا پروجیکٹ تیار نہیں ہو رہا ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ یہ لوگ کہیں اور سے پیسے کا انتظام کریں تب حکومت کی اجازت سے بنی ایجنسی سیبی (SEBI) کے پاس جا کر اپنا معاملہ پیش کریں گے کہ: صاحب ہمیں باقی ماندہ پانچ کروڑ روپے عوام سے لینے کی اجازت دی جائے، سیبی (SEBI) ان کو اجازت دے دے گی کہ آپ اپنا پروجیکٹ چلانے کے لیے عوام سے مدد لے سکتے ہیں،

اب اس کے لیے طریقۂ کار یہ ہوگا کہ یہ لوگ عوام کو اپنی کمپنی کا حصہ دار بنائیں گے اور ان کو شیئر دیں گے، اگر ۱۰/ روپے کا ایک شیئر ہے (شیئر کے معنی حصہ کے) تو پچاس لاکھ شیئرز بازار میں جاری کردیئے جائیں گے، اس کا بذریعۂ اخبار اعلان کردیا جائے گا، ۱۰ کے حساب سے پچاس لاکھ شیئرز کے پانچ کروڑ جمع ہوجائیں گے، فارم جاری کردیا جائے گا، بینکوں کے نام دے دیے جائیں گے، وقت متعین کردیا جائے گا کہ تین روز کے اندر فلاں فلاں بینکوں میں اپنے اپنے پیسے جمع کرادیں جن کو شیئر خریدنا ہے، شیئر کے فارم پر بینکوں کے نام ہوں گے، اور طے شدہ تاریخیں ہوں گی ساتھ میں یہ بھی اعلان ہوجائے گا کہ مقررہ وقت سے قبل یا بعد میں کوئی فارم قابل قبول نہ ہوگا، فارم کے ساتھ ہی اس کے پروسپیکٹر ہوں گے، یعنی کس طرح کا پروجیکٹ ہے کون لوگ اس کے ڈائرکٹر ہیں، ان کے مؤسسین کی کیا اہمیت ہے؟ یہ کمپنی کیا بنارہی ہے، اس کے آگے کیا امکانات ہیں؟ کیوں کہ ہندوستان کے لوگ جب اس میں پیسے لگائیں گے تو اس کی پوری جان کاری چاہیں گے، بہت سوچ سمجھ کر اس میں قدم بڑھائیں گے، اس بارے میں جاننے والوں سے معلوم کریں گے یہاں تک کہ مطمئن ہوجائیں، شیئر دار یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ ان ڈائرکٹروں کی ماضی میں کیا کارگزاریاں رہی ہیں، اگر پہلے کوئی اور اشیاء بنانے کا کام کرتے تھے تو اب اس بڑے پروجیکٹ میں کامیاب ہوسکتے ہیں؛ اس لیے ان سے منافع کی امید کی جاسکتی ہے، شیئر خریدنے والا یہ بھی دیکھے گا کہ اگر یہ منافع بخش کمپنی چلانے جارہے ہیں تو اس کا منافع صحیح طور پر تقسیم کرسکتے ہیں کہ نہیں، وہ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟ جب ان سب باتوں کی صحیح طور پر تصدیق ہوجائے گی، یعنی سب سے پہلے ان کی حیثیت، ان کا کیریکٹر، ان کے معاملات، ان کے ماضی حال کے حالات دیکھیں گے۔

دوسری چیز یہ دیکھی جائے گی کہ یہ جو چیز بنا رہے ہیں اس کی مارکیٹ میں وقعت ہے؟ بازار میں اس کی مانگ ہے کہ نہیں، پھر اس کا تناسب کیا ہے؟ بازار میں کتنے کی ضرورت ہے اور کتنا بنا رہے ہیں، پھر اس چیز کی باہر ملکوں میں کیا وقعت ہے، وہاں کتنی مانگ ہے؟ کیوں کہ جب یہ باہر ملکوں میں جائے گا تو اس کے زیادہ منافع کے امکانات ہیں، ایک یہ کہ ایکسپورٹ والے مال پر ٹیکس بھی نہیں ہے، ایسی چیزوں میں زیادہ منافع کے امکانات ہیں، ایک امپورٹ سبسٹیٹیوٹ کہتے ہیں، یعنی جو چیز پہلے باہر بنا کرتی تھی اور ہندوستان میں آکر فروخت ہوتی تھی اب وہ ہندوستان میں بننے لگی اور یہاں بن کر یہیں فروخت ہوگی، یعنی پہلے وہ چیز ۱۰۰/ ڈالر میں آئی تھی جو یہاں تین ہزار میں پڑتی ہے، اب یہاں وہ چیز ایک ہزار میں نکل رہی ہے جو پندرہ سو کی بکے گی، دو ہزار کی بکے گی تو اس میں ہزار، پانچ سو کا فائدہ ہونے کا امکان ہے، اور چوں کہ پہلے سے کم میں مل رہی ہے تو اس میں زیادہ مارجن ہے، یہ سب کھلنے والی کمپنی کی مفید شکلیں ہیں۔

اور تیسرا یہ کہ ہندوستان میں بن کر ہندوستان میں ہی فروخت ہو تو اب دیکھا جائے گا کہ اس چیز کی کل ضرورت کتنی ہے اور کونسی کمپنیاں ہیں جو اسے تیار کررہی ہیں، اور کس مقدار میں بنا رہی ہیں۔

فرض کیجیے کہ معلوم کرنے پر ہم نے تخمینہ نکالا کہ کل کمپنیاں مل کر ۷۰/ لاکھ پونٹ تیار کررہی ہیں، اور مارکیٹ میں ضرورت ہے ایک کروڑ کی، اس کا مطلب ہے کہ ۳۰/ لاکھ پونٹ کی اور ضرورت ہے، تو اس میں فائدہ ہے اور اگر اس کے برخلاف ہے تو اس میں پیسہ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، تو انویسٹر (جو پیسہ لگا رہا ہے) یہ سب چیزیں دیکھے گا اور یہ بھی دیکھے گا کہ آگے یہ کمپنی کتنا منافع دے سکتی ہے، اس منافع کے حساب سے آدمی طے

کرے گا اور پھر اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچے گا۔ کمپنی نے اپنی پوری جان کاری فارم کے ساتھ دے دی ہے، اپنا پروسپیکٹس دے دیا ہے اب اس کے بعد انویسٹر فیصلہ کن قدم آگے بڑھائے گا چوں کہ اس کے مؤسسین صحیح ہیں، اس کے ڈائرکٹرس بھی صحیح ہیں، کل ملا کر یہ پروجیکٹ قابل اطمینان ہے کمپنی کے سارے احوال لوگوں پر پھیل گئے کہ یہ کمپنی جو چیز تیار کرے گی وہ مارکیٹ میں فروخت ہو جائے گی، اور منافع اچھا ہوگا اور کسی طرح کا کوئی خدشہ لاحق نہ ہوگا، اب ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے سرمایہ دار حضرات اس کی طرف متوجہ ہوں اور سپلائی کر دیں۔ مقررہ مدت میں متعین شدہ بنکوں میں جو ہندوستان میں تقریباً ۳۰، ۳۵ ہیں، اپنے پیسے جمع کرنے شروع کر دیں۔ فارم تو بہت زیادہ چھپوا دیئے؛ مگر ان کو ضرورت تھی صرف پانچ کروڑ کی لوگوں نے دیکھا کہ یہ کمپنی بہت اچھی ہے، اس سے منافع کے امکانات زیادہ ہیں، کثیر تعداد میں لوگوں نے اپنی رقمیں جمع کرا دیں، اور جب سارے بنکوں کا حساب کیا گیا تو پانچ کروڑ کے بجائے پچاس کروڑ آ گئے، ضرورت ہے صرف پانچ کروڑ کی، اب تو عجیب معاملہ ہو گیا ہے پہلے پیسے ہی نہیں تھے اب پیسے ہی پیسے ہو گئے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سارے پیسوں کا پروجیکٹ تیار کر دیں، پروجیکٹ تو دس کروڑ کا ہی رہے گا، باقی رقم ہم انویسٹر کو معذرت کے ساتھ واپس کر دیں گے، اور بذریعۂ ڈرافٹ چیک ان کے پاس رقمیں بھیج دی جائیں گی، اب جن لوگوں کا فارم اور سرمایہ روک لیا گیا ہے وہ کمپنی کے شیئر ہولڈر کہلائیں گے کیوں کہ انھوں نے ۱۰، ۱۰ روپے کے سو شیئر خرید لیے ہیں، یعنی ایک ہزار کا شیئر خرید لیا ہے یہ لوگ کمپنی کے حصہ دار ہو گئے کمپنی میں ان کا حصہ ہو گیا اور وہ اپنے حصہ کے کماحقہ مالک بن گئے، انھیں یہ بھی حق ہے کہ یہ اپنا شیئر کسی دوسرے آدمی کو فروخت کر دیں یا اس کو برقرار رکھیں کیوں کہ شیئرز اِن کی ملکیت میں آ گئے

ہیں انھیں اپنے شیئرز کی خرید وفروخت میں کمپنی کی طرف سے کلی طور پر اجازت ہے۔

مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے: آپ یوں سمجھیں کہ اپلائی کرنے والوں میں عمر اور بکر بھی تھے، عمر کی اپلائی منظور ہوگئی اور بکر کی درخواست رد کردی گئی وغیرہ وغیرہ، اب بکر نے دیکھا کہ یہ کمپنی بہت اچھی ہے آگے چل کر اس کے منافع کے امکانات بہت زیادہ ہیں، جن کی اپلائی منظور کرلی گئی ہے انھیں منافع بہت ہوگا، تو ہم کیوں نہ عمر کے شیئرز خرید لیں، بکر صاحب عمر صاحب کے پاس پہنچے کہ صاحب آپ نے جو ۱۰/ روپے کے حساب سے ۱۰۰/ شیئر ایک ہزار میں خریدے ہیں، آپ ہمیں ۱۲/ روپے میں دیدیں دو روپے منافع کے ساتھ، اب چوں کہ اس کمپنی کے بارے میں عمر صاحب کو جان کاری تھی کہ آگے چل کر اس سے زیادہ منافع ہاتھ آسکتا ہے؛ اس لیے انھوں نے صاف انکار کردیا کہ نہیں صاحب ہم اپنا شیئر دوروپے منافع پر بھی دینے کو تیار نہیں ہیں، ایک تیسرے صاحب زید کو معلوم ہوا کہ عمر کی اپلائی منظور ہوگئی وہ آئے اور کہنے لگے کہ: صاحب ہمیں اپنا شیئر ۱۵/ روپے کے حساب سے دیدیجیے؛ مگر عمر صاحب اپنا شیئر ابھی بھی نہیں بیچتے ہیں، عمر صاحب کے بارے میں ایک چوتھے شخص خالد کو معلوم ہوا وہ آکر بولے کہ: عمر صاحب آپ اپنا حصہ ہمیں ۲۵/ روپے کے حساب سے فروخت کردیں عمر صاحب نے دیکھا کہ چند دنوں میں ۱۵/ سو کا منافع حاصل ہورہا ہے، لاؤ بیچ ڈالوں، اور عمر صاحب اپنا شیئرز (حصص) فروخت کردیتے ہیں، ابھی کمپنی کا پروجیکٹ شاید شروع بھی نہیں ہوا ہوگا اور شیئر کا منافع ابھی سے ملنا شروع ہوگیا، توجہ طلب امر یہ ہے کہ بائع اپنی مملوکہ شئ کو فروخت کرسکتا ہے چوں کہ کمپنی سے ملے ہوئے شیئرز پر اس کا حق ہے وہ اس کا مالک ہے؛ اس لیے اس میں کلی طور پر تصرف جائز ہے، یہاں تک کہ ایک شیئر دار کو اتنا حق بھی حاصل ہے

کہ اگر اس کی اکثریت ہم خیال ہے تو کمپنی کے ڈائرکٹر کو بھی بدل سکتے ہیں، پس اس طرح شیئر مارکیٹ میں نفع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری صورت یہ ہے کہ عمر کو بعد میں پتہ چلا کہ یہ کمپنی آگے چل کر فیل ہوسکتی ہے یا منافع کے امکانات زیادہ نہیں ہیں اس کو آگے کی توقعات بہت کم ہیں، تو اس نے بکر سے کہا کہ: صاحب ہمارے شیئرز ۱۱/ روپے میں لے لیں، میں فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کمپنی کے بارے میں بکر صاحب کو بھی معلومات تھیں کہ یہ کمپنی آگے چل کر کوئی خاص ترقی نہیں کرے گی، زیادہ منافع نہیں مل سکتا، اگر ہے بھی تو بہت کم ہے، بکر صاحب نے کہا کہ: میں ۹/ روپے میں آپ کا شیئر خرید سکتا ہوں، یہاں ایک روپیہ کے حساب سے ۱۰۰/ روپے کا نقصان عمر صاحب کو ہو رہا ہے؛ اس لیے ان سے اپنا شیئر فروخت نہ کرسکے، خالد صاحب کے پاس گئے اور اپنا شیئر فروخت کرنے کی بات کی تو خالد صاحب نے کہا کہ میں ۹/۵۰ (نو روپیے پچاس پیسے) میں آپ کے شیئر خرید سکتا ہوں، اور عمر صاحب نے پچاس پیسے کے نقصان سے ان کے ہاتھ فروخت کردیئے، اس طرح سے عمر صاحب کو شیئر مارکیٹ کی دنیا میں ۵۰/ روپیے کا نقصان ہوا، تو شیئر مارکیٹ میں نفع ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ جہاں نفع ہوتا ہے وہیں آئے دن نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے؛ لہٰذا شیئر دار نفع ونقصان دونوں کا مالک ہوتا ہے۔

سکنڈری مارر کیٹ

ہم بتا چکے ہیں کہ پرائمری مارکیٹ میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی ہوتا ہے، اور یہ کیسے ہوتا ہے یہ بھی بتا چکے ہیں؛ نیز آپ ان کی مختلف شکلوں کو ذہن نشین کر چکے ہیں۔ ہم اس کو تمثیلی طور پر بھی آگے بتائیں گے کہ شیئر دار آپس میں اپنے شیئر کی خرید و فروخت کیسے کرتے ہیں، اور وہاں ایک صورت میں عمر کو پندرہ سو کا منافع ہوا تھا، اور

دوسری صورت میں عمر صاحب کو پچاس روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔

یہ سب صورتیں اس وقت ممکن ہیں جب کہ بائع اور مشتری ایک دوسرے سے متعارف ہوں؛ لیکن سکنڈری مارکیٹ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کمپنی نے پچاس لاکھ کا شیئر الاٹ کردیا، اور پورے ہندوستان میں اس کی تشہیر ہوگئی اور ہندوستان کے مختلف مقامات کے باشندوں نے خرید لیا، تو اب اس صورت میں شیئر ہولڈر کے بارے میں جانکاری غیر ممکن ہے یہاں تک کہ زید، عمر، بکر کسی کو بھی پتہ نہیں کہ اس کمپنی کے شیئر کن کن لوگوں نے خریدے ہیں، تو اس چیز کو ریگولیٹ کرنے کے لیے، اس کا نظم وانتظام کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے اسٹاک اکسچینج کا قیام عمل میں آیا، وہاں کچھ لوگوں کو حکومت نے لائسنس دیا، جنھیں کارڈ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ انویسٹر کی جانب سے کاروبار کرسکتے ہیں، یعنی اسٹاک اکسچینج میں جاکر ہر آدمی کاروبار نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ پتہ نہیں لگ سکتا ہے کہ عمر صاحب کا جو شیئر آیا ہے یہ انھیں کی ملکیت ہے یا کوئی دوسرا اس کا مالک ہے، جہاں ۸۰/۹۰ کروڑ کی آبادی ہے وہاں بلا واسطہ ایک دوسرے کو پہچاننا بہت مشکل ہے، تو اس کا طریقۂ کار حکومت نے یہ نکالا ہے کہ اسٹاک اکسچینج میں جو کارڈ ہولڈرز ہیں، جو لائسنس ہولڈر ہیں وہاں کی زبان میں انھیں بروکر کہا جاتا ہے، اگر کسی صاحب کے پاس کوئی شیئر ہے اور وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ان بروکرز سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ فرض کیجیے ہمارے نام کوئی شیئر ہے اور ہم بمبئی اسٹاک اکسچینج کی معرفت فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اب وہاں کے جو بروکرز ہیں ان سے تعلق کرنا ہوگا کہ صاحب ہمارے شیئر فروخت کرادیں، مثلاً ہمارے پاس ریلائنس کمپنی کے ۱۰۰/ شیئر ہیں، ہم اس کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، یہ بات ہم بروکر سے کہیں گے، وہ بروکر ہم سے واقف ہوگا،

ہمارے پچھلے بیک گراونڈ سے جان کاری رکھتا ہوگا، اس کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اس شیئر کے مالک یہی ہوسکتے ہیں تب وہ جاکے آگے کام کرے گا، اسٹاک اکسچینج کا جہاں کاروبار ہوتا ہے اسے ٹریڈنگ رنگ کہا جاتا ہے، وہاں کا وقت متعین ہے اس متعین وقت میں اس رنگ میں پہونچے گا، اور بروکر یہ کوشش کرے گا کہ ریلائنس کے شیئر کو فروخت کردے، اسی طرح ممکن ہے مدراس کے کسی صاحب نے بروکر سے کہا ہو کہ ہمارے لیے ریلائنس کے ۱۰۰/ شیئر خرید دیجیے، تو اس کا بروکر بھی اس رنگ کے اندر موجود ہوگا، اور دونوں آپس میں سودا کرلیں گے، ہمارا بروکر ہماری جانب سے کاروبار کرے گا، اور مدراس کا بروکر ان کی جانب سے کاروبار کرے گا۔ فرض کریں کہ ہمارے بروکر نے ۲۷۰/ روپے میں ہمارا ریلائنس کا شیئر فروخت کردیا اور دوسرے بروکر نے خرید لیا، ہم اپنے بروکر کے ذریعہ اپنے سرٹیفکیٹ اسٹاک اکسچینج میں پہنچا دیں گے، اور دوسرا بروکر اسی اسٹاک اکسچینج کی معرفت سرٹیفکیٹ حاصل کرے گا، اسٹاک اکسچینج اس بروکر سے پیسے لے کر ہمارے بروکر کو دے دے گا، اس طرح ہمارا بروکر شیئر کے پیسے لے کر ہم تک پہونچادے گا اور دوسرا بروکر شیئرز لے کر دوسرے ہولڈر تک پہونچادے گا، اس طرح یہ کاروبار مکمل ہوجائے گا، اس صورت میں بھی نفع ونقصان ہوسکتا ہے۔

مثلاً خالد نے جس کمپنی کا شیئر ۲۵/ روپیے میں خریدا تھا، اور اخبار کے ذریعہ یا کسی بھی ذرائع ابلاغ سے پتہ چلا کہ حکومت نے اس کمپنی کے ٹیکس میں کمی کردی ہے ٹیکس پہلے بیس فیصد تھا اب دس فیصد کردیا ہے، ٹیکس کی کمی سے منافع کے امکانات زیادہ بڑھ جاتے ہیں، اب اس کمپنی کے شیئر کے خریدار بڑھ جائیں گے، یعنی ۲۵/ کا شیئر ۳۰/ میں بکے گا، ۳۵/ میں بکے گا، خریدار زیادہ ہوجائیں گے اور فروخت کرنے والے کم ہوں گے؛

لہذا خالد صاحب نے اپنے علاقہ کے بروکر سے کہا کہ صاحب ہمارا شیئر فروخت کرا دیں، اور خالد کا شیئر ۳۵/ روپے میں کسی بروکر نے خرید لیا ہے اس طرح خالد کو ۱۰/ روپے منافع کے حساب سے ۱۰۰ شیئر میں ایک ہزار کا منافع ہو گیا، تو یہ صورت نفع کی ہے، اور اس کے برعکس اخبارات کے ذریعہ پتہ چلا کہ اس کمپنی کے مقابلہ میں کوئی اور بڑی کمپنی آ رہی ہے جس کے پروجیکٹ بڑے ہیں اور زیادہ مقدار میں مال تیار کرے گی لہذا اس میں فائدہ کے امکانات زیادہ ہیں، اب اس کمپنی کے جو شیئر دار ہیں وہ اپنے شیئر فروخت کرنا شروع کر دیں گے، اس صورت میں فروخت کرنے والے زیادہ ہوں گے اور خریدنے والے کم، اس لحاظ سے اس کمپنی کے شیئر کی قیمت گھٹ جائے گی۔ مثال کے طور پر جس کے شیئر ۲۵/ روپے کے تھے، اب ۲۰/ روپے کے ہو جائیں گے، اور خالد بھی اپنے شیئرز کو اپنے بروکر کے ذریعہ اسٹاک اکسچینج کی معرفت ۲۰/ روپے میں فروخت کر دے، اس لحاظ سے پانچ روپیے فی شیئر کے حساب سے سو شیئر میں پانچ سو روپئے کا نقصان ہو جائے گا، تو اسٹاک اکسچینج کی معرفت کاروبار میں بھی نفع و نقصان ہوتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار میں جس کو شیئر مارکیٹ کہا جاتا ہے شامل ہونا کیسا ہے؟ اس طرح کے کاروبار کر سکتے ہیں کہ نہیں؟

ازراہِ کرم مدلل جواب مرحمت فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی کمپنی کے شیئرز ابتداء میں جاری ہو رہے ہوں اس وقت ان کو ایک شرط کے ساتھ لینا جائز ہے، وہ یہ کہ وہ کمپنی کوئی حرام کاروبار شروع نہ کر رہی ہو؛ اس لیے اگر کسی حرام کاروبار کے لیے وہ کمپنی قائم کی جا رہی ہے تو اس کمپنی کے شیئرز لینا کسی حال میں بھی

جائز نہیں۔ کمپنی جب مکمل طور پر قائم ہوچکی اور ایک مرتبہ اس کمپنی کے تمام شیئرز سبسکرائب ہوگئے اس کے بعد جب اس کمپنی کے شیئرز کا اسٹاک مارکیٹ میں لین دین ہوگا وہ حقیقی معنی میں شیئرز کی خرید وفروخت ہے؛ اس لیے جو آدمی اسٹاک مارکیٹ سے شیئرز خریدنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ سودا چار شرائط کے ساتھ درست ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کمپنی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک سیال اثاثوں یعنی نقد رقم کی شکل میں نہ ہوں، بلکہ اس کمپنی نے منجمد اثاثے حاصل کر لیے ہوں، مثلاً: بلڈنگ بنا لی ہو، یا زمین خرید لی ہو، لہذا اگر اس کمپنی کا کوئی فکسڈ اثاثہ وجود میں نہیں آیا تو اس صورت میں اس کمپنی کے شیئرز کو اس کی لکھی ہوئی قیمت (فیکس ویلیو) سے کم یا زیادہ میں فروخت کرنا جائز نہیں بلکہ برابر سرابر خریدنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ جتنے لوگوں نے اس کمپنی میں اشتراک کیا ہے ان کی اشتراک کردہ رقم سے ابھی تک کوئی سامان نہیں خریدا گیا اور نہ اس سے کوئی بلڈنگ بنائی گئی، نہ کوئی مشین خریدی گئی اور نہ ہی کوئی اور اثاثہ وجود میں آیا، بلکہ ابھی تک وہ تمام پیسے نقد کی صورت میں ہیں، تو اس صورت میں دس روپے کا شیئر دس روپے ہی کی نمائندگی کرر ہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دس روپئے کا نوٹ دس روپئے کی نمائندگی کرتا ہے، لہذا جب دس روپیے کا شیئر دس روپیے ہی کی نمائندگی کرر ہا ہے تو اس صورت میں اس کو گیارہ روپیے میں یا نو روپیے میں خریدنا یا فروخت کرنا جائز نہیں؛ لیکن اگر کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد شکل میں ہیں تو اس صورت میں دس روپیے کے اس شیئر کو کمی یا زیادتی پر فروخت کرنا جائز ہے؛ لیکن اگر کسی وقت نقد رقم اور واجب الوصول قرضہ دس روپیے سے زیادہ ہوجائے تو اس صورت میں دونوں مجموعی مقدار سے کچھ زیادہ میں وہ شیئر

فروخت ہوسکتا ہے اس سے کم میں نہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ شیئر ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے اگر چہ اس کی آواز مسترد ہو جائے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جب منافع تقسیم ہو تو وہ شخص آمدنی کی تفصیلات سے یہ معلوم کرلے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے، تو اب یہ شخص اپنے نفع میں سے اتنی مقدار بلانیت ثواب صدقہ کردے۔ (اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات امداد الفتاوی، فقہی مقالات وغیرہ میں موجود ہے) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

بینک اور کارخانہ کے شیئر لینا

سوال: بینک کے شیئر لینا کیسا ہے؟ اور کارخانہ سے جو شیئر حاصل کیے جاتے ہیں ان کا حکم کیا ہے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بینک کے شیئر لینے کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ''امداد الفتاوی'' میں تحریر فرماتے ہیں: واقعات اور احکام میں غور کرنے سے حقیقت اس معاملہ میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ ایسے بینک میں روپیہ جمع کرتے ہیں وہ اس دکان دار کے شریک، یعنی بینک کے حصہ دار نہیں بلکہ اس دکان دار کو قرض دیتے ہیں اور وہ اس قرض پر سود دیتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۸۷)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ سود ملتا ہے جو شریعت میں حرام ہے لہذا بینک سے شیئر لینا جائز نہیں۔

کارخانہ کے شیئر لینے کے بارے میں ''امداد الفتاویٰ'' میں ہے کہ:

''حقیقت اس معاملہ کی شرکت ہے یعنی متعدد حصہ دار اپنا سرمایہ جمع کر کے تجارت کرتے ہیں اور جو اس سے نفع ہوتا ہے وہ باہم تقسیم کرتے ہیں۔ الخ۔ اور کارکنان کمپنی تمام کاروبار میں ان حصہ داروں کے وکیل ہیں۔ اھ'' (امداد الفتاوی ۳/۴۹۰)

اس لیے اگر وہ کمپنی جائز کاروبار کرتی ہے تو اس کارخانے کا شیئر لینا جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

سودی کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیئرز خریدنا

سوال: (۱) بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئرز (حصے) لوگ خریدتے ہیں، کمپنی کاروبار کرتی ہے اور حکومت سے لون بھی لیتی ہے جس کا سود بھی ادا کرتی ہے، بعض دفعہ کمپنی خود بھی دوسروں کو سود پر رقم قرض دیتی ہے، تو کیا ایسی کمپنیوں سے شیئرز لینا شرعاً درست ہے؟

سوال: (۲) ایک کمپنی ایسی ہے جو کاروبار کرتی ہے؛ لیکن سود پر رقم قرض نہیں دیتی؛ البتہ سال بھر ہر ماہ جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو بینک میں جمع کر دیتی ہے، سال کے ختم پر وہ رقم جس میں سود بھی شامل ہوتا ہے حصہ داروں کو تقسیم کر دی جاتی ہے، تو ایسی کمپنی کے ممبر بننا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲) جن کمپنیوں کا ذریعۂ آمدنی ہی سود ہے یعنی اس کا منافعہ سود ہی سے حاصل ہوتا ہے تو ایسی کمپنیوں کے حصص خریدنا درست نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کا ذریعۂ آمدنی سود نہیں ہے؛ بلکہ پیداوار یا اجرت ہے؛ لیکن اس میں کچھ معاملات سودی بھی ہو جاتے ہیں، تو اس کے منافع میں حرمت نہ ہوگی، جب کہ کمپنی قائم کرنے والے کافر

ہوں؛ البتہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت خود مکروہ ہے، جیسا کہ مبسوط کے قول سے معلوم ہوا۔ اگر مسلمانوں کی کمپنیاں بھی سودی لین دین کرتی ہوں جیسا کہ آج کل غالب یہی ہے، تو کفار کی کمپنیوں کی شرکت، مسلم کمپنیوں کی شرکت سے اہون ہے۔ (ماخوذ از امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۹۷ والبسط فیہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

کھیتی باڑی کے مسائل

ایک کی زمین دوسرے کا بیج کھاد

سوال: زید نے اپنی زمین بکر کو اس طرح کاشت کے لیے دی کہ پانی، کھاد، بیج سب کچھ بکر کے ذمہ رہے گا اور زید کو اس کی زمین کے عوض پیداوار کا ایک تہائی حصہ دیا جائے گا یہ معاملہ شرعاً صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ ومنها: ان تكون الارض من جانب، والباقی كله من جانب، وهذا ايضاً جائز. لان العامل يصير مستأجراً للارض لا غير، ببعض الخارج الذى هو نماء ملكه وهو البذر. (بدائع الصنائع ١٧٩/٦)

اگر مزارع بلا شرط اپنی خوشی سے یہ امور انجام دیتا ہے تو درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صاحب زمین کا بیج، کھاد اور عامل کی محنت

سوال: صاحبِ زمین زید نے بکر سے اس طرح معاملہ کیا کہ بیج، کھاد، زمین سب کچھ زید کے ذمہ رہے گا، بکر کی تو صرف محنت ہوگی اور بکر کو محنت کے عوض پانچواں یا چھٹہ حصہ طے شدہ دیا جائے گا شرعاً اس طرح معاملہ کرنا کیسا ہے؟

نوٹ: اس صورت میں زید بکر سے کھیتی کے کام کے علاوہ مثلاً جانوروں کی نگرانی، گھاس کاٹنا وغیرہ جیسے کام بھی کراتا ہے، اور کھیتی کے کام میں زید خود بھی بکر کا ساتھ دیتا ہے، اور یہ بات بہ طیب خاطر عرف عام کی وجہ سے کی جاتی ہے، شریعت کی رو سے یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ان تکون الارض والبذر والبقر والآلة من جانب والعمل من جانب، وهذا جائز؛ لان صاحب الارض يصير مستأجرا للعامل لا غير، ليعمل له فى ارضه ببعض الخارج الذى هو نماء ملكه وهو البذر. (بدائع الصنائع ۶/۱۷۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صاحبِ زمین اور عامل کی شرکت بیج وغیرہ میں

سوال: زید صاحب زمین ہے، بکر سے اس نے اس طرح معاملہ کیا کہ تیری صرف محنت، اور بیج، کھاد، پانی وغیرہ سب میں ہم دونوں کا آدھا آدھا حصہ اور پیداوار میں سے بھی ہر ایک کا آدھا آدھا حصہ، زید صاحبِ زمین کا بکر سے اس طرح کل اخراجات میں بکر کو آدھے حصہ کا ذمہ دار ٹھہرا کر پیداوار میں آدھے حصہ کا شریک کرنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ صورت درست نہیں ہے۔ومنها: ان يشترط فى عقد المزارعة ان يكون بعض البذر من قبل احدهما والبعض من قبل الآخر وهذا لا يجوز، لان كل واحد منهما يصير مستأجرا صاحبه فى قدر بذره فيجتمع استيجار الأرض والعمل من جانب واحد وانه مفسد. (بدائع الصنائع ۶/ ۱۸۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ
۱۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

ایک کی زمین دوسرے کا پانی تیسرے کی محنت

سوال: زید کا پانی، بکر کی زمین، عمر کی محنت، پیداوار میں سب برابر کے شریک

شرعاً یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ درست نہیں ہے۔ ومنها: ان يشترك جماعة من احدهم الارض ومن الآخر البقر ومن الآخر البذر ومن الرابع العمل، وهذا لا يجوز ايضاً لما مر وفي عين هذا ورد الخبر بالفساد الخ (بدائع الصنائع ۶/۱۷۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صاحبِ زمین کا سب کچھ دوسرے کا پانی کے عوض پیداوار لینا

سوال: زید صاحبِ زمین خود محنت کرتا ہے اور کھاد، بیج وغیرہ کے اخراجات بھی خود ہی اٹھاتا ہے؛ البتہ پانی بکر سے لیتا ہے اور پانی کے عوض پیداوار کا معین حصہ، مثلاً: ثلث دینا طے کرتا ہے، اس طرح پانی کے عوض میں پیداوار میں سے معین حصہ دینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورت مسئولہ میں پانی کی قیمت کے طور پر پیداوار کا معین حصہ دیتا ہے یعنی ثمن مجہول ہے جو درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صاحبِ زمین کا سب کچھ دوسرے کا پانی کے عوض قیمت لینا

سوال: زید صاحب زمین خود محنت کرتا ہے کھاد، بیج وغیرہ کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کرتا ہے اور بکر سے قیمۃً پانی لیتا ہے، یعنی پانی کے عوض اس فصل کا غلہ نہیں، بلکہ روپئے دیتا ہے، اس طرح قیمۃً پانی خریدنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بکر اگر پانی اپنی مشین سے نکال کر اپنے قبضہ میں لاکر زید کی زمین میں پہنچاتا ہے تو یہ معاملہ درست ہے، ورنہ درست نہیں ہے۔

المیاہ اربعة انواع: الاول: الماء الذی یکون فی الاوانی والظروف .... اما الاول فھو مملوك لصاحبه لاحق لاحد فیه، لان الماء وان کان مباحا فی الاصل لکن المباح یملك بالاستیلاء اذالم یکن مملوکا لغیرہ الخ (بدائع الصنائع ۱۸۸/۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ		۱۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مزارع کو گھاس میں حصہ نہ دینا

سوال: صاحبِ زمین زید نے بکر سے محنت کے عوض نصف پر معاملہ کیا؛ لیکن بکر کو صرف پیدا شدہ غلہ میں سے نصف حصہ دیا گیا، گھاس میں سے نصف حصہ نہیں دیا گیا تو شرعاً اس طرح فقط غلہ میں سے نصف حصہ دینا اور گھاس میں سے نہ دینا جب کہ آج کل گھاس کی بھی خاصی قیمت ہوگئی ہے کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر بیج مالک زمین کی طرف سے ہے، اور بوقتِ عقد یہ شرط کی گئی کہ غلہ اور بھوسہ دونوں میں آدھا آدھا حصہ رہے گا، تو یہ معاملہ درست ہے، اور حسبِ شرط بھوسہ کا آدھا حصہ مزارع کو ملے گا، اور اگر بیج مالک زمین کی طرف سے ہے اور بوقت عقد یہ شرط کی گئی ہے کہ غلہ میں آدھا آدھا حصہ اور بھوسہ مالک زمین (جس کا بیج بھی ہے وہ) لے گا تو یہ بھی درست ہے، اور شرط پر عمل ہوگا، اور بوقت عقد بھوسہ کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے، تو عرف اگر یہ ہے کہ بھوسہ میں بھی حصہ ملتا ہے، تو مالک زمین کو چاہیے کہ بھوسہ میں آدھا حصہ مزارع کو دے، اور اگر عرف نہیں ہے تو جس کا بیج ہے بھوسہ اسی کا سمجھا جائے گا۔ (تفصیل المسئلة فی الدر المختار والشامی ۱۹۴/۵-۱۹۵ وتقریرات الرافعی علی الشامی ۳۰۰/۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مزدوروں کو اجرت کے بجائے غلہ یا گھاس دینا

سوال: کھیت میں فصل تیار ہونے پر کاٹنے کے لیے جو مزدور لائے جاتے ہیں عموماً وہ اپنی مزدوری نقد روپیوں کی صورت میں لینے پر تیار نہیں ہوتے، بلکہ مزدوری میں غلہ طلب کرتے ہیں، چنانچہ بعض مرتبہ غلہ ہی مزدوری میں طے کیا جاتا ہے کہ مثلاً چالیس کیلو غلہ دیا جائے گا شرعاً یہ صورت کیسی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس کھیت میں وہ مزدور کاٹ رہے ہیں اسی سے نکلنے والا غلہ اجرت میں طے کیا گیا تو یہ اجارہ فاسد ہے، یہ قفیز طحان والی صورت ہے جو ممنوع ہے۔ اور اگر مطلق چالیس کیلو غلہ بطور اجرت مقرر کیا گیا اور ضروری نہیں قرار دیا گیا کہ یہی غلہ جو اس کھیت سے نکلے گا وہ دینا ہے، تو اجارہ درست ہے، بعد میں مالک کو اختیار ہے، چاہے اسی غلہ میں سے دے، چاہے دوسرا کوئی غلہ دے؛ البتہ یہ یاد رہے کہ غلہ کی جنس اور نوع وغیرہ متعین ہونی چاہیے۔ (در مختار مع الشامی ۵/۳۹، ۴۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ غفرلہ ۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مزدور کو اسی کے کام سے اجرت دینا

سوال: کھیت میں فصل تیار ہونے پر کاٹنے والے مزدوروں کو مزدوری میں غلہ مع گھاس دیا جاتا ہے، جس میں غلہ کتنا ہے اور گھاس کتنی ہے، مقدار کی تعیین نہیں ہوتی، شرعاً یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

ایضاً

سوال: کھیت میں فصل تیار ہونے پر کاٹنے والے مزدوروں کو صرف گھاس دی

جاتی ہے، اس طرح کہ مزدور اس بات پر رضا مند ہوتے ہیں کہ کھیت کاٹ کر گھاس ہم لے لیں گے، اور رائی وغیرہ فصل مالک زمین وغیرہ کو دے دیں گے، شرعاً اس طرح کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دونوں صورتوں میں اجارہ فاسد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کھیت کے محافظ کو اجرت میں غلہ دینا

سوال: فصل کی پرندوں وغیرہ سے حفاظت کے لیے ایک شخص اجرت پر رکھا جاتا ہے، اور اجرت میں اس کو بیس تیس کیلو مقرر مقدار میں غلہ دینا طے کیا جاتا ہے، یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اسی فصل کا غلہ اجرت میں مقرر کیا گیا ہے تو اجارہ فاسد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مرتہن کا راہن کو قرض دے کر شیٔ مرہون کم اجرت پر کرایہ سے لینا

سوال: زید نے عبداللہ کو دس ہزار روپیہ قرض دیے اور اس کی زمین رہن رکھ لی، پھر عبداللہ سے وہی زمین، رائج کرایہ سے بہت کم کرایہ پر، کھیتی کرنے کے لیے لی، شرعاً اس طرح کا معاملہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید نے جب اس مرھونہ زمین کو اجرت پر کاشت کرنے کے لیے لیا تو اگر قبضہ کی تجدید ہوئی تھی تو نفس عقد اجارہ سے سابقہ عقد رہن باطل ہو گیا، اور اگر

قبضہ کی تجدید نہیں ہوئی تھی تو یہ اجارہ فاسدہ ہے؛ اس لیے نفس عقد اجارہ سے سابقہ عقد رھن ابھی باطل نہیں ہوا ہے؛ البتہ جب اس پر اتنا زمانہ گزرا جس میں اجرت مثل کا کچھ حصہ واجب ہوجاتا ہے، تب عقد رہن باطل ہوگیا۔

واماالاجارة فالمستاجر ان كان هو الراهن فهى باطلة، وكانت بمنزلةماإذا اعارمنه او اودعه وان كان هو المرتهن وجدد القبض للاجارة أو أجنبيا بمباشرة احدهماالعقد باذن الآخر بطل الرهن الخ (شامی ٥/٣٦٣)

وفى البزازية وان استاجرها المرتهن فاسدا ووصل اليها ومضى زمان بمقدار ما يجب فيه شىء من الاجرة بطل الرهن.اھ (شامی ٥/٣٦٤)

لیکن چوں کہ یہ بات یقینی ہے کہ اجرت میں یہ رعایت قرض کی وجہ سے ہے؛ اس لیے ناجائز ہے، اور "کل قرض جر نفعا" کے کلیہ میں داخل ہے، اگر عقد رھن میں مشروط ہے تب تو ظاہر ہی ہے، اور اگر مشروط بھی نہ ہو؛ لیکن چوں کہ متعارف ہے؛ اس لیے حسب قاعدہ "المعروف كالمشروط" کے بھی ناجائز ہے۔ (امداد الفتاوی ۳/۴۵۹ بتغیر یسیر) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

مرھون زمین سے انتفاع

سوال: زید نے بکر کو پانچ ہزار روپیہ قرض دیئے اور اس کی زمین رھن (گروی) رکھ لی، اور بکر سے کہا کہ تیری زمین میں میں کھیتی کروں گا؛ لیکن کچھ دوں گا نہیں، زید کے لیے یہ معاملہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

انتفاع مرھون سے اگر مشروط یا معروف ہو جیسا کہ آج کل ہے، ربا حرام ہے،

اور ربا اذن سے حلال نہیں ہوتا۔ الخ (امداد الفتاوی ۳/۴۵۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مقروض کی زمین معمولی حصہ پر لینا

سوال: زید نے عبدالرحمٰن کو پانچ ہزار روپیہ قرض دیئے اور عبدالرحمٰن کی زمین بہت کم حصہ پر مثلاً: عشر دسویں حصہ پر بونے کے لیے لی، شرعاً اس طرح قرض کی وجہ سے مقروض سے اس کی زمین کم حصہ پر بونے کے لیے لینا کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ رعایت بھی قرض کی وجہ سے ہے؛ اس لیے ناجائز ہے اور "کل قرض جر نفعا" کے کلیہ میں داخل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

حصہ کی تعیین کے بغیر مزارعت کا معاملہ

سوال: زید نے عبدالکریم کو بیس ہزار روپیہ قرض دیے اور عبدالکریم کی زمین اس بات پر کھیتی کرنے کے لیے لی کہ پیداوار میں سے کچھ تم کو بھی دوں گا، کچھ کی تعیین نہیں کی گئی، بلا تعیین کچھ حصہ پر کسی کی زمین کو کھیتی کرنے کے لینا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ درست نہیں ہے۔ ومنها: ان یکون ذلك البعض من الخارج معلوم القدر من النصف والثلث والربع ونحوه، لان ترك التقدیر یؤدی الی الجهالة المفضیة الی المنازعة، ولهٰذا شرط بیان مقدار الاجرة فی الاجارات. كذا هذا. (بدائع الصنائع ٦/١٧٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زمین کو کرایہ پر لینا

سوال: زید نے بکر سے اس کی کاشت کی زمین ایک سال کے لیے رائج الوقت کرایہ پر لی، یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ واما فی اجارۃ الارض فلابد فیھا من بیان ماتستاجر لہ من الزراعۃ الخ (بدائع الصنائع ۴/۱۷۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

رائج الوقت کرایہ سے کم کرایہ دینا

سوال: زید نے بکر کی زمین کئی سال کا پیشگی کرایہ اس کو دے کر، اس سے رائج الوقت کرایہ سے کم کرایہ پر لی، شرعاً اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔فالحاصل ان الاجرۃ لاتملك عندنا الاباحد معان ثلاثۃ: احدھا: شرط التعجیل فی نفس العقد، والثانی: التعجیل من غیر شرط، والثالث: استیفاء المعقود علیہ. (بدائع الصنائع ۴/۲۰۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

قرض دے کر نفع لینا

سوال: زید نے بکر کو ایک معقول رقم؛ اس لیے دی تا کہ وہ آلو کی کاشت کرے اور فصل تیار ہونے پر زید کو اس کی مکمل رقم واپس کر دے، اور بقیہ میں سے اخراجات نکالنے کے بعد اگر نفع ہوا ہے تو نصف نصف کریں گے، اور اگر نقصان ہوا ہے تو اس کے بھی نصف

نصف کے دونوں ذمہ دار رہیں گے،تو شرعا اس طرح معاملہ کرنا کیسا ہے؟

سوال: زید نے بکر کو آلو کی کاشت کے لیے ایک رقم اس شرط پر دی کہ زید فصل تیار ہونے پر اپنی پوری رقم واپس لینے کے بعد بقیہ حصہ میں نفع میں بکر کے ساتھ برابر کا شریک ہوگا؛ لیکن خدانخواستہ نقصان ہوا تو وہ صرف بکر کے ذمہ ہوگا، زید نقصان میں بکر کا شریک نہ ہوگا، کیا شرعاً اس طرح صرف نفع میں زید کا اپنی رقم کی وجہ سے بکر کے ساتھ شریک ہونا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ دونوں صورتیں نہ تو مضاربت میں داخل ہیں، اور نہ مزارعت میں؛ بلکہ در حقیقت زید بکر کو قرض دے کر نفع حاصل کر رہا ہے جو خالص ربا ہے جو حرام اور ناجائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

آلو کا ایک پودا اکھیڑ کر پورے کھیت کے آلو کی بیع

سوال: آلو پودے کے نیچے زیرِ زمین لگتے ہیں، آلو پودے کے نیچے لگ گئے ہیں اس بات کو ایک پودا اکھاڑ کر معلوم کر لیا جاتا ہے، اور اسی وقت مشتری مالک سے آلو کا بھاؤ طے کر کے خرید لیتا ہے، حالانکہ اس وقت آلو کی مقدار معلوم نہیں ہوتی ہے، اس بیع سے بائع، کل پیداوار مشتری کو دینا اور مشتری، کل پیداوار لینا اپنے ذمہ ضروری سمجھتا ہے، کیا شرعاً یہ بیع درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع درست ہے۔

صح الشراء والبيع بما لم يرياه، والاشارة اليه اي المبيع اوالى مكانه

شـرط الجواز الخ (در مختار علی هامش الشامی ٤/ ٧٠) ولـو اشتـری شیئا مغیبا فی الارض کـالبـصـل والثوم والجزر وما اشبهه لم یکن برویة بعضه مختاراً وهو عـلی خیاره مالم یر جمیعه وهذا عند ابی حنیفة رحمه الله، وعندهما اذا قلع شیـئـا مـنـه یستـدل بـه عـلـی الباقی ورضی به سقط خیاره، کذا فی السراج الـوهـاج. وعـامة المشائخ رحمهم الله تعالیٰ قالوا: لم یذکر هذه المسئلة فی ظـاهـر الـروایة وانـمـا ذکرها فی الامالی عن ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ انه قـال: ان کان المغیب فی الارض مما یکال او یوزن بعد القلع کالثوم والجزر والبـصـل فـقـلـع المشتری شیئا باذن البائع او قلع البائع ان کان المقلوع مما یـدخـل تحت الکیل او الوزن اذا رأي المقلوع ورضی به لزم البیع فی الکل، وتـکـون رؤیة البـعـض کرؤیة الکل اذا وجد الباقی کذلك، وان کان المقلوع شیـئـاً یسیـراً لا یـدخـل تحت الوزن لا یبطل خیاره، هذا اذا قلع البائع او قلع الـمشتـری بـاذن البـائـع، فـان قلع المشتری منه شیئا بغیر اذن البائع ان کان الـمقلوع شیئا له ثمن لزم البیع فی الکل رضی به او لم یرض. کذا فی فتاویٰ قـاضیخان. وجد فی ناحیة اخری: من الارض اقل منها او لم یجد فیها شیئا. کـذا فی المحیط، وان کان المقلوع قلیلا لا ثمن له لا یبطل خیاره، والفتویٰ فـی هـذه الـمسـائـل عـلـی قـول ابـی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ کذا فی فتاویٰ قاضیخان. (عالمگیری ٣/ ٦٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد غفرلہ

ایضاً

سوال: ایک دو پودے اکھاڑ کر یہ معلوم کر لیا جاتا ہے کہ اب آلو بڑے ہو گئے ہیں، اور اس وقت بھاؤ طے کر کے خریدار کل ہونے والی پیداوار کو جس کی مقدار بھی معلوم نہیں خرید لیتا ہے، اور مالک بیچ دیتا ہے، یہ خرید وفروخت شرعاً صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ (کمامر فی السابق) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد غفرلہ ۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

جوار کی فصل کاٹنے کا وقت مقرر کیے بغیر فصل کی بیع

سوال: (۱) جوار کی فصل تیار ہو کر کھیت میں کھڑی ہے، زید نے جانوروں کو کھلانے کے لیے اس کو خرید لیا اور کھیت سے کاٹ کر لیجانے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا شرعاً اس بیع کا کیا حکم ہے؟

گنا کاٹنے کی تاریخ طے کیے بغیر بیع

سوال: (۲) گنے کی فصل جو کھیت میں کھڑی تھی خریدار نے خریدی اور گنا کاٹ کر لے یجانے کی کوئی تاریخ طے نہیں کی، تو یہ بیع درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲) درست ہے۔ وان كان بحيث ينتفع به ولو علفا للدواب فالبيع جائز باتفاق اهل المذهب اذاباع بشرط القطع او مطلقا. (شامی ٤/٤٢)

البتہ بائع کے مطالبہ پر مشتری کے لیے فوری طور پر کاٹ لینا ضروری ہے۔

ویقطعها المشتری فی الحال جبرا علیه. (در مختار) (قوله ویقطعها المشتری) ای اذا طلب البائع تفریغ ملکه. (شامی ٤/ ١٤٣)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

پھل آنے سے پہلے ان کی بیع

سوال: (۱) زید باغ کا مالک ہے اور آم، پپیتا، لیموں وغیرہ درخت پر لگنے سے قبل ہی بیچ دیتا ہے، شرعاً اس بیع کا کیا حکم ہے؟

سوال: (۲) بکر باغ والوں سے کئی کئی سالوں کے پھل آم، پپیتا وغیرہ پہلے سے خرید لیتا ہے، بکر کے لیے اس طرح بیع کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲): یہ دونوں بیع درست نہیں ہیں۔

اما قبل الظهور فلایصح اتفاقا (در مختار)

(قوله اما قبل الظهور) أشار الی ان البروز بمعنی الظهور، والمراد به انفراك الزهر عنها وانعقادها ثمرة وان صغرت. (شامی ٤/١٤)

اما مسئلة بیع الثمار فی حد ذاتها فان لهٰذا البیع صورا مختلفة:

(الاولی): ان تباع الثمار قبل ظهورها وهٰذالم یقل بجوازه احد سواء جری به التعامل اولا. الخ (تکمله فتح الملهم ١/٣٩٣)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خودرو گھاس بیچنا جائز نہیں

سوال: زید نے اپنے کھیت کی خودرو گھاس بکر کو بغیر کاٹے ہوئے بیچ دی، کیا یہ

بیع درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست نہیں ہے۔ ثم الکلام فی الکلأ علی اوجه: اعمها مانبت فی موضع غیر مملوك لاحد، فالناس شرکاء فی الرعی والاحتشاش منه کالشرکة فی ماء البحار، واخص منه وهو مانبت فی ارض مملوکة بلاانبات صاحبها وهو کذلك الخ (شامی ۵/۳۱۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ غفرلہ ۲۳/ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

چراگاہ کا اجارہ درست نہیں ہے

سوال: زید سے بکر نے اپنی بکریاں چرانے کے لیے اس کے کھیت کی خودرو گھاس اس طرح خریدی کہ بکریاں وہیں کھیت میں آکر چرا کریں گی، یہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بھی درست نہیں ہے۔

(لما مر سابقا) ولان هذه اجارة علی استهلاك العین. فی الشامیة: لایصح اجارة المراعی. (۴/ ۱۱۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

لچکا گھاس اگنے سے پہلے اس کی بیع

سوال: (۱) لچکا ایک قسم کی گھاس ہے، اور جانوروں کو کھلائی جاتی ہے، اس کی باقاعدہ کاشت کی جاتی ہے، یہ گھاس کاٹنے کے بعد بھی بڑھتی رہتی ہے، زید نے اپنے کھیت میں لچکا کی کاشت کی اور بکر کو دو ہزار میں اس طرح پر بیچ دی کہ جب تک گھاس

ہوتی رہے تم اس کو لیتے رہو میں پانی پلاتا رہوں گا، یہ بیع درست ہے؟

ایضاً

سوال: (۲) زید نے اپنے کھیت میں لچکا گھاس کی کاشت کی اور بکر کو ایک ہزار میں کھڑی فصل کی صورت میں اس طرح بیچ دی کہ دو مہینوں تک اس کو کاٹتے رہو، میں پانی پلاتا رہوں گا، یہ گھاس دو تین بار کاٹنے پر بھی بڑھتی رہتی ہے، بیع کی یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دونوں صورتوں میں بیع جائز نہیں۔ لان فیه بیع المعدوم، والشرط الفاسد.

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

رشوت دے کر نہر کا پانی کھیت کو پلانا

سوال: (۱) سرکاری نہر سے زمین داروں کو فی بیگہ اجرت پر پانی دیا جاتا ہے، بعض لوگ حکام کو رشوت دے کر تیس بیگہ زمین کو پانی پلاتے ہیں اور صرف بیس بیگہ کی اجرت دیتے ہیں، شرعاً یہ درست ہے؟

سوال: (۲) بکر نے سرکاری نہر سے جب کہ زید کی زمین کو پانی دیا جا رہا تھا، حکام کو رشوت دے کر اپنی زمین کو بھی پانی پلایا، جس کی کوئی اجرت سرکار کو نہیں دی، یہ جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲): یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سرکاری نہر سے گاؤں کا تالاب بھرنا

سوال: سرکاری نہر سے چرا کر یا زبردستی گاؤں والے اپنے گاؤں کا تالاب بھر

لیتے ہیں اور اس پانی سے پورا گاؤں فائدہ اٹھاتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کی گنجائش ہے؛ اس لیے کہ یہ پانی پینے پلانے (جانوروں اور انسانوں کے) لیے لیا جاتا ہے۔

(والشفة: شرب بنی آدم، والبهائم) بالشفاه، (ولكل حقها فی كل ماء لم يحرز باناء) (در مختار) (قوله بالشفاه) هٰذا اصله، والمراد استعمال بنی آدم لدفع العطش، او للطبخ، او الوضوء، او الغسل، او غسل الثياب ونحوها كما فی المبسوط. والمراد به فی حق البهائم الاستعمال للعطش ونحوه لما يناسبها. افاده القهستانی. الخ (شامی ۳۱۱/۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مکانات کی کرایہ داری اور خرید وفروخت کے مسائل

کرایہ دار مکان دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے

سوال: (۱): زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ پر مکان لیا، اور عمر کو بکر کی اجازت کے بغیر ماہانہ سوا سو روپئے کرایہ پر دے دیا یہ درست ہے؟

سوال: (۲) زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ پر مکان لیا، اور اس میں اپنی الماری (کباٹ) لگائی، بجلی کے پنکھے لگائے، ایسی کچھ اور بھی اپنی منقول وغیر منقول اشیاء اس میں چھوڑیں اور عمر کو بکر کی اجازت کے بغیر ماہانہ دوسو روپئے کرایہ پر دیدیا اس خیال سے کہ میری اشیاء کی وجہ سے میں زائد کرایہ لے رہا ہوں، زید کا اس خیال سے زائد کرایہ لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲): درست ہے۔ (تصح اجارة حانوت) ای دکان (ودار بلا بیان مایعمل فیها) لصرفه للمتعارف، (و) بلا بیان (من یسکنها) فله ان یسکنها غیره باجارة وغیرها کما سیجئ . (درمختار) (قوله فله ان یسکنها غیره) ای ولو شرط ان یسکنها وحده منفرداً الخ (شامی ۱۹/۵)

(وفیما لا یختلف به بطل تقییده حتی لو شرط سکنی واحد له ان یسکن غیره) یعنی فیما لا یختلف باختلاف المستعمل کالدور للسکنی لا یعتبر تقییده حتی لو شرط سکنی رجل بعینه فی الدار له ان یسکن غیره لان التقیید لا یفید لعدم التفاوت. (تبیین الحقائق ۱۱۶/۵)

لیکن جو زائد کرایہ ہے، مثلاً: صورتِ مسئولہ میں پچھتر روپئے کی رقم جو بکر کو زائد

ملی اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، اس رقم کو وہ اپنے استعمال میں نہ لاوے؛ البتہ اگر بکر نے اس مکان میں اصلاح ومرمت کے ذریعہ کسی قسم کا اضافہ کر دیا ہے جیسا کہ دوسری صورت میں ہے، تو اب وہ زائد رقم جو بکر کو حاصل ہوئی وہ استعمال کر سکتا ہے۔

ولو آجر باكثر تصدق بالفضل الا فى مسئلتين اذا آجرها بخلاف الجنس او اصلح فيها شيئا. (درمختار) (قوله او اصلح فيها شيئا) بان جصصها او فعل فيها مسناة وكذا كل عمل قائم لان الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملاً لأمره على الصلاح كما فى المبسوط. (شامى ۵/ ۲۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کرایہ دار کا ڈپازٹ لے کر دوسرے کو مکان کرایہ پر دینا

سوال: زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ پر مکان لیا اور بکر کی اجازت کے بغیر عمر سے دس ہزار روپیہ ڈپازٹ لے کر پچاس روپیہ کرایہ پر ہی ایک سال کے لیے کرایہ پر دیا، زید کا بکر کے مکان کو اس طرح ڈپازٹ لے کر اسی مقدار پر کرایہ پر دینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ڈپازٹ کی رقم اگر اس لیے لی ہے کہ وہ زید کے پاس بطورِ وثیقہ محفوظ رہے تو جائز ہے؛ لیکن زید کے لیے اس رقم میں کوئی تصرف درست اور جائز نہیں ہے، اور اگر ڈپازٹ کے نام سے رقم ہتھیانا یا اس میں تصرف کرنا مقصود ہے، تو جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

ڈپازٹ کی شرعی حیثیت

سوال: زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپئے کرایہ پر مکان لیا، اور بکر کی اجازت

کے بغیر عمر سے دس ہزار روپیہ ڈپازٹ لے کر اس کو ایک سال کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ پر دیا تو اس ڈپازٹ کی شرعاً کیا حیثیت ہے، اور زید اس رقم کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جتنی مدت کے لیے زید نے مکان کرایہ پر لیا ہے، اسی مدت کے اندر وہ عمر کو وہ مکان کرایہ پر دے رہا ہے تو جائز ہے۔ (کما مر سابقا) اور اگر مدت اجارہ ختم ہو چکی ہے، یا اجارہ مطلقہ ہوا تھا اور ختم ماہ پر بکر نے مکان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اس کے باوجود زید ملکی قوانین کا سہارا لے کر مکان پر قبضہ جمائے رہے اور عمر کو کرایہ پر دے، تو یہ صورت ناجائز اور حرام ہے؟ اوپر جواز والی صورت جو گزری اس میں اگر وہ ڈپازٹ کی رقم بطور وثیقہ لے رہا ہے تو جائز ہے؛ لیکن یہ بحکمِ رہن ہے،[1] اس کو زید اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا بلکہ وہ امانت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کس پر ہے؟

سوال: زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ پر مکان لیا اور بکر کی اجازت کے بغیر عمر سے دس ہزار روپیہ ڈپازٹ لے کر اس کو ایک سال کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ پر دیا تو اس ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب وہ رقم بحکمِ رہن ہوئی تو اس کی زکوٰۃ نہ عمر پر واجب ہے نہ زید پر۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

---

[1] فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے بھی ڈپازٹ کی رقم کو رہن کی سی حیثیت قرار دی ہے۔ ملاحظہ کیجیے: (فتاویٰ قاضی ص ۸۶، ۸۷) (از مرتب)

ایضاً

سوال: زید خود صاحبِ مکان ہے اس نے اپنا مکان عمر کو ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ پر اس شرط سے دیا کہ پچیس ہزار روپیہ ڈپازٹ دینا ہوگی، چنانچہ زید نے عمر سے پچیس ہزار روپئے ڈپازٹ میں لیے، سوال یہ ہے کہ......

(الف) اس طرح زید کا عمر سے کرایہ کے علاوہ ڈپازٹ کی رقم لینا کیسا ہے؟

(ب) اس رقم کو زید اپنے تصرف میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

(ج) اس رقم کی زکوٰۃ زید پر واجب ہوگی یا عمر پر؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ڈپازٹ کی وہ رقم بحکمِ رہن ہوکر امانت ٹھہری تو زید کا اس رقم کو اپنے تصرف میں لانا درست نہیں ہے، اور اس کی زکوٰۃ نہ عمر پر ہوگی نہ زید پر۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

بیع میں چھ ماہ میں رقم ادا کرنے کی شرط

سوال: زید نے بکر سے ایک مکان ایک لاکھ روپئے میں اس شرط پر خریدا کہ چھ مہینے میں اس رقم کو ادا کر کے قبضہ لے لیا جائے گا، اور بیعانہ کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد ادا کیے، مدت مقررہ پوری ہونے سے قبل سوا لاکھ روپیہ میں زید سے اس مکان کو لینے کے لیے عمر تیار ہوگیا، چنانچہ زید نے بکر سے یہ بات کر کے کہ مکان عمر کے نام کر دے، عمر سے سوا لاکھ روپیہ لے کر ایک لاکھ روپئے بکر کو دیئے، اور عمر کے نام مکان کروادیا، کیا یہ بیع درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقد میں جو یہ شرط لگائی ہے کہ چھ مہینے میں اس رقم کو ادا کر کے قبضہ لے لیا جائے گا،

اس سے کیا مقصد ہے؟ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ زرِ ثمن کی ادائیگی میں زید نے بکر سے چھ مہینہ کی مہلت طلب کی جو بکر نے دیدی، تو یہ سودا ادھار ہوا، اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ زید اگر چھ مہینہ میں زرِ ثمن ادا نہ کرے تو یہ عقد فسخ سمجھا جاوے گا، تو یہ خیار نقد ہوا، دونوں میں سے جو صورت بھی ہو اس کی تعیین فرمائی جائے اس کے بعد جواب دیا جاوے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا کرایہ دار مکان کی پگڑی لے کر دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے؟

سوال: زید نے بکر سے ماہانہ ایک سو روپئے کرایہ سے مکان لیا، اور محمود کو پچاس ہزار روپیہ پگڑی لے کر اسی کرایہ پر دیا، اصل مالک مکان بکر کو بھی دس ہزار روپئے دے کر محمود کو اس مکان کا کرایہ دار بنانے پر خوش کر لیا، کیا زید کے لیے یہ معاملہ درست ہے؟ اور یہ رقم اس کے لیے حلال طیب ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ معاملہ درست نہیں ہے، اور یہ رقم زید کے لیے حلال نہیں ہے۔ (کفایت المفتی)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: زید نے بکر سے ماہانہ پچاس روپیہ پر مکان کرایہ پر لیا، عمر نے زید سے کہا تم یہ مکان مجھے کرایہ پر دیدو میں تم کو بیس ہزار روپئے دیتا ہوں اور بکر کو بھی اس بات پر خوش کر لوں گا کہ وہ مجھے اپنے مکان کا کرایہ دار تسلیم کر لے کیا زید کے لیے اس طرح اصل مالک کی رضا معلوم کیے بغیر معاملہ کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جتنی مدت کے لیے زید نے بکر سے یہ مکان کرایہ پر لیا ہے اتنی مدت تک کے

لیے زید کا اس مکان کو عمر کو کرایہ پر دینا درست ہے، چاہے مالک مکان راضی ہو یا نہ ہو؛ لیکن بیس ہزار کی جو رقم زید نے عمر سے لی ہے وہ درست نہیں یہ واپس کر دے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

مکان کا ناجائز قبضہ چھوڑنے پر عوض لینا

سوال: زید نے بکر سے مکان کرایہ پر لیا، عمر اس مکان کو زید سے پچیس ہزار روپئے پگڑی پر لے رہا ہے، زید عمر کو قبضہ دیتے وقت اس مکان میں اپنا کچھ منقول یا غیر منقول سامان چھوڑ رہا ہے، اور کہتا ہے کہ میں یہ رقم پگڑی کی نہیں لے رہا؛ بلکہ اپنے سامان کی لے رہا ہوں، حالانکہ وہ رقم اس سامان کی قیمت سے بہت زیادہ ہے، تو کیا زید کے لیے قبضہ چھوڑتے وقت معمولی سامان مکان میں چھوڑ کر خطیر (زیادہ) رقم لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ناجائز قبضہ چھوڑنے پر عوض لینا جائز نہیں ہے، اور اسی ناجائز قبضہ کی بنیاد پر دوسرے کو کرایہ پر مکان دینا بھی جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر زید نے جتنی مدت کے لیے مکان بکر سے کرایہ پر لیا ہے اتنی مدت کے لیے وہ عمر کو کرایہ پر دے رہا ہے تو درست ہے، اس صورت میں اگر وہ عمر کو یہ کہتا ہے کہ: میں اپنا فلاں سامان جو اس میں چھوڑ رہا ہوں اس کی قیمت کے عوض تم سے یہ زائد رقم وصول کر رہا ہوں اور عمر اس کو منظور کرتا ہے، تب بھی (المعروف کالمشروط) والے اصول کے پیشِ نظر حقیقت یہ ہے کہ یہ عوض قبضہ کا ہے؛ اس لیے درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک ممبر کا مکان کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے مکان بیچ دینا

سوال: کچھ احباب مل کر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بناتے ہیں، اور مشترک زمین خرید کر اس پر رہنے کے مکانات بناتے ہیں، اتنے ممبر بناتے ہیں جتنے مکانات بنانے ہوتے ہیں، اور سب سے قسط وار رقم لے کر جیسے جیسے رقم آتی ہے مکانات تعمیر کرتے جاتے ہیں، جب مکانات تیار ہو جاتے ہیں تو سب ممبران مل کر قرعہ اندازی سے مکانات تقسیم کر لیتے ہیں، جس کے قرعہ میں جس نمبر کا مکان نکلتا ہے وہ اس کا ہو جاتا ہے اور باقاعدہ اس کے نام پر کر دیا جاتا ہے؛ لیکن بعض ممبران تعمیر کے درمیان ہی اب تک ادا کردہ قیمت سے بہت زیادہ رقم پر اپنے مکان کو بیچ دیتے ہیں، تو اس طرح تعمیر کی تکمیل اور قبضہ سے قبل ہی اس مکان کو بیچ دینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر فروخت کرنے والا یہ کہہ کر فروخت کرتا ہے کہ میں نے اپنا مکان بیچا، حالانکہ مکان ابھی بنا نہیں ہے تو یہ بیع المعدوم ہوئی جو باطل ہے؛ البتہ اگر وہ یہ کہہ کر اس خرید شدہ زمین میں اور مکانات کا جتنا حصہ تعمیر ہو چکا اس میں میرا جتنا حصہ ہے وہ تمہیں بیچا، تو یہ بیع درست ہوگی؛ لیکن اس صورت میں دیگر شرکاء کو حقِ شفعہ حاصل ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بلڈر سے معہود مکان خریدنا

سوال: عمارت بنانے والے جن کو بلڈر کہتے ہیں، وہ خود زمین خرید کر اس پر مکانات، دوکانات تعمیر کرا کر بیچتے ہیں، مکان تیار ہونے سے پہلے وہ اس کا پلان اور نقشہ تیار کر کے نقشہ بنا کر ان میں سے خریدار کو اس کی حسبِ پسند مکان بیچتے ہیں، مکان کا مجموعی رقبہ اور کمروں کی تعداد سائز وغیرہ تفصیلات بتا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فی الحال تم کو اتنی

رقم دینی ہوگی، اور آئندہ قسط وار ہر قسط ہزار روپۓ کے حساب سے مجموعی اتنی رقم دینی ہوگی، اور بلڈنگ تیار ہونے پر حکومت میں پاس کرا کے ہم تم کو قبضہ دیدیں گے تو کیا اس طرح بیع کرنا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس کا تعامل ہے تو یہ استصناع میں داخل ہوکر درست ہوگا۔ ومنهاان يكون مما يجرى فيه التعامل بين الناس الخ. (بدائع الصنائع ٥/ ٣) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

شرعی قبضہ اور تکمیل سے پہلے نفع لے کر مکان بیچنا

سوال: عمارت بنا کر بیچنے کا پیشہ کرنے والے جن کو بلڈر کہتے ہیں، زمین خرید کر اس پر مکانات تعمیر کر کے بیچتے ہیں، مکان تیار ہونے سے پہلے وہ اس کا پلان اور نقشہ تیار کر کے نقشہ بتا کر ان میں سے خریدار کو اس کی حسبِ پسند مکان بیچتے ہیں، مکان کا مجموعی رقبہ اور کمروں کی تعداد، سائز وغیرہ تفصیلات بتا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فی الحال تم کو اتنی رقم دینی ہوگی اور آئندہ قسط وار، ہر قسط ہزار روپۓ کے حساب سے مجموعی اتنی رقم دینا ہوگی، اور بلڈنگ تیار ہونے پر حکومت میں پاس کرا کے ہم تم کو قبضہ دیدیں گے، زید نے اس طرح کے بلڈر سے ایک مکان خریدا، چند قسطیں ادا کرنے کے بعد نفع لے کر بکر کے ہاتھ بیچ دیا، بکر نے بھی چند قسطیں ادا کر کے نفع لے کر محمود کو بیچ دیا، اور محمود نے بھی مکمل ہونے سے قبل ہی چند قسطیں ادا کر کے شاکر کے ہاتھ بیچ دیا، سوال یہ ہے کہ تکمیل اور قبضہ سے قبل اس طرح نفع لے کر بیچنا درست ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع درست نہیں ہے۔

لانہ بیع مالیس عندالانسان، وانما اجیز فی الاستصناع استحسانا وھذا لیس من الاستصناع، کما ھو ظاھر. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایضاً

سوال: عمارت بنا کر بیچنے کا پیشہ کرنے والے جن کو بلڈر کہتے ہیں، زمین خرید کر اس پر مکانات تعمیر کر کے بیچتے ہیں، مکان تیار ہونے سے پہلے وہ اس کا پلان اور نقشہ تیار کر کے نقشہ بنا کر ان میں سے خریدار کو اس کی حسبِ پسند مکان بیچتے ہیں، مکان کا مجموعی رقبہ اور کمروں کی تعداد سائز وغیرہ تفصیلات بتا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فی الحال تم کو اتنی رقم دینی ہوگی، اور قسط وار ہر قسط ایک ہزار روپئے کے حساب سے مجموعی اتنی رقم دینا ہوگی، اور بلڈنگ تیار ہونے پر حکومت میں پاس کرا کر ہم تم کو قبضہ دے دیں گے، زید نے اس طرح کا ایک مکان خریدا؛ لیکن چند قسطیں ادا کرنے کے بعد خود اسی بلڈر کے ہاتھ نفع لے کر وہ مکان بیچ دیا، تو زید کا خود اسی بلڈر کے ہاتھ نفع لے کر اس طرح سے اس مکان کا بیچنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بھی درست نہیں ہے۔ کما ھو ظاھر. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کرایہ کے مکان کی مرمت کی اجازت کے عوض مالک مکان کا کرایہ دار سے رقم کا مطالبہ کرنا

سوال: کرایہ دار اگر مکان میں کچھ ضروری مرمت یا ترمیم کرنا چاہتا ہے تو

(بلدیہ) میونسپلٹی کی اجازت کے بغیر قانوناً نہیں کرسکتا، اور میونسپلٹی مالک کی اجازت کے بغیر اجازت نہیں دیتی، مالک مکان اجازت دینے کے لیے کرایہ دار سے ایک رقم کا مطالبہ کرتا ہے، شرعاً یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور یہ رقم لینا دینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کی بنیاد بھی ناجائز قبضہ پر ہے؛ اس لیے اصل تو یہ ہے کہ مدت اجارہ کے ختم پر کرایہ دار کو چاہیے کہ مکان مالک کے حوالہ کردے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

کسی ایک ممبر سے ہاؤسنگ کے مصارف ڈبل وصول کرنا

سوال: کچھ احباب مل کر مشترک زمین خریدتے ہیں، اور اس پر رہنے کے مکانات تعمیر کرتے ہیں، جتنے مکانات بنانے ہوتے ہیں اتنے ممبر بناتے ہیں اس کو ہاؤسنگ سوسائٹی کہتے ہیں، اور جب مکانات تعمیر ہوجاتے ہیں تو قرعہ اندازی سے تقسیم کردیے جاتے ہیں، ایسے اجتماعی مکانات کی کچھ ضروریات اجتماعی بھی ہوتی ہیں، مثلاً: زمین کی صفائی، باغیچہ کی دیکھ بھال، پانی؛ نیز سرکاری ٹیکس کی ادائیگی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اور اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایک کمیٹی بناتے ہیں، یہ کمیٹی تمام ممبران کے لیے کچھ قوانین بھی بناتی ہے، تاکہ سب کو سہولت ہو اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اور ماہانہ کچھ رقم بھی وصول کرتی ہے، تاکہ اجتماعی ضروریات کو پورا کیا جاسکے، ایسی ایک کمیٹی نے ایک قانون ایسا بنایا کہ ہماری سوسائٹی کے ممبران میں سے کوئی اگر اپنا مکان اپنے خونی رشتہ دار کے علاوہ کسی کو کرایہ پر دے گا، تو اس سے اجتماعی خرچ اصل ممبروں سے جتنا وصول کیا جاتا ہے، اس

سے ڈبل وصول کیا جائے گا، تو اس کمیٹی کا ایسا قانون بنانا اور زیادہ رقم لینا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وصول کی جانے والی رقم جب پیش آمدہ مصارف کی تکمیل کے لیے حاصل کی جاتی ہے، تو اس کی مقدار بھی اسی کے مطابق ہونی چاہیے، مالک کو اختیار ہے کہ وہ اپنا مکان جس کو چاہے کرایہ پر دے اجنبی کو کرایہ پر دینے کی صورت میں اس سے حصۂ مصارف دوہرا وصول کرنا سمجھ میں نہیں آیا، اگر ایسی صورت میں سرکاری ٹیکس وغیرہ میں اضافہ ہوجاتا ہو تو اس کی وضاحت فرمائی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

گیسٹ ہاؤس وغیرہ کے مسائل

گیسٹ ہاؤس کے مالک کا آنے والے گاہک کے ناجائز کام پر تعاون وغیرہ

سوال: گیسٹ ہاؤس میں آنے والے گاہک نئی نئی عورتوں کو جومختلف ہوتی ہیں، ان کی اہلیہ نہیں ہوتی ساتھ میں لاتے ہیں، اور روم میں قیام کرتے ہیں، زنا کاری کا عمل ہوتا ہے، اور مالک گیسٹ ہاؤس اس کو جانتا ہے؛ نیز بعض مرتبہ شراب لاکر پیتے ہیں، اور بعض مرتبہ گیسٹ ہاؤس کا نوکر باہر سے شراب لاکر دیتا ہے، اور باہر سے لڑکی وغیرہ کا انتظام کر دیتا ہے، اور یہ سب کاروبار چلانے کے لیے کیا جاتا ہے، نہیں کرتا ہے، تو کاروبار ٹھیک نہیں چلتا ہے، تو شراب اور لڑکیاں مہیا کرنا؛ نیز گاہک ساتھ لے کر آئے تو زنا اور شراب کی اجازت دینا کیسا ہے؟ نیز گاہکوں کی چاہت کے لیے اور کاروبار ٹھیک چلے اس کے لیے ریڈیو، ٹیلیویژن، ویڈیو وغیرہ لگانا، فلمی گانے سنانا اور فلمیں وغیرہ دکھلانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ تمام امور اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، اور ان میں سے بعض خود معصیت ہیں۔ ﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ ﴿رب بما انعمت عليّ فلن اکون ظهيرا للمجرمين﴾۔

ایضاً

سوال: اگر گیسٹ ہاؤس کا مالک مذکورہ بالا غلط چیزوں کی ممانعت کرتا ہے اور جلی حروف میں غلط چیزوں کی ممانعت کا سائن بورڈ بھی لگایا ہے، اور اگر ایسا گاہک آ بھی گیا تو اس کو سمجھا بجھا کر باہر بھی نکال دیتا ہے، اس طرح گیسٹ ہاؤس کا کاروبار کرنا شرعاً کیسا ہے؟

اگر مالک کی بے خبری میں گیسٹ ہاؤس میں غلط کام ہو جائے تو مالک گنہ گار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مالک کی طرف سے تمام قسم کی احتیاطی تدابیر کے باوجود غلط کام کسی نے کرلیا تو اس کی ذمہ داری مالک پر عائد نہیں ہوگی، اور مالک گنہ گار نہ ہوگا، ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس کا کاروبار درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

سینما گھر کے قریب خورد و نوش کی کینٹن

سوال: سینما گھر جہاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں، اور اس گھر میں صرف فلم دیکھنے والے ہی لوگوں کی آمد و رفت ہوتی ہے، ان کے علاوہ اور لوگ نہیں آتے، اس گھر میں فلمیں دیکھنے آنے والے لوگوں کے لیے خورد و نوش کی اشیاء فروخت کرنے کے لیے کینٹن بنانا اور چائے اور کھانے پینے کی چیزیں بیچ کر منافع کمانا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چائے اور خورد و نوش کی اشیاء بیچنے والے کا تعلق براہِ راست فلم دیکھنے یا دکھانے سے نہیں، اور سببِ قریب کے درجہ میں بھی نہیں ہے؛ اس لیے ضوابط و اصول فقہ کے پیشِ نظر یہ کینٹن والا کاروبار جائز ہے؛ البتہ محل وقوع کے پیش نظر مناسب یہی ہے کہ اس سے بچا جائے۔ (وان اردت التفصيل فى هذه المسئلة فعليك برسالة المفتى محمد شفيع رحمه الله تعالىٰ المسماة ب "تفصيل الكلام فى مسئلة الاعانة على الحرام" من جواهر الفقه ٢/ ٤٥١) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔　　کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

بیمہ اور سود کے مسائل

جان و مال کا بیمہ کرانا

سوال: اس زمانہ میں ایک کمپنی جان و مال وغیرہ کی بالمعاوضہ حفاظت کا ذمہ لینے کا کاروبار کرتی ہے، اس کو بیمہ کمپنی کہتے ہیں، بعض اشیاء میں سرکاری قانون سے بیمہ لینا لازمی ہوتا ہے، اس کے خلاف کرنے پر اس ضروری کام کو چھوڑنا پڑتا ہے، مثلاً: ٹرک، رکشہ، ٹیکسی وغیرہ کا کچھ بیمہ، مثلاً ایک ثلث جس کو ون تھرڈ کہتے ہیں لازمی ہوتا ہے، ویسے فُل یعنی کل بیمہ بھی ہوتا ہے، ون تھرڈ میں اگر رکشہ، ٹرک یا ٹیکسی کے ذریعہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچا تو کمپنی اس کا معاوضہ دینے کی ذمہ دار ہوتی ہے؛ لیکن خود اس رکشہ یا صاحبِ رکشہ کو ایسے ہی ٹرک، ٹیکسی یا صاحبِ ٹرک و ٹیکسی کو نقصان پہنچے تو کمپنی اس کا معاوضہ دینے کی ذمہ دار نہیں ہوتی، ون تھرڈ بیمہ اگر نہ لیا جائے تو قانوناً ہم مجرم بنتے ہیں، اور اس رکشہ، ٹیکسی اور ٹرک کو چلانے نہیں دیا جاتا؛ البتہ کل بیمہ میں ہمیں اختیار ہے کہ چاہے تو لیں یا نہ لیں، ایسے ہی فسادات کے عموم کی وجہ سے بیمہ کمپنی دکان و مکان کا فسادات سے حفاظت کا بیمہ دیتی ہے، جو سرکاری طور پر لازمی نہیں ہوتا، تو مذکورہ صورتوں میں سے کن صورتوں میں شرعاً بیمہ نکلوانا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی، یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں (؛ اس لیے) بیمہ بھی ممنوع ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۲۴۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

بیمہ درحقیقت قمار اور ربوا پر مشتمل ہے

سوال: زید اپنے گھر کا ایک قابل شخص ہے کہ بظاہر اسی کی کمائی پر اس کے اہل خانہ، والدین وغیرہ کا گزر رہے؛ نیز اس کے اور اس کے والدین کے ذمہ غیر معمولی قرض بھی ہے، جو سوال یا اشراف کا موجب ہوسکتا ہے، زید کا ایک ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہوگیا اور اس میں زید کا انتقال ہوگیا، اب زید کے گھر والوں کے لیے سرکاری قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ٹرک کا جس بیمہ کمپنی سے ربط ہے بیمہ پاس کروانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ کی اصل حقیقت قمار اور ربوا پر مشتمل ہے، جو ناجائز اور حرام ہے؛ البتہ اگر زید کی موت ٹرک کی ٹکر سے واقع ہوئی ہے تو ٹرک کا ڈرائیور ضامن ہوگا، اور اس سے زید کی دیت وصول کی جاسکتی ہے۔ والظاھر ان سائق السیارۃ ضامن لما اتلفه فی الطریق سواء اتلفه من القدام او من الخلف. (تکملة فتح الملهم ۲/۵۲۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

جیون بیمہ میں ملی ہوئی رقم کا صدقہ کرنا ضروری ہے

سوال: ایک لڑکے کا انتقال ہوا، اس نے اپنی زندگی میں جیون بیمہ پالیسی اختیار کی تھی، اب اس کی موت کے بعد جیون بیمہ پاس ہوا ہے، کمپنی کی طرف سے اس کے گھر والوں کو جیون بیمہ کی رقم ملی ہے، اور اس کے گھر والے پیسہ والے مال دار ہیں؛ لہٰذا جیون بیمہ میں ملی ہوئی رقم کو اس کے گھر والے کہاں کہاں خرچ کر سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ اس کے ورثاء میں ماں، باپ، بیوی اور ایک لڑکا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جان کا بیمہ ہر حالت میں حرام و ناجائز ہے، اب جو رقم ملی ہے اس میں سے اتنی

رقم جو اس نے بیمہ کمپنی کو ادا کی تھی وہ تو اس کے ورثاء میں (بعد ادائے دین ونفاذِ وصیت از ثلث) بقدر حصص تقسیم کر دی جائے، (یعنی کل چوبیس سہام بنا کر زوجہ کو تین، باپ کو چار، ماں کو چار اور لڑکے کو تیرہ سہام دیئے جائیں) اور جو رقم زائد ملی ہے یعنی اس کی دی ہوئی رقم سے زائد کا صدقہ کر دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سہکاری منڈڑی کے کاروبار میں شرکت اور سہکاری ڈیری کا حکم

سوال: اجتماعی معاشی ترقی کے لیے باہم تعاون کا ایک طریقہ یہ ہے، کہ بہت سے لوگ اپنی اپنی رقم جمع کر کے ممبران میں سے منتخب ایک کمیٹی بناتے ہیں اس کو ہمارے علاقہ میں سہکاری منڈڑی کہتے ہیں، یہ سہکاری منڈڑی لوگوں کو بینک کے مانند سودی قرض بھی دیتی ہے، تجارت وغیرہ بھی کرتی ہے؛ لہذا کاشت کار اپنی مختلف اغراض کے لیے اور خود کاشت کے لیے بھی اس منڈڑی سے قرض لیتا ہے، منڈڑی جب کاشت کے لیے قرض دیتی ہے تو اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہوتے ہیں مثلاً (۱) سود دینا ہوگا۔ (۲) فصل کا بیمہ کروانا ہوگا وغیرہ۔ بیمہ کی حقیقت یہ ہے کہ بیمہ کمپنی والے فصل کی حفاظت کی ذمہ داری اس طرح پر لیتے ہیں کہ کاشت کار کو ایک مقررہ رقم بالاقساط ''ہفتہ وار'' ایک مدت تک بیمہ کمپنی والوں کو دینا ہوتی ہے، اور بیمہ کمپنی والے اس لی ہوئی رقم کے عوض اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ آسمانی یا زمینی کسی بھی بلا سے اگر کاشت ضائع ہو تو بیمہ کمپنی والے کاشت کار کو مقرر رقم دیں گے، عموماً اس مقرر رقم کی مقدار کاشت کار کی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہوتی ہے، سوال طلب امر یہ ہے کہ............

(الف) کاشت کار کے لیے اس طرح منڈڑی سے قرض لینا صحیح ہے؟

(ب) اگر اس طرح قرض لے لیا اور فصل ضائع ہوگئی تو بیمہ کمپنی سے اپنی ادا

کردہ رقم کی مقدار سے زیادہ رقم لینا درست ہے؟

(ج) بالفرض اگر بیمہ کمپنی والے کاشت کار کی جمع کردہ رقم سے کم مقدار رقم دیں تو لینا صحیح ہے؟

(د) اس طرح کی منڈڑی قائم کرنا یا اس کا ممبر بننا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) جائز نہیں۔

(ب،ج) جتنی رقم ادا کی ہے اتنی مقدار یا اس سے کم وصول کرسکتا ہے، زائد نہیں۔

(د) جب اس میں معاملات سود پر مبنی ہیں تو اس کا قیام اور اس میں شرکت دونوں ممنوع ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

جانور کا بیمہ نکلوانا ناجائز ہے

سوال: ضلع کے پیمانے پر بہت سے لوگوں نے مل کر باہمی اشتراک سے دودھ کی خرید وفروخت اور اس کاروبار کو مالہ وما علیہ کے ساتھ ترقی دینے کے لیے ایک مشترکہ کمپنی بنائی، نظام میں سہولت کے لیے گاؤں گاؤں یا بعض چھوٹے گاؤں کے مرکزی مقام پر اس کی شاخیں بھی قائم کیں، ضلعی پیمانہ پر اور اس کی شاخوں میں کثرتِ رائے کی بنیاد پر نظام چلانے کے لیے ممبران میں سے انتخاب کر کے کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں، ضلعی پیمانے کی بڑی کمپنی کو بڑی ڈیری اور مقامی کمپنی کو سہکاری ڈیری شاخ کہتے ہیں، آج کل ہر چیز کا بیمہ ہونے لگا ہے، جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی والے ایک مقررہ رقم ہفتہ وار وصول کر کے اس کے عوض جس چیز کا بیمہ کرایا جائے اس کی ایک معین مدت تک حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں، اس مدت کے درمیان اگر وہ چیز ضائع ہو جائے تو بیمہ کمپنی والے

اس ضائع شدہ چیز کے عوض مقرر شدہ رقم دیتے ہیں، اسی روشنی میں حسبِ ذیل سوال کا جواب مطلوب ہے، کہ بعض لوگ جانور کا بیمہ اس طرز پر نکلواتے ہیں کہ ماہانہ دس روپیہ جانور کا مالک دے گا، دس روپیہ سہکاری ڈیری شاخ اور دس روپیہ بڑی ڈیری دے گی اور یہ بیمہ ایک سال کے لیے ہوتا ہے، اگر اس سال جانور مر جاتا ہے تو بیمہ کمپنی فی جانور دو ہزار روپیہ دیتی ہے، سوال طلب امر یہ ہے کہ:

(الف) اس طرح بیمہ نکلوانا کیسا ہے؟

(ب) بالفرض اگر بیمہ نکلوایا اور جانور اس عرصہ میں مر گیا تو بیمہ کمپنی سے دو ہزار روپیہ لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) ناجائز ہے۔

(ب) اپنی ادا کردہ مقدار سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سہکاری منڈڑی سے سودی قرض لینا حرام ہے

سوال: بعض لوگ سہکاری منڈڑی سے جانور کے لیے لون لیتے ہیں یعنی سودی قرض جو سہکاری منڈڑی مقروض سے مع سود قسط وار وصول کرتی ہے، اس طرح لون لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ناجائز اور حرام ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سہکاری منڈڑی سے غیر سودی قرض لینا

سوال: سہکاری منڈڑی جانور خریدنے کے لیے بعض مرتبہ بلا سود قرض دیتی

ہے، تو اس طرح سہکاری منڈڑی سے بلاسود قرض لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرض میں دی جانے والی رقم اگر شرکاء کے سرمایہ کی ہے، تو بوقتِ ضرورت گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

سبسڈی حاصل کرنے کے لیے سودی قرض لینا

سوال: حکومت غریب رعایا کو بعض کاروبار کے لیے امدادی رقم دیتی ہے جس کو سبسڈی کہتے ہیں، اس امداد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ رقم سودی قرض پر لی جاتی ہے جس کو قسطوں میں ادا کرنا ہوتا ہے، اور سود کی رقم مجموعی طور پر امدادی رقم سے زیادہ ہوتی ہے، تو شرعاً اس طرح کی امداد لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ صورت جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

ٹیکسی کے مسائل

مالک ٹیکسی کا مخصوص مسافت ورقم پر ٹیکسی چلانے دینا

سوال: زید نے اپنی ٹیکسی عمر کو اس شرط پر چلانے دی کہ ہر ایک سو کیلومیٹر پر ۱۶۵/ روپیہ دینا ہوگا، چاہے عمر گاہکوں سے ۱۶۵/ روپیہ یا زیادہ یا کم کمائے اس سے زید کو کوئی مطلب نہیں، ۱۰۰/ کلومیٹر گاڑی چلنے پر ۱۶۵/ روپئے دینا ہوگا اور پٹرول اور ٹیکسی کے مرمت کا کام زید کے ذمہ ہوگا، اس طرح ٹیکسی کا کنٹراکٹ پر دینا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ صورت درست ہے۔

منها ان يكون المعقود عليه وهو المنفعة معلوما علماً يمنع من المنازعة، فان كان مجهولا ينظر ان كانت تلك الجهالة مفضية إلى المنازعة تمنع صحة العقد، والا فلا، لان الجهالة المفضية الى المنازعة تمنع من التسليم والتسلم فلا يحصل المقصود من العقد الخ (بدائع الصنائع ٤/ ١٧٩، ١٨٠)

وكذلك استيجار السيارات ربما لا يعرف سائقها مسافة السفر ولا تتعين الاجرة فى بداية السفر ولكن هذه الجهالة تتحمل لكون العداد رافعا للنزاع ويتفق الراكب والسائق على اجرة يدل عليها العداد فلا يقع النزاع. (تكمله فتح الملهم ١/ ٣٢٠) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بائع کے ذمہ سودی قرض کی ادائیگی مشتری کرسکتا ہے

سوال: زید نے چالیس ہزار کی ایک ٹیکسی خریدی جس میں بیس ہزار روپئے اپنے ذاتی ہیں، اور بیس ہزار روپیہ بینک سے سودی قرض لیا ہے، زید کچھ مہینے ٹیکسی چلانے

کے بعد عمر کے ہاتھ ۳۰/ ہزار روپئے کے عوض میں بیچ رہا ہے کہ پندرہ ہزار مجھے نقد دے دو اور پندرہ ہزار بینک کے باقی ہیں وہ تم بھرتے رہنا، اور عمر جانتا ہے کہ بینک کے پندرہ ہزار رأس المال مع سود کے زید کی طرف سے بھرنے کے ہیں تو کیا عمر اس طرح بینک میں پندرہ ہزار روپیہ بھرنے کی وجہ سے سود کے لین دین کا گنہ گار ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عمر کا معاملہ جو اس نے زید کے ساتھ کیا ہے وہ سودی نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ٹیکسی کی مرمت کی ذمہ داری مستاجر پر صحیح نہیں

سوال: زید نے اپنی ٹیکسی عمر کو یومیہ ۸۰/ روپیہ کے عوض ان شرائط پر چلانے کے لیے دی کہ پٹرول اور پندرہ روپیہ تک مرمت کا خرچ عمر کے ذمہ ہوگا، اور اگر مرمت کا خرچہ پندرہ روپیہ سے زائد ہوا تو زید کے ذمہ ہوگا، تو کیا از روئے شرع اس طرح ٹیکسی کو کنٹرا کٹ پر دینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مرمت کی ذمہ داری مالک یعنی زید پر ہے، اس کے مستاجر یعنی عمر کے ذمہ ڈالنے کی شرط لگانا صحیح نہیں، ایسا کرنے سے اجارہ فاسد ہوجاوے گا۔ نفقة المسأجر على الآجر. الخ (عالمگیری ٤/ ٤٥٥) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرض

سوال: زید کو ۵۰/ ہزار کی کار خریدنی ہے، اور اس کے پاس اپنی ذاتی نمبر دو

(بلیک) کی رقم موجود ہے، اگر بینک کی اعانت کے بغیر خریدتا ہے تو ۵۰/ ہزار کا ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے؛ اس لیے حکومت کے ٹیکس سے بچنے کے لیے بینک سے رقم لے کر کار خریدتا ہے، اور ہر ماہ قسط وار اپنی ذاتی رقم میں سے بینک کی رقم مع سود کے ادا کر دیتا ہے، تو اس مصلحت کے ماتحت بینک سے (کیا بلا ضرورت کے وقتی طور پر) لون لینا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کار کی خریداری ضروری ہے اور صورتِ مرقومہ کے علاوہ کوئی صورت اس کی نہیں ہے تو اپنی رقم کی حفاظت اور حکومت کے ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کی نیت سے ایسا کرنے کی گنجائش ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ٹیکسی پرمٹ (لائسنس) کا عوض لینا

سوال: ٹیکسی کا پرمٹ (لائسنس) جو گورنمنٹ کی جانب سے ٹیکسی ڈرائیور کو دیا جاتا ہے، جس پرمٹ پر ٹیکسی کاروبار کے لیے ڈالی جاسکتی ہے، پرمٹ ملا؛ لیکن ٹیکسی خریدنے کی قوت نہیں ہے؛ اس لیے دوسرے ساتھی کو جس کے پاس پیسے ہیں اس کو پرمٹ دیتا ہے، اور وہ ٹیکسی ڈالتا ہے؛ لیکن پرمٹ والا پرمٹ کا عوض سالانہ دو ہزار روپیہ لیتا ہے، تو یہ پرمٹ کا عوض لینا شرعاً کیسا ہے؟ بعض مرتبہ پرمٹ کے عوض میں ٹیکسی اور منافع میں ۲۵/ فیصد حصہ لیا جاتا ہے تو یہ شرعاً کیسا ہے؟

نوٹ: پرمٹ والے کو سالانہ آرٹی او میں گاڑی پاس کروانے کے لیے اور پرمٹ رینیو (تجدید) کروانے کے لیے حاضر ہونا پڑتا ہے؛ نیز حادثہ اور ایکسیڈنٹ وغیرہ کی شکل میں بھی پرمٹ والے کو حاضر ہونا پڑتا ہے، چونکہ حکومت کے دفتر میں ٹیکسی پرمٹ والے ہی کی شمار کی جاتی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ان میں سے کوئی صورت درست نہیں ہے۔ھذہ الرخصة ان کانت باسم رجل مخصوص حتی لا تسمح الحکومة لرجل آخر باستعمالها فلا شبهة فی عدم جواز بیعها، لان بیعه یؤدی حینئذ الی الکذب والخدیعة، فان مشتوی الرخصة سیستعملها باسم البائع لا باسم نفسه ولان الاذن انما حصل رجل مخصوص فلا یحل له ان ینقل ذلك الی غیره. (تکمله فتح الملهم ۱/ ۳۶۵) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

ہیرے کے کاروبار کے مسائل

ہیرے گھسنے والے کاریگر کا تہائی سے زائد مال اپنے پاس رکھ لینا خیانت ہے

سوال: ہیروں کو جب تک پالش کر کے خوشنما نہ بنایا جائے معمولی پتھر جیسے معلوم ہوتے ہیں، پالش کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی چکی ہوتی ہے جس کو ہمارے علاقہ میں گھنٹی کہتے ہیں، ہیروں کو اس میں گھس کر خوشنما بنایا جاتا ہے، ظاہری بات ہے کہ گھسنے میں اس کا وزن ضرور کم ہوگا اور گھسنے سے اس کا برادہ بھی گرے گا، عام طور پر ہیروں کی خرید وفروخت کرنے والے تاجر اور ہوتے ہیں اور گھسنے والے مزدور دیگر ہوتے ہیں، یہ تاجر لوگ وزن کر کے ہیرے گھسنے والوں کو دیتے ہیں، اور چونکہ گھسنے سے کافی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے؛ اس لیے مزدوروں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں، کہ کم از کم ایک تہائی مقدار کا مال ضرور تیار ہونا چاہیے، گھسنے والے مزدور اپنی مہارت سے وزن زیادہ کم نہیں ہونے دیتے ہیں، اور مال تہائی سے زائد مثلاً نصف کے برابر تیار کرتے ہیں؛ لیکن اصل مالک کو تو تہائی مال ہی دیتے ہیں، باقی اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، اور تاجروں کو اس کی خبر نہیں ہونے دیتے، شرعاً مزدوروں کو ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صریح خیانت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کاریگر کا بڑی سائز کا ہیرا رکھ کر چھوٹی سائز کا ہیرا ملانا

سوال: تاجر نے ہیرا گھسنے والے کو ایک سو ہیرے وزن کر کے گھسنے کے لیے دیے، اس گھسنے والے نے گھس کر ایک سو ہیرے ہی تاجر کو واپس کیے؛ لیکن گھسنے کی وجہ سے

وزن تو کم ہوگا ہی؛ اس لیے مزدور نے ایک بڑی سائز کا ہیرا اپنے پاس رکھ لیا اور چھوٹی سائز کا کم قیمت ہیرا اپنے پاس سے اس میں ملا کر تاجر کو مطمئن کر دیا، تاجر کو مزدور کے اس فعل کی قطعاً خبر نہیں اگر معلوم ہو جاتا ہے تو نزاع ہوتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بھی خیانت اور فریب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہیرے کا برادہ کس کی ملک ہے؟

سوال: مزدوری پر ہیرا گھسنے والا جب تاجر سے رف ہیرے لے کر خوشنما بنانے کے لیے گھستا ہے، تو اس میں سے برادہ گرتا ہے، یہ برادہ ہیروں کی پالش میں کام آتا ہے، ہیرا گھسنے والا اس برادہ کو اپنی ملک کی طرح لے لیتا ہے اور تاجر کو اس کی اطلاع ہوتی ہے؛ لیکن اس پر اس کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، تو مزدور کے لیے یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وہ برادہ بھی تاجر کی ملک ہے، اگر تاجر کی اجازت و رضامندی سے مزدور لیتا ہے تو درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دلال کا قیمت کم بتلانا

سوال: ہیرے کے تاجر نے دلال کو ایک کیرٹ ہیرے بیچنے کے لیے دیے اور کہا کہ اس کو کم از کم ایک ہزار روپیہ میں بیچنا؛ لیکن دلال نے اس کو بارہ سو میں بیچا؛ مگر تاجر سے بتایا کہ بڑی مشکل سے ایک ہزار میں بکے ہیں دلال کا یہ قول و فعل شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دلال تو تاجر کا وکیل ہے؛ اس لیے اس کو چاہیے کہ پوری رقم جو ہیرے کی قیمت

کے طور پر ملی ہے تاجر کے حوالہ کرے، بارہ سو ملنے کے باوجود ہزار بتلانا یہ صریح خیانت ودروغ گوئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ
۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

سہکاری منڈڑی اور دودھ کی بیع وغیرہ کے مسائل

سودی کاروبار کرنے والی سہکاری منڈڑی میں شرکت

سوال: آج کل دیہاتوں میں بہت سے لوگ تھوڑی تھوڑی رقم جمع کر کے کاروبار کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی اجتماعی پیمانے پر بناتے ہیں اس کو سہکاری منڈڑی کہتے ہیں، یہ منڈڑی اہلِ دیہات کی کاشت وغیرہ کی ضروری اشیاء کی تجارت کرتی ہے؛ نیز سود پر نقد روپئے بھی قرض دیتی ہے، زراعت کا مال، سامان ادھار بھی مل جاتا ہے، (جس پر سود بھی دینا ہوتا ہے) سال کے ختم پر حساب کر کے نفع کی رقم ممبران کو تقسیم کر دی جاتی ہے، سود میں حاصل شدہ رقم بھی نفع ہی میں شمار کی جاتی ہے، اس رقم کا جو ممبران (شیئرز ہولڈر) میں تقسیم کی جاتی ہے ڈیویڈنڈ نام رکھتے ہیں، جواب طلب امر یہ ہے کہ اس میں حصہ لینا شرعاً کیسا ہے، اس کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب یہ کمپنی لوگوں کو سود پر نقد روپئے قرض دیتی ہے، اور ادھار فروخت ہونے والے سامانِ زراعت پر بھی سود لیتی ہے، تو اس میں شرکت نہ کی جائے۔ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دودھ سہکاری منڈڑی میں شرکت

سوال: گاؤں کے کچھ لوگ مل کر ایک کمپنی بناتے ہیں، جس کو سرکار میں رجسٹر بھی کرا لیتے ہیں، اس کو دودھ سہکاری منڈڑی کہتے ہیں، اور دودھ کی خرید وفروخت کا حسبِ ذیل طریقہ پر کاروبار کرتے ہیں:

دیہات والوں سے دودھ خریدتے ہیں اور ضلع کی بڑی ڈیری کو بیچ دیتے ہیں اس بیع میں حاصل شدہ نفع کی رقم کو بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے، بینک اس میں حسبِ ضابطہ سود بھی جمع کرتی رہتی ہے، اور سال کے ختم پر حاصل شدہ نفع اس پر حاصل شدہ سود کی رقم کو ممبران میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اسی میں سے کچھ رقم منڈڑی کے ہاتھ دودھ بیچنے والے غیر ممبر لوگوں کو بھی دیا جاتا ہے جس کا نام بھاؤ کی زیادتی رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ:

(الف) اس طرح کا کاروبار کرنا مسلمانوں کے لیے درست ہے؟

(ب) اس کے ممبر بننے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اس منڈڑی کے ہاتھ دودھ بیچنا جس کے کاروبار کی تفصیل کی گئی ہے شرعاً کیسا ہے؟

(د) اگر منڈڑی کے ہاتھ دودھ فروخت کیا تو بھاؤ کی زیادتی کے نام دی گئی مذکور الصدر رقم کا لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کمپنی کا کاروبار سود کا نہیں ہے؛ البتہ اس نے جو رقم بینک میں جمع کرائی، اور اس پر بینک کی طرف سے سود ملا، اس کی جتنی مقدار ممبر کے حصہ میں آئی ممبر کو چاہیے کہ اس کا صدقہ کر دے۔

(الف، ب) جب یہ کاروبار سودی نہیں ہے تو درست ہے، اور اس کی ممبری بھی درست ہے۔

(ج) اس کے ہاتھ دودھ بیچنا درست ہے۔

(د) کمپنی کے مالکان اپنی خوشی اور مرضی سے یہ رقم دے رہے ہیں تو لینا درست ہے، یہ ان کی طرف سے انعام و عطیہ سمجھا جاوے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

دودھ کے فیٹ پر قیمت کا دارومدار

سوال: آج کل دودھ کی بیع عموماً اس طرح پر ہوتی ہے کہ خریدار جو عام طور پر سہکاری منڈری ہوتی ہے، دودھ کے مالک لیٹر کے حساب سے ناپ کر، اس طرح سے نرخ مقرر کرکے دودھ لیتے ہیں کہ ہم تمہارے دودھ کو آلات کے ذریعہ سے جانچیں گے جس دودھ میں چربی کا حصہ (فیٹ) جتنا زیادہ ہوگا اس کا فی لیٹر بھاؤ اتنا ہی زیادہ ہوگا، مثلاً: اگر چھ فیٹ کا دودھ ہے تو فی لیٹر تین روپئے، اور سات فیٹ کا دودھ ہے تو فی لیٹر چار روپئے کے حساب سے، اسی طرح اگر چار فیٹ کا دودھ ہے تو دو روپئے فی لیٹر بھاؤ گنا جائے گا، بعد میں کبھی تو اس خریدار کے پاس دودھ موجود ہوتا ہے اسی وقت آلات سے دودھ کے فیٹ معلوم کر لیے جاتے ہیں، اور کبھی یہ خریدار ہر ایک کے دودھ کی مقدار ممتاز طریقہ سے الگ الگ فیٹ معلوم کرنے کے لیے رکھ کر بقیہ دودھ بڑی منڈری کو بیچ دیتا ہے، اور وہ خرید کر لے کر چلے بھی جاتے ہیں، اس کے بعد اس دودھ کے فیٹ معلوم کیے جاتے ہیں، مذکورہ طریقہ پر بیع کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس مجلس میں دودھ کی فروخت ہورہی ہے، اسی مجلس میں بذریعۂ آلات دودھ کے فیٹ معلوم کرکے اس کی قیمت متعین کردی جاتی ہے تو یہ معاملہ شرعاً درست ہے، ورنہ قیمت کی جہالت کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

پولٹری فارم یعنی مرغی انڈے وغیرہ کے کاروبار کے مسائل

چوزے دینے کی شرط پر انڈے دوسرے کی مرغی سے سینا

سوال: بکر نے دس انڈے زید کی مرغی کے نیچے سینے کے لیے زید کو دیے اور معاملہ یہ طے کیا کہ بچے دونوں کے نصف نصف ہوں گے یہ صورت جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ صورت درست نہیں ہے، جواز کا حیلہ یہ ہے کہ بکر آدھے انڈے زید کے ہاتھ فروخت کر کے اس کی قیمت معاف کر دے۔

والحیلة فی جنس هذه المسائل ان یبیع صاحب البیضة نصف البیضة وصاحب الدجاجة نصف الدجاجة من المدفوع الیه ویبرئه عن ثمن ما اشتری، فیکون الخارج بینهما. کذا فی المحیط. (عالمگیری ٤/ ٤٤٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

مرغیوں کو لڑائی سے بچانے کے لیے چونچ کا حصہ کاٹنا

سوال: زندہ مرغیوں کو آپس میں لڑنے سے بچانے کے لیے ان کی چونچ کے اگلے حصہ کو کاٹ دیا جاتا ہے، بظاہر یہ حصہ سخت، بے جان ہونے کی وجہ سے تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے، تاہم زندہ جانور کے عضو کو اس طرح کاٹنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مصلحتِ مذکورہ کے پیشِ نظر جائز ہے۔ ویجوز فصد البهائم وکیّها وکل علاج فیه منفعة لها. (درمختار علی هامش الشامی ٥/ ٥٣٠) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

صنعت کے لیے حکومت سے سبسڈی لینا

سوال: حکومت پولٹری فارم اور اس جیسے بعض کاروبار کے لیے رعایا کو امداد دیتی ہے، جس کو سبسڈی کہتے ہیں؛ لیکن اس امداد کو حاصل کرنے کے لیے حکومت سے کچھ رقم سودی قرض کے طور پر لینی پڑتی ہے، اگر اس رقم کو جلد ہی ادا کردی جائے تو امداد کی رقم سے سود کی رقم کم رہے گی یا برابر ہوگی، مثلاً پانچ ہزار امداد حاصل کرنے کے لیے دس ہزار روپیہ سودی قرض سے لیے اور دو مہینوں میں وہ سودی قرض مع دو ہزار سود کی رقم کے بارہ ہزار واپس کردیئے، کیا شرعاً یہ امداد حاصل کرنا جب کہ دو ہزار سود دینے کے بعد بھی تین ہزار روپئے امداد کے بچ گئے صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی نے کوئی صنعت قائم کرنے کے لیے حکومت سے نقد روپئے لیے اور حکومت نے اپنے قاعدے کے ماتحت اس میں سے ایک حصہ معاف کردیا، اور باقی حصے کی ادائیگی کے لیے ایک مدت مقرر کرکے اس کی قسطیں بنادیں، اور اس وصولیابی میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کرکے وصول کیا؛ مگر کل رقم وصولیابی کی (حکومت سے لیے گئے) اصل قرض سے زائد نہ ہوئی، تو ان قسطوں میں اصل پر جو زیادتی حکومت نے وصول کی وہ شرعی طور پر سود کی تعریف میں نہیں آتی؛ اس لیے یہ معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ (ماخوذ از نظام الفتاویٰ ۱/۲۵۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نرخ متعین کیے بغیر انڈا فروخت کرنا

سوال: تاجر نے مرغی فارم والے کو کچھ رقم پیشگی دی تاکہ مرغی فارم والا انڈے صرف اسی تاجر کو دے کسی اور کو نہ بیچے؛ لیکن انڈوں کا نرخ (بھاؤ) طے نہیں کیا؛ بلکہ

بازاری بھاؤ سے اور کبھی اس سے کچھ کم اور کبھی اس سے کچھ زیادہ بھاؤ سے لیتا رہتا ہے، شرعاً یہ بیع کیسی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

گنجائش ہے۔ ما یستجرہ الانسان من البیاع اذا حاسبہ علی اثمانھا بعد استھلاکھا جاز استحسانا. (درمختار) وفی الشامیة: ولو اعطاہ الدراھم وجعل یاخذ منہ کل یوم خمسة امناء، ولم یقل فی الابتداء اشتریت منک یجوز وھذا حلال وان کان نیتہ وقت الدفع الشراء لانہ بمجرد النیة لا ینعقد البیع وان ما ینعقد الآن بالتعاطی الخ (شامی ۴/ ۱۴)

البتہ یہ یاد رہے کہ پیشگی رقم دینے کی وجہ سے تاجر انڈوں کی قیمت عام رائج نرخ سے کم نہ لگاتا ہو، اگر ایسا ہے تو ناجائز ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

انڈوں کی مقدار طے کیے بغیر بیع کرنا

سوال: مشتری اور مرغی فارم والے کے درمیان انڈے کی قیمت طے ہوتی ہے؛ مگر مبیع کی مقدار طے نہیں ہوتی؛ بلکہ ایک متعین مدت تک فارم والے کے ذمہ ہوتا ہے، کہ انڈے صرف اسی تاجر کو دے، یہ معاملہ کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ ایک وعدہ ہے جس کی پابندی ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

انڈوں میں بیع سلم

سوال: خریدار اور مرغی فارم والے کے درمیان قیمت اور انڈوں کی مقدار طے ہو کر بیع ہوتی ہے؛ لیکن یہ انڈے فارم والے کو ایک مدت کے بعد دینا ہوتے ہیں؛ بلکہ ان

انڈوں کا اس وقت وجود بھی نہیں ہوتا، اس بیع کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر ادائیگی کی مدت متعین ہے، اور بیع سلم کے دیگر شرائط بھی موجود ہیں تو یہ درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۹/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

بفضلہٖ تعالیٰ محمود الفتاویٰ کی دوسری جلد پوری ہوئی، تیسری جلد کتاب البیوع سے شروع ہوگی۔